وہ صورتیں الٰہی

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید



قومی کتب خانہ لاہور

وے

صُورتیں

اِلٰہی

وے صورتیں اِلٰہی

ڈاکٹر عبدالسلام خورشیدؔ

○

قومی کتب خانہ ○ لاہور

(پاکستان)

وے صورتیں الٰہی

مصنف :	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
ناشر :	محمد احسن ہمایوں
	برائے قومی کتب خانہ ، لاہور
طابع :	نسیم ہمایوں
مطبع :	تعمیر پرنٹنگ پریس
	۱۹ فیروزپور روڈ ۔ لاہور
تعداد :	دو ہزار ۲۰۰۰
قیمت :	پندرہ روپے ۱۵/-

دسمبر ۱۹۷۶

اِنتساب

حکیم محمّد سعید

کے

نام

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

پیش لفظ

اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جن بڑی اور چھوٹی شخصیات سے نصف صدی کے دوران میں کسی نہ کسی رنگ میں کوئی رابطہ رہا۔ اُن کا تذکرہ کر دیا جائے یہ خاکے سوانحی نہیں ہیں۔ محض تعارفی ہیں اور تذکرہ بھی رواں تبصرے کے رُوپ میں ہے۔ جامعیت کا ہرگز کوئی دعوٰے نہیں۔ کیونکہ جو کچھ لکھا، یادداشت سے لکھا۔ کہیں کہیں بعض حوالوں سے کام لیا اور بس۔ یہ کتاب کیوں لکھی؟ اس لئے کہ آج کی نسل کے ذہنی تناظر میں وسعت پیدا ہو۔ اور وہ بھی ہلکے پُھلکے انداز میں۔ اس کا خیال یُوں آیا کہ والدِ مرحوم کی "سرگزشت" کے بارے میں بہت سوں نے کہا۔ کہ اس کے مطالعے سے ماضی کے ساتھ ایک رابطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا۔ اس رابطے کا سلسلہ دراز کیا جائے۔

اس کتاب میں صرف اُن شخصیات کا رواں تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ شعرأ، ادبأ، سیاسئین، اساتذہ، وکلا اور دوسرے نمایاں بزرگوں کے پہلو بہ پہلو بعض ایسے افراد کے خاکے بھی موجود ہیں جو عام طور پر شخصیات کے زُمرے میں نہیں آتے۔ لیکن اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے تو اس لئے کہ ان کا ایک مخصوص کردار تھا۔ بعض حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ اور ان سے کچھ دلچسپیاں وابستہ تھیں۔

رواں تبصرے تلم بند کرلئے۔ تو یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ترتیب کس انداز سے کی جائے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ادوار مقرر کر لئے جاتے لیکن اس میں دقّت یہ تھی کہ بعض شخصیات کو تو ادوار میں رکھا جا سکتا تھا لیکن بعض کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک اور طریقہ بھی زیرِ غور آیا کہ زندگی کے مختلف شعبے مقرر کر کے شخصیات کو ان میں تقسیم کر لیا جائے لیکن اس میں یہ مشکل پیش آئی کہ بہت سی شخصیات ایسی ہمہ جہتی نوعیت کی ہیں۔ کہ اُنہیں کسی ایک شعبے میں رکھنا نامناسب نظر آیا۔ آخر میں یہی راستہ باقی رہا۔ کہ حروفِ تہجّی کے اعتبار سے ترتیب کر لی جائے۔ اس میں بھی ایک دقّت پیش آئی۔ کہ نام کے کس جُزو کے پہلے حرف کو بنیاد بنایا جائے۔ نہ یہ مناسب نظر آیا کہ انگریزی طریقے کے مطابق نام کے آخری لفظ کو کلیدی حیثیت دی جائے، نہ یہ قابلِ عمل نظر آیا۔ کہ نام کے پہلے حرف کو سامنے رکھا جائے۔ چنانچہ ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا گیا۔ کہ نام کا جو جُزو زیادہ معروف ہو خواہ پہلا جزو ہو یا آخری۔ اُسی کا پہلا حرف سامنے رکھ کر ترتیب کر لی جائے۔ مثلاً حکیم الامت حضرتِ علامہ اقبال، اقبالؔ کے نام سے معروف ہیں۔ اس لئے اُنہیں الف کے زمرے میں شامل کر دیا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو ہم عام طور پر قائدِ اعظم ہی کہتے ہیں۔ اس لئے اُنہیں "ق" کے زمرے میں شریک کر لیا۔

اس کتاب کی تحریر اور ترتیب میں قومی کتب خانے کے ناظمِ اعلیٰ جناب شیخ محمد احسن کے بعض مفید مشورے شاملِ حال رہے جن کے لئے بے حد ممنون بلکہ سراپا سپاس ہوں۔ قومی کتب خانے سے میرا تعلق بہت پُرانا ہے۔ میری پہلی کتاب "ممالکِ اسلامیہ کی سیاست"، پینتیس سال قبل

اس ادارے کے توسّط سے منظرِ عام پر آئی ۔ پاکستان بننے کے بعد میری ایک درجن کے قریب کتابیں اس ادارے نے چھاپیں ۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے ربع صدی کے بعد قومی کتب خانے کے ساتھ تجدیدِ تعلق کا سامان فراہم ہوا ۔

عبدالسّلام خورشید

۱۰۔ سالک روڈ مسلم ٹاؤن لاہور ۱۶

۸ ، فروری ۱۹۷۶ء

فہرست

ابراہیم علی چشتی : اس صدی کے پہلے ربع کی ممتاز شخصیت مولوی محرم علی چشتی کے فرزند تھے۔ وہی محرم علی چشتی، جنھوں نے پچھلی صدی کے اواخر میں لاہور سے "رفیق ہند" کے نام سے ایک اعلیٰ پائے کا ہفت روزہ جاری کیا تھا، جو پہلے سرسیّد احمد خاں کے عقیدت مند تھے اور ان کی تحریروں کو اپنے اخبار میں تبرّک کے طور پر چھاپا کرتے تھے، اور جب مخالفت پر اُترے تو سرسیّد کی آمد پر لاہور میں کالی جھنڈیوں کا مظاہرہ کرا دیا۔ مخالفین کو زچ کرنے کے لیے انھوں نے یہ ترکیب نکالی تھی کہ مخالف کے نوکر سے کہتے کہ ردّی کی ٹوکری میں جو پُرزے ملیں، انہیں فراہم کرتے رہے۔ پھر پُرزے جوڑ کر دیکھتے کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ اگر کوئی قابلِ اعتراض دستاویز ہاتھ آجاتی تو پھر مخالف کی شامت آجاتی تھی۔

مولوی ابراہیم علی چشتی نے ساری عمر شادی نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک موٹا سا ڈنڈا رہتا تھا، جس کا نام تھا مولا بخش۔ مولا بخش ان کی وجہ سے اور وہ مولا بخش کی وجہ سے لاہور کی تہذیبی زندگی میں بہت مشہور تھے۔ پیسہ اخبار سٹریٹ میں اپنے آبائی مکان میں سکونت رکھتے تھے۔ ان سے جب ملاقات ہوئی، کسی نہ کسی دلچسپ بات کا انکشاف ہوا۔ گھر کے پچھلے

کمرے میں دیواروں پر تصاویر کی طرح بڑی بڑی چارپائیاں آویزاں تھیں۔ پوچھا : یہ کیوں؟ بولے : یہ بزرگوں کی چارپائیاں ہیں اور یادگار کے طور پر یہاں آویزاں ہیں۔ ان کے پاس کچھ ڈنڈے بھی موجود تھے۔ وہ بھی نوادر کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ بزرگوں کے استعمال میں آچکے تھے۔ سگریٹ نہیں پیتے تھے لیکن ایک الماری میں مہمانوں کے لیے مختلف اعلیٰ اقسام کے سگرٹوں اور سگاروں کے ڈبے جمع کر رکھے تھے۔ اس کا انکشاف یوں ہوا کہ ایک بار ان کے پاس بیٹھا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سگریٹ کی ڈبی نکالی تو وہ سوئے اتفاق سے خالی تھی۔ پوچھنے لگے : سگریٹ پیو گے؟ میں نے کہا : جی ہاں۔ بولے : کونسا سگریٹ پیو گے؟ میں نے کہا : جو مل جائے! کہنے لگے : کوئی نام بتاؤ! میں نے جان بوجھ کر برطانیہ کے ساختہ نادر سگریٹ "عبداللہ سگریٹ" کی فرمائش کر دی۔ انھوں نے کھٹ سے الماری کھولی اور عبداللہ سگرٹوں کا ٹین سامنے رکھ دیا۔

ابراہیم علی چشتی بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی تھے لیکن وکالت نہیں کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں ڈپلوما اِن جرنلزم کلاس میں میرے ساتھی تھے۔ وہ سالانہ امتحان میں اوّل آئے۔ میں دوم۔ بہرحال انھوں نے کسی اخبار میں ملازمت نہ کی۔ البتہ فری لانس جرنلزم میں بہت نام پیدا کیا۔ وہ انگریزی اور اردو اخبارات میں "[illegible]" اور "[illegible]" کے قلمی ناموں سے مقالے لکھتے تھے۔ جرمن کے آمر ہٹلر کو پسند فرماتے تھے چنانچہ اس کے سوانح کا ترجمہ کیا اور کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔ ہاں یاد آیا کہ وہ "فاضلِ ہند" کے نام سے بھی مضمون نگاری کرتے رہے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ واقعی عالم و فاضل تھے۔

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زمانے میں ان سے رابطہ پیدا ہوا۔ وہ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے سیکرٹری تھے۔ چونکہ اپنی جماعت سے رشتہ توڑنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے ہم لوگوں نے انھیں زیادہ نزدیک نہ آنے دیا۔ جب عبدالستار خان نیازی فیڈریشن کے صدر تھے اور میں اور میرے ساتھی اختلافات کی بنا پر مستعفی ہو گئے تو میری جگہ چشتی صاحب سیکرٹری بنے۔ لیکن اس دوران میں آئین کے کایا کلپ نے ایک نئی اور دلچسپ صورت پیدا کر دی۔ نیازی صاحب "امیرالطلبا" بن گئے اور مولوی ابراہیم علی چشتی "ناظمِ امور داخلہ و خارجہ"۔ چشتی صاحب عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑے ہوں گے اور ڈاڑھی کی بنا پر انھوں نے کچھ زیادہ ہی بزرگی اپنا لی۔ چنانچہ جب انھوں نے دستاویزات کی حوالگی کے لیے مکتوب لکھا تو سرنامے میں مجھے "عزیزی" کے لفظ سے خطاب فرمایا۔ اس پر میں نے بھی جواب میں انھیں عزیزی لکھ دیا اور کہا کہ جب تک آئینی طور پر صحیح انداز میں انتخابات نہیں ہوں گے، کاغذات کی حوالگی ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے عزیزی کو ذرا تحکمانہ لہجے میں لکھا۔ میں نے جواب میں "عزیزی ابراہیم علی چشتی سلمہٗ" لکھ کر ذرا کرارا سا جواب دیا اور لفافے پر پتہ یوں درج کیا: فضیلت مآب مولانا ابراہیم علی چشتی۔ خلیفۂ اول۔ ملتِ خدادادِ پاکستان۔ پیسہ اخبار سٹریٹ۔ لاہور۔ اس پر وہ ایسے برہم ہوئے الاماں۔ فل سکیپ سائز کے چھ صفحات پر مشتمل ایک حد سے زیادہ فحش مکتوب لکھا۔ اس کی بہت سی کاربن کاپیاں تیار کیں۔ ایک میرے نام بھیجی۔ باقی مسلم لیگ کے ان رہنماؤں کو، جن کے ساتھ میرا زیادہ میل جول تھا۔ بس۔

اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

کوئی ڈیڑھ سال بعد پنجاب یونیورسٹی میں صحافت کا ڈپلوما کورس شروع ہوا تو وہ میرے ہم جماعت تھے۔ انھوں نے چھٹتے ہی بڑے زور کا السّلام علیکم فرمایا۔ میں نے بھی زور کا وعلیکم کہہ دیا اور انھوں نے حسبِ معمول اس سختی کے ساتھ ہاتھ ملایا کہ ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ ایک بار انھوں نے بڑی معصومیت کے ساتھ پروفیسر سے کلاس میں پوچھا کہ TWENTIETH CENTURY FOX کس کو کہتے ہیں؟ اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب جواب دیتے۔ میں نے بلند آواز سے کہا "بیسویں صدی کی لومڑی" اس پر ساری کلاس قہقہوں سے گونج اٹھی، اور وہ کھسیانے سے ہو گئے۔

مولوی ابراہیم علی چشتی "خلافتِ پاکستان سکیم" کے لیے مشہور تھے۔ لیکن حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ تحریکِ رفاقت کے داعی بن گئے۔ یہ ایک سرکاری تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور [illegible]انوں اور سکھوں میں سیاسی اختلافات سے بالا رہتے ہوئے پیار بڑھایا جائے۔ پیار [illegible] کیا بڑھتا۔ چشتی صاحب کو نوکری مل گئی اور بہت سے اخبار نویسوں کے لیے روٹی پانی کا وافر بندوبست ہو گیا۔ یہ حکمہ ۱۹۴۶ء تک چلتا رہا اور حکومت نے بعد [illegible] مولوی صاحب کو فارغ کیا۔

پاکستان بنا تو مولوی صاحب تقرری کا پروانہ لیے بغیر حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلقاتِ عامہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھ کر احکام جاری کرنے لگے۔ بعد میں اس تقرّری کا عدہ بنا لیا گیا۔ ۱۹۵۳ کی تحریکِ ختمِ نبوّت میں ان کا بوریا بستر گول ہوا۔ اس پر انھوں نے مقدمہ چلایا اور

کامیاب ہو کر پچھلی تنخواہیں وصول کر لیں۔ آخری زمانے میں فری لانس صحافی بنے اور گزارہ چلتا رہا۔

ایک دلچسپ بات تو بھول ہی گئی، سن لیجیے۔ ۱۹۴۵ء میں میاں محمد شفیع (م۔ش) نے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ سرحد کے قبائلی علاقے میں ایک بڑے پہنچے ہوئے بزرگ حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی موجود ہیں۔ انھوں نے حالات حاضرہ پر حضرت بابا سے ایک طویل انٹرویو کیا جو "نوائے وقت" میں بالاقساط چھپتا رہا اور بڑا شہرہ ہوا کہ شفیع صاحب نے ایسا زبردست سکوپ مارا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد میں ایک بار چشتی صاحب سے ملا تو انھوں نے ازراہِ محبت اپنی کتاب "ملفوظاتِ حضرت بابا بلند کوہی" پیش کی۔ گھر آ کر اس کا مطالعہ کیا تو یہ حقیقت کھلی کہ حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی اصل میں مولوی ابراہیم علی چشتی تھے، کیونکہ ملفوظات میں اس پورے پمفلٹ کا متن بھی شامل تھا جو "خلافتِ پاکستان سکیم" کے عنوان سے ان کے نام پر چھپا تھا۔ شفیع صاحب نے اس کے دیباچے میں حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی کے غار کی جو کہانی سنائی وہ مولوی ابراہیم علی چشتی کے مسکن پر خوب منطبق ہوتی تھی۔ اصل میں میاں محمد شفیع مولوی صاحب کے مرید تھے۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی بھی عقیدت مند تھے اور اس تگڈم کے ساتھ حکیم انور بابری کی دُم لگی ہوئی تھی اور اس دُم کے پیچھے پیچھے مولوی عبدالقدیر نعمانی ہوتے تھے۔

ایک بار شفیع صاحب نے میرے نام ایک خط میں لکھا کہ میں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا، وہ سب مولوی چشتی کے فیضانِ نظر کا کرشمہ ہے۔ اس پر میں نے پوچھا کہ حضرتِ علامہ اقبال سے جو قرب آپ کو حاصل رہا،

اس کا کچھ اثر نہ ہوا؟ اس پر شفیع کچھ سٹپٹا سے گئے اور تاویلات کرنے لگے۔

حمید نظامی مرحوم کو چشتی صاحب سے اور چشتی صاحب کو حمید نظامی سے کد تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حمید نظامی ممدوٹ وزارت کے حامی تھے۔ چشتی صاحب مخالف تھے۔ حمید نظامی نے ممدوٹ وزارت کے مخالفین کو ففتھ کالم قرار دیا۔ اس پر چشتی صاحب نے ایک پمفلٹ لکھا "ففتھ کالم کون ہے؟" اور اس میں تحریکِ رفاقت سے ایک چھوٹی سی رقم کے عوض حمید نظامی کے دستخطوں سے ایک رسید کا عکس چھاپ دیا جو بعد میں شفیع صاحب نے "اقدام" میں بھی نقل کیا۔ اس پر حمید نظامی مرحوم نے ان دونوں سے قطع تعلق کر لیا اور وہ بھی اس حد تک کہ "نوائے وقت" میں ان کے ناموں کی اشاعت بھی ممنوع ہو گئی۔

ویسے چشتی صاحب مزے کے آدمی تھے۔ جب گھر سے باہر نکلتے تو ڈگری کا سیاہ گاؤن پہن کر نکلتے اور ہاتھ میں مولا بخش ہوتا اور جب موٹر سائیکل پر آتے جاتے تو گاؤن کے دامن کی پرواز عجب بہار پیدا کرتی۔

ابناش چندر بالی کا مختصر نام اے۔ سی۔ بالی اور اس سے بھی مختصر اور ہر دلعزیز نام بالی جی تھا۔ لاہور کے پرانے انگریزی روزنامے "ٹریبیون" کے چیف رپورٹر تھے۔ پکّے کانگرسی تھے۔ گاندھی بھگت تھے۔ سر پر سفید کھدّر کی گاندھی ٹوپی اور تن پر سفید کھدّر کا کرتا اور پاجامہ ہوتا تھا اور پاؤں میں چپّل۔ سردی کے دنوں میں ایک عدد کھدّر کی جیکٹ کا اضافہ فرما لیتے۔ ان میں عجز و انکسار کمال کو پہنچا ہوا تھا اور سچ پوچھیے تو جتنے کانگرسی گاندھی جی سے خصوصی لگاؤ یا عقیدت رکھتے تھے، ان کا طرۂ امتیاز دلنوازئ سخن

تھا۔ بالی جی پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے بانی تھے لیکن ان دنوں یہ جماعت ٹریڈ یونین نہیں تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو اخبار نویسوں کو مل بیٹھنے کے مواقع مہیّا ہوں، دوسرے اگر کسی اخبار نویس یا اخبار پر بپتا پڑے تو یونین مدد کو پہنچے۔ چنانچہ جب کسی اخبار سے ضمانت طلب ہوئی یا کوئی اخبار نویس پکڑا گیا تو بالی جی کی رہنمائی میں یونین سینہ سپر ہوگئی۔

بالی جی ذمہ دار رپورٹروں کی اس پُرانی کھیپ کے سردار تھے جو صرف ٹیلیفون کا سہارا نہیں لیتے تھے اور ہر خبری مقام پر خود پہنچ کر حالات معلوم کرتے تھے۔ بہر حال جہاں تک سیاسی خبروں کا تعلق تھا، کانگرس کے حق میں اور مسلم لیگ کے خلاف ان میں بہت تعصب موجود تھا۔ کانگرس کے حامیوں کی خبریں بڑھ چڑھ کر دیتے اور مخالفوں کا نقطۂ نگاہ اوّل تو دیتے ہی نہیں تھے اور اگر دیتے تھے تو مسخ کر کے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ حلقوں میں "ٹریبیون" کو پسند نہیں کیا جاتا تھا اور امر مجبوری کے طور پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کی سرپرستی ہوتی تھی۔

نجی زندگی میں بالی جی ہر نقطۂ نگاہ کے لوگوں سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے اور یہ تو اس عہد کی ایک اہم خصوصیت تھی ؛

اُبوالکلام آزاد کی شخصیت سیاسی اعتبار سے متنازعہ رہی لیکن ان کے علم وفضل سے کوئی جاہلِ مطلق ہی انکار کر سکتا ہے۔ ان سے کسی رابطے کا دعویٰ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ میرے بزرگ مولانا غلام رسول مہر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے اور والدِ مرحوم کو نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ ۱۹۴۶ میں ان دو بزرگوں کے ہمراہ فلیٹی ہوٹل میں ایک

ایسے وقت پر ان سے ملا، جب باہر ملاقات کے آرزومندوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ باتیں بزرگوں نے کیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا اور مجھے ایک عجیب قسم کا سرور حاصل ہوا۔ اس محفل میں خالص علمی باتیں ہوئیں یا ہلکے پھلکے لطائف ہوئے۔ سیاست کا ذکر تک نہ آیا، لیکن دوسرے دن کانگرسی اخبارات نے لکھا کہ مہر و سالک ملک خضر حیات ٹوانہ کا پیغام لائے تھے۔

میں نے ان کی دو ہی تقریریں سنی ہیں۔ ایک ۱۹۴۱ء میں باغ بیرون دہلی دروازہ میں، دوسری غالباً ۱۹۴۶ء میں فلیٹی ہوٹل کی ایک تقریب میں۔ ان کی خطابت کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ تھی کہ اس سے عوام اور خواص، معمولی تعلیم یافتہ اور عالم و فاضل دونوں قسم کے لوگ یکساں لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ نہ گرجتے تھے، نہ برستے تھے، نہ بعض عوامی خطیبوں کی طرح ایک ہی مطلب کے حامل فقروں پر فقرے کہتے تھے۔ ان کی تقریر ایک ندی کی طرح رواں دواں ہوتی تھی۔ کہیں کہیں ہلکا سا تموّج آجاتا تھا اور بس۔ اور سامعین تھے کہ سحر میں ڈوب جاتے تھے۔ ان کی تحریر میں بھی خطیبانہ رنگ تھا۔ بالخصوص ان تحریروں میں جو "الہلال" اور "البلاغ" کے توسّط سے ہم تک پہنچیں۔ ابوالکلام آزاد سے میری غائبانہ شناسی انہی کی بدولت ہے کیونکہ میں نے "الہلال" اور "البلاغ" کے پورے فائل پڑھ رکھے ہیں۔ میرے نزدیک ایسے اعلیٰ پائے کے ہفت روزہ جرائد نہ پہلے کبھی نکلے تھے نہ اب نکلے ہیں۔ صحافت کی یہ صنف مولانا آزاد سے شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہوگئی۔

کسی زمانے میں ابوالکلام آزاد سب کے محبوب تھے لیکن چالیس پینتالیس سال پہلے جب برعظیم میں مسلمانوں کی سیاست نے ایک نیا رنگ لیا، مسلم لیگ میں گھن گرج پیدا ہوئی اور تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو مولانا آزاد سے مسلمانوں کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی کیونکہ وہ کانگرس کے حامی تھے اور انھیں سوادِ اعظم کے ساتھ چلنا گوارا نہیں تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگوں نے شدید سیاسی اختلافات کے باوجود ان سے علمی روابط برقرار رکھے اور پاکستان بننے کے بعد ان کی تحریروں کے بہت سے مجموعے منظرِ عام پر آ گئے۔ اس لیے کہ ان کی پرانی تحریریں ہمارے مزاج اور موقف سے مطابقت رکھتی تھیں صرف عملی سیاست عدمِ مطابقت رکھتی تھی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ہمارے ادبار اور سیاسئین کے ذہنوں پر دو شخصیتوں نے گہرا اثر ڈالا۔ ایک حکیم الامت حضرتِ علامہ اقبال اور دوسرے ابوالکلام آزاد۔ تحریکِ خلافت اور بعد میں آنے والی بعض تحریکوں کے زیادہ تر رہنما سیاست میں داخل ہوئے تو "الہلال" کے زیرِ اثر اسی طرح مسلمان اخبار نویسوں کی ایک پوری نسل ان کے خیالات سے متاثر ہوئی لیکن تحریک پاکستان اُبھری تو اس نسل کے بیشتر افراد نے مولانا آزاد کی روش پر چلنے سے انکار کر دیا۔

ابو سعید بزمی بھوپالی سے غائبانہ تعارف ان دنوں ہوا جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ "ہمایوں" میں سید امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انارکلی" پر ان کا مقالہ بہت پسند آیا۔ اس وقت وہ بجنور کے کانگرس نواز سہ روزہ "مدینہ" کے مدیر تھے۔ قیامِ پاکستان سے چند سال پہلے لاہور آ گئے۔ روزنامہ "شہباز"

یونینسٹ پارٹی کے ایک رہنما نے خرید لیا تو ادارت ان کے سپرد کر دی۔ وہ نیشلسٹ خیالات کے مالک تھے، اس لیے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی مخالفت میں یونینسٹ پارٹی کی تباہی ہوئی حدود کو پھلانگ گئے اور ہر اس عنصر کو آگے بڑھنے کی سعی فرمائی جو مسلم لیگ کا مخالف تھا۔ اس پر اخبار کی اشاعت گر گئی اور ان کی ادارت کا بوریا بستر بھی گول ہو گیا۔ بیکاری کے اس دور میں ان سے ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ وہ مسلم ٹاؤن آتے، گھنٹوں میرے پاس بیٹھتے۔ کوکو اور دودھ کا مشروب بہت پسند کرتے تھے۔ آخر بیکاری کا دور ختم ہوا اور انھیں روزنامہ "احسان" کی ادارت مل گئی۔ اب ان کے سیاسی نظریات نے ایسا پلٹا لیا کہ دوسری انتہا تک پہنچ گئے۔ اب وہ نظریۂ پاکستان کی علم برداری اس شدت سے کرنے لگے کہ انھیں ہر وہ شخص کمیونسٹ نظر آتا تھا جو مملکتِ پاکستان میں ایک عادلانہ معاشی نظام کی آواز بلند کرتا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ الاماں۔ علمائے کرام کو آگے بڑھایا اور غلط اور صحیح دونوں قسم کا پروپیگنڈا بڑی شدّت سے کیا۔ ویسے وہ محض صحافی ہی نہیں تھے، ادیب اور مؤرخ بھی تھے۔ چنانچہ چند علمی کتابیں بھی لکھیں۔ فوت ہوئے تو مالی حالت وہی تھی جو ہمارے وطن میں لکھنے والوں کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی بیگم کو ملازمت کرنی پڑی۔ وہ ایک عرصے تک حکومتِ پاکستان کے محکمہ اطلاعات میں کام کرتی رہیں اور اس طرح بچوں کی پرورش کا سامان مہیا کیا۔ ابوسعید بزمی کی ایک ہمشیرہ عقیلہ نے ایم اے کر کے تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ کسی زمانے میں اس کنبے سے میرے کنبے کا گہرا رشتہ تھا۔

ابُوصالح اصلاحی جانے پہچانے عالمِ دین مولانا امین احسن اصلاحی کے

فرزندِ ارجمند تھے۔ پہلے "کوہستان" کی ادارت کرتے تھے۔ "مشرق" نکلا تو اس کے مدیر بن گئے۔ عربی زبان میں انھیں ایک خصوصی درک حاصل تھا۔ دنیائے اسلام کا مطالعہ کرتے تھے اور ریڈیائی نشریات سُنتے تھے، اس لیے دنیائے اسلام کی سیاست سے بخوبی آشنا تھے۔ وہ آزادئ صحافت کے قائل تھے اور ایسے قوانین کے خلاف تھے جو خبروں کی اشاعت میں مزاحم ہوں لیکن وہ آزادئ صحافت کو ذمّہ داریوں سے عبارت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے میرا عقیدہ ہے کہ اخبار نویس کو صُوفی کی طرح اپنے نفس پر پورا قابو ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ملک کی سالمیت اور قومی استحکام کے مفاد میں اور اپنے ذہن کو ملک اور قوم کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر اخبار نویس کو بے شمار پابندیاں اپنے آپ پر خود عاید کرنی ہوتی ہیں۔ ابو صالح اصلاحی ایسے ایڈیٹر تھے جن کا کام اداریہ نگاری کے بعد ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ وہ اخبار کے ہر شعبے کی پوری نگرانی کرتے اور ان کی ساری دلچسپیاں اخبار ہی پر مرتکز ہوتی تھیں۔ ان کی اداریہ نگاری میں بلا کا سلجھاؤ تھا۔ خیالات سے اختلاف ہو تو ہو، لیکن فنِ اداریہ نگاری میں انھیں جو دسترس حاصل تھی اس سے انکار شاید ہی ممکن ہو، ان کی مزاح نگاری کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ ہلکے پھلکے مزاح کے قائل تھے اور ان کی طنز بھی ایسی ہلکی پھلکی ہوتی تھی کہ چبھن محسوس کرنے کے باوجود طنز کا شکار خود مسکرا دیتا تھا۔ یار لوگوں نے ایک مرحلے پر ابو صالح اصلاحی کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ میں ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تو فوراً ملا اور ان کے اوہام دُور کر دیے اور ہماری دوستی ایک بار پھر مستحکم بنیادوں پر استوار ہو گئی۔ افسوس وہ حادثۂ قاہرہ میں عینِ عالمِ شباب میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

حکیم احمد شجاع گل افشانیٔ گفتار میں کمال رکھتے تھے اور محفل آرائی اُن پر ختم تھی۔ بنیادی طور پر ڈراما نگار تھے۔ آغا حشر کی روایات کے حامل۔ وہی پُرشکوہ اور بلند آہنگ مکالمے، الفاظ سے تراشی ہوئی تصویریں، کہیں کہیں منظوم گفتگو۔ لطف یہ کہ جب ڈرامے سناتے تو اداکاری کے انداز میں۔ عنفوانِ شباب میں اردو ڈرامے کے نشوو ارتقا پر تحقیق کرتے کرتے ایک بار حکیم صاحب کی خدمت میں مشورے اور رہنمائی کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے "باپ کا گناہ" "عشق اور فرض" "رستم وسہراب" اور آخری فرعون سے اقتباس سنائے اور وہ بھی اس ٹھاٹھ سے کہ میں نے سوچا تھیٹر ہال میں بیٹھا ہوں اور میرے سامنے ڈراما اسٹیج ہو رہا ہے۔ ایک تو مکالموں کی زبان میں جاہ و جلال تھا، دوسرے ان کی پُروقار اور گھمبیر آواز سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ یہ نشست دو گھنٹے جاری رہی۔ وضعداری ملاحظہ ہو کہ وہ مانے ہوئے ادیب تھے، میں ایک معمولی طالب علم۔ پھر بھی توجہ کا یہ عالم تھا کہ اجازت لی تو میں نے۔ وہ نہ اکتائے۔ پھر ان سے کوئی ایک آدھ ملاقات ہوئی ہو تو اس کی کہانی سناؤں۔ جب ملا، ان کی خوش گفتاری سے مسحور ہوا اور بہت گہرا تاثر لے کر لوٹا۔ وہ ہمارے گھر بھی آتے جاتے تھے لیکن ابنِ سالک سے نہیں، سالک سے ملنے۔ میں ان محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ میری دادی کا انتقال ہوا تو حکیم صاحب تعزیت کے لیے آئے۔ ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے زندگی اور موت کے فلسفے پر گفت گو فرمائی۔ مادرانہ شفقت اور محبت کا تذکرہ کیا اور کہنے لگے کہ میری والدہ بسترِ مرگ پر تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ اب زندگی چند لمحوں کی مہمان ہے۔ انھوں نے میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا

اور آنکھوں سے آنسو گرے تو میں نے ایک کاغذ لیا اور آنسوؤں کو محفوظ کر لیا۔ یہ کاغذ میرے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

حکیم صاحب کی شخصیت بہت پہلو دار تھی۔ کسی زمانے میں ایک پندرہ روزہ ادبی مجلہ "ہزار داستان" کے نام سے جاری کیا جو افسانے اور ڈرامے کے لیے وقف تھا۔ انھوں نے ڈرامے لکھے۔ سٹیج کے لیے اور فلم کے لیے۔ "خون بہا" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں پچاس برس پہلے کے عنوان سے خود نوشت سوانح کا پہلا حصہ شامل تھا اور یہ ۲۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زندگی کے پہلے بائیس سال (۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۵ء تک) کے مشاہدات قلم بند کیے اور اس عہد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا پورا نقشہ پیش کر دیا۔ اس کتاب میں ان کا کلام بھی موجود تھا۔ پہلے مرثیے لکھے، سلام لکھے اور پھر غزل اور نظم کی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جب میں کالج کا طالب علم تھا تو انھوں نے میرے دو مقالات کی صدارت فرمائی۔ آخر میں لوگوں نے کلام کی فرمائش کر دی تو انھوں نے جو نظمیں سنائیں۔ وہ میں نے نوٹ کر لیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

ایک بے حجاب دوشیزہ کو دیکھ کر

لائے گی اک دن ہم پہ خرابی
یہ بے حجابی یہ بے نقابی

مجلس میں رقصاں نازِ خراماں
مجلس میں غلطاں حسنِ شرابی

رخسارِ سیمیں میں خونِ گل گوں
مینا میں جیسے مے ہو گلابی

ہونٹوں پہ سرخی آنکھوں میں کاجل
سینے پہ آنچل وہ بھی تو آبی

عشرت کدوں میں ہے رونق اس سے
گھر پہ مسلط خانہ خرابی

اے خانہ برباد سیکھی ہے کس سے
یہ شوخ چشمی یہ بے حجابی

کب تک خدارا یہ شور و مستی
یہ خود نمائی یہ خود پرستی

عہدِ حاضر کی لڑکیاں

عہدِ حاضر کی لڑکیوں سے کہو
تم سے پہلے بھی لڑکیاں تھیں بہت

نازنیں، حور وش، پری اندام
حسن میں ان کے شوخیاں تھیں بہت

پدمنی اور چاند بی بی سی
دیش کی اپنی بیٹیاں تھیں بہت

ان کی آغوش میں پلے وہ جوان
خون میں جن کے گرمیاں تھیں بہت

عصمت و عفت و حیا و وفا
اُن کے گھر کی یہ لونڈیاں تھیں بہت

تیغ زن، صف شکن، عدو افگن
ہند میں ایسی رانیاں تھیں بہت

تم کو آزادیاں میسر ہیں
پاؤں میں اُن کے بیڑیاں تھیں بہت

تم ہو ہر فن میں طاق اور بے باک
بے ہُنر تھیں وہ بے زباں تھیں بہت

پر کبھی تم نے اس پہ غور کیا؟
گرچہ جاہل یہ بیبیاں تھیں بہت

تم سے آباد ایک گھر نہ ہوا
اُن سے آباد بستیاں تھیں بہت

حکیم صاحب کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا کام ہاتھ میں لیا۔ پہلی جلد ۱۹۵۶ء میں چھپی۔ کچھ لوگوں نے انگشت نمائی فرمائی اور سرگوشیوں میں چرچا کیا کہ کہاں تھیٹر اور ڈرامے کی دنیا اور شعر و شاعری کا میدان اور کہاں تفسیرِ قرآن کی سنگلاخ زمین۔ حکیم صاحب کو اس کا حق کیسے ہوا۔ لیکن لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ ؏

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے کہ حکیم صاحب نے کم از کم بیس سال کے مطالعہ کے بعد یہ جرأت فرمائی۔ تفسیرِ قرآن کے تقاضوں میں درک کا مجھے دعویٰ نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس میں حکیم صاحب نے بامحاورہ ترجمے کے پہلو بہ پہلو بڑی سلیس اور شگفتہ زبان میں مطالب بیان کیے ہیں اور اس تفسیر کی ادبی حیثیت بھی موجود ہے۔

حکیم صاحب نے پنجاب اسمبلی کی ملازمت میں ساری عمر بسر کر دی۔ پہلے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ پھر ڈپٹی سیکرٹری بنے اور پھر سیکرٹری۔ ریٹائر ہونے کے بعد دفتری زبان کے اُردو ترجمے کے لیے حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی سے وابستہ ہوئے اور ماہرین کے تعاون سے چالیس ہزار کے قریب دفتری اصطلاحات کے اردو تراجم مرتب کر دیے۔ لاریب، یہ ایک عظیم کارنامہ تھا لیکن اس کے فوائد اس وقت آشکار ہوں گے، جب اردو کو دفتری زبان کا درجہ عطا ہوگا۔ حکیم صاحب کے فرزند انور کمال پاشا نے بھی ڈرامانگاری اور فلم سازی کے میدان میں نام پایا اور بعض فلمیں باپ بیٹے کے تعاون سے بنیں اور مقبول ہوئیں۔ میرے لیے یہ بات قدرے حیران کن ہے کہ بہت سے ادیبوں کی برسیاں منائی گئیں لیکن کسی کی توجہ حکیم احمد شجاع پر مرتکز نہیں ہوئی حالانکہ ان کی ہر جہتی اور جامع شخصیت اس قابل تھی کہ اس کی یاد کو تازہ کیا جاتا۔ ہر سال نہیں تو کبھی کبھی سہی ؛

نواب احمد یار خاں دولتانہ متحدہ پنجاب کی اتحاد پارٹی کے بہت بڑے ستون اور چیف وہپ تھے۔ اپنے قائد سردار سکندر حیات پر جان چھڑکتے تھے۔ سیاسی داؤ پیچ سے خوب آگاہ تھے لیکن جو کچھ کرتے

پارٹی کے لیے کرتے۔ چاہتے تو وزارت پر فائز ہوجاتے لیکن پارٹی کے مصالح دامن گیر رہے۔ اگر انھیں چیف پارلیمنٹری سیکرٹری بھی نہ بنایا جاتا تو احتجاج نہ کرتے کہ پارٹی کے مفاد کے لیے ذات کی نفی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان کے نامور فرزند میاں ممتاز دولتانہ اس معاملے میں باپ سے مختلف تھے کیونکہ انھوں نے اقتدار کی جنگ لڑی اور بھی بڑے بھرپور انداز میں۔

جس زمانے میں نواب احمد یار دولتانہ نے سیاست کا ڈول ڈالا' انگریز کا طوطی بول رہا تھا اور حریت پسندانہ تحریکوں کے باوجود انگریز کا بڑا دبدبہ تھا۔ اس لیے وہ بھی برطانیہ نواز تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انگریز سے ہمیشہ خم کھاجاتے تھے۔ آزادی سے بارہ تیرہ سال پہلے کا ذکر ہے پنجاب میں گورنری کے دو امیدوار تھے۔ ایک سر ہنری کریک۔ دوسرے سر ہربرٹ ایمرسن۔ نواب صاحب کریک کے حامی تھے۔ چنانچہ انھوں نے کریک کے حق میں ایک محضر نامہ تیار کیا۔ اس پر ایک لاکھ افراد کے دستخط کروائے اور اس کی نقول وزیرِ اعظم برطانیہ، وائسرائے اور برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کو بھیجیں لیکن بات نہ بنی اور ہربرٹ ایمرسن گورنری پر فائز ہوگئے۔ اس کے بعد کسی کمیٹی کے اجلاس میں گورنر اور دولتانہ دونوں موجود تھے۔ گورنر نے سب ممبروں کی خدمت میں سگریٹ پیش کیے۔ جب نواب دولتانہ کی باری آئی تو لاابالیانہ انداز میں اپنی نشست پر جا بیٹھے اور چند لمحوں کے بعد نواب صاحب سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب! کیا آپ بھی سگریٹ پیتے ہیں؟ گویا اپنی طرف سے اُن کی سبکی کا سامان فراہم کردیا۔ نواب صاحب بولے۔ مسٹر ایمرسن! میں سستی برانڈ کے سگریٹ نہیں پیتا۔ میرے پاس دولتانہ برانڈ کے سگریٹ ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اپنا

سگریٹ کیس کھولا اور ایک سگریٹ سلگا کر مزے سے پینے لگے۔ ایمرسن کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں لیکن خاموشی کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

نواب دولتانہ ایک نہایت خوش ذوق رئیس تھے۔ وہ واقعی عام برانڈ کے سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ برطانیہ سے خاص سگریٹ منگواتے تھے جن پر دولتانہ برانڈ لکھا ہوتا تھا۔ پارٹیاں کرنے میں انھیں خصوصی ملکہ حاصل تھا بلکہ پارٹیوں کے نام بھی رکھتے تھے۔ مثلاً ایک بار لارنس گارڈن (باغِ جناح) میں سکندر ماؤنٹ پر ایک محفل برپا کی جس کا نام تھا "زین نظارہ"۔ والدِ مرحوم مولانا سالک بھی موجود تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک میز پر بیگم شاہ نواز، بیگم گیتی آرا بشیر احمد اور لاہور کی ارائیں برادری کی دوسری خواتین تشریف فرما ہیں۔ انھوں نے اس طرف دیکھ کر احباب سے کہا کہ اس پارٹی کا نام "زین نظّارہ" نہیں، "ارائیں نظّارہ" رکھنا چاہیے۔ بیگم شاہ نواز نے بات سُن لی۔ فرمانے لگیں۔ اب بہنوں سے بھی مذاق کرنے لگے؟ اس پر فضا میں قہقہے بکھر گئے۔

نواب دولتانہ شاعر بھی تھے اور ان کا کلام اکثر اخبارات کی زینت بنتا تھا لیکن افواہ مشہور تھی کہ کسی اور سے شعر کہلوا کر اپنے نام سے دے دیتے ہیں۔ کوئی حکیم احمد شجاع کا نام لیتا تھا، کوئی منوہر سہائے انور کا۔ واللہ اعلم اصل حقیقت کیا تھی؟

پنڈت ہری چند اختر پنجاب کے نامی گرامی شاعر تھے۔ تحت اللفظ کلام سناتے لیکن مشاعرہ لُوٹ لیتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں

مقبول تھے اور شاید مسلمانوں میں زیادہ ہی پسند کیے جاتے تھے۔ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے مسلمان تھے اور ع

جو ایک بات نہ ہوتی تو اولیا ہوتے

وہ یہ کہ گوشت نہیں کھاتے تھے۔ جن دنوں میں انفرمیشن بیورو میں ملازم تھا۔ سید نور احمد (ڈائریکٹر)، مسٹر دت (ڈپٹی ڈائریکٹر)، مسٹر وہرہ (نیوز ایڈیٹر) ملک یوسف العزیز (مضمون نگار) سید بشیر حسین (سٹینو گرافر) اور بندۂ عاجز دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ کوئی مہمان آ آتا تو اسے بھی بٹھا لیتے۔ ایک دفعہ پنڈت ہری چند اختر آئے تو انھیں بھی کھانے پر مدعو کر لیا۔ لیکن مشکل یہ پڑی کہ ڈشیں گوشت ہی کی تھیں۔ چنانچہ ہم نے پالک گوشت میں سے گوشت الگ کیا اور یہ کہہ کر پالک ان کے سامنے رکھ دی کہ یہ سادہ سبزی ہے۔ وہ مزے سے کھانے لگے کہ اچانک پالک سے گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا برآمد ہوا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور بلند آواز سے پکار اُٹھے:

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس پر ساری محفل کشت زعفران ہو گئی۔

والد مرحوم سے ان کی گہری دوستی تھی، اس لیے میں انھیں چچا کہا کرتا تھا۔ مجھے ان کی وہ غزل بہت پسند تھی جس کا مطلع تھا ؎

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

چنانچہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جب کسی مشاعرے میں جاتا، بلند آواز سے اسی غزل کی فرمائش کر دیتا اور موصوف میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے غزل سنا دیتے۔ ایک دفعہ چند دنوں کے وقفے سے اوپر تلے تین مشاعرے آئے۔ تیسرے مشاعرے میں انھوں نے غزل سنانے سے انکار کر دیا۔ لیکن

ہیں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ یہ غزل ضرور سنیں گے۔ اس پر وہ مسکراتے۔ کہنے لگے۔ حضرات! میرے بھتیجے کی فرمائش ہے کہ وہی غزل سناؤں۔ اور میں یہ غزل سناتے سناتے تنگ آ چکا ہوں۔ ویسے بھتیجے کی بات ٹالنا بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ اس لیے میں یہ غزل سنا دیتا ہوں لیکن آج میں یہ غزل مستقل طور پر اپنے بھتیجے کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اب آج کے بعد میں اسے اپنی غزل نہیں سمجھوں گا۔

ہری چند اختر بڑے بذلہ سنج بزرگ تھے۔ لطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ محفل آرا تھے اور ایک بات تو بھول ہی گیا۔ قطعات بھی لکھتے تھے اور نعتیں بھی کہتے تھے۔ چنانچہ بعض نعتیں بہت مقبول ہوئیں۔ اس زمانے میں یہ روایت خاصی چالو تھی کہ ہندو شاعر نعت کہتے اور مسلمان شاعر کرشن کنہیا کی مدح سرائی کرتے تھے اور اس طرح خیر سگالی بڑھتی تھی۔ سیاست الگ چیز تھی اور شاعری الگ۔ مجھے یاد نہیں کہ پنڈت ہری چند اختر نے کبھی سیاست میں دخل اندازی کی ہو۔ انھیں بھی ۱۹۴۷ء میں سرحد پار جانا پڑا۔ لیکن مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ وہ پاکستان میں رہتے تو انھیں کوئی مشکل پیش نہ آتی کیونکہ ان کے حلقۂ احباب میں مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی کثرت تھی اور ان کا مزاج بھی ایسا تھا کہ ہمارے معاشرے میں رچ بس جاتے لیکن قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ چند سال اُدھر کی بات ہے کہ اُن کے انتقال کی خبر آئی اور ہماری بے بسی ملاحظہ ہو کہ ایک تعزیتی خط بھی نہ لکھ سکے۔

اختر شیرانی کیا تھا۔ کھویا کھویا سا اک جوانِ خموش۔ مشاعرے میں آیا تو شراب

کے نشے میں مدہوش۔ جھومتا جھامتا، لڑکھڑاتا، کلام سناتا تو ٹھہر ٹھہر کر اور وہ بھی نامکمل۔ لیکن شاعری میں ایسا نام پایا کہ اپنے دَور کے بڑے بڑے شاعروں کو پچھاڑ دیا۔ وہ اردو زبان کے قد آور محقق حافظ محمود شیرانی کا فرزند تھا لیکن باپ سے مختلف مزاج اور ذوق پایا تھا۔ دو ہی مشغلے تھے۔ شاعری اور شراب نوشی۔ کہتے ہیں کہ جب احباب کے ساتھ مل کر شراب کی محفل آراستہ کرتا تھا تو پہلے کمرے کے فرش اور دیواروں پر شراب کا ہلکا چھڑکاؤ کرتا تھا تاکہ ایک خاص فضا پیدا ہو جائے۔ اس عادت سے محرومی کی وجہ سے میں ان کے زیادہ قریب نہ آ سکا لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ شراب کی حاجت انھیں کس قدر بے چین کر دیتی تھی۔ میں ایک سرکاری ہفت روزے کی ادارت کے زمانے میں معاوضے پر ان کی نظمیں چھاپا کرتا تھا۔ ایک دفعہ معاوضہ لینے آئے۔ معلوم ہوا کہ ابھی بل پاس نہیں ہوا۔ وہ رو پڑے، کہنے لگے۔ میں شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر میں نے مجبوراً انھیں دفتر سے پیشگی رقم دلا دی۔ افسوس، اسی شرابِ خانہ خراب نے انھیں عین عالمِ شباب میں موت سے ہم کنار کر دیا۔

بیسویں صدی کی دوسری تہائی کا آغاز ہوا تو اُردو شاعری میں حقیقت پسندی کا رجحان زیادہ ہمہ گیر انداز میں اُبھرا۔ اس حقیقت پسندی نے دو رُوپ لیے۔ ایک، جسے ترقی پسندی کا نام ملا، دوسرا، جو رومانیت کے نام سے مشہور ہوا۔ ترقی پسند شعرا نے سرمایہ و محنت کی آویزش اور عوام کی معاشی تمناؤں اور آرزوؤں کو شعر و شاعری کا موضوع بنایا اور رومانیت کے علمبرداروں نے کلاسیکی محبوب اور کلاسیکی عشق کو چھوڑ کر ایک نئے انداز کے واشگاف رومان کو رواج دیا۔ اس تحریک کے علمبردار اختر شیرانی تھے۔ اُردو شاعری میں محبوب

کی جنس کو ملفوف رکھا جاتا تھا اور اگر باہر لایا جاتا تو اس سے یا تو امرد پرستی مترشح ہوتی، یا طوائف پرستی۔ اختر شیرانی نے عورت سے عشق کو موضوع بنایا اور عورت بھی ایسی، جو معاشرے میں عام نظر آتی تھی۔ پرانی شاعری میں "غزل" کے لغوی معنی تو عورت سے خطاب تھا لیکن تانیث سے بڑی احتیاط سے گریز کیا جاتا تھا۔ اختر شیرانی نے عورت کو کھلم کھلا خطاب کیا۔ غزل میں، گیت میں، نظم میں، وہ محبت کا اظہار ملفوف انداز میں نہیں، واشگاف انداز میں کرتے تھے اور احساسات کی شدّت اور خواہشات کی حقیقت کو منظرِ عام پر لانے میں کوئی حجاب روا نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری کی دوسری بڑی خصوصیت غنائیت تھی۔ حفیظ جالندھری نے "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" میں غنائیت کو پروان چڑھایا لیکن یہ نقطۂ عروج کو پہنچی تو اختر شیرانی کی شاعری میں۔ رومان سے ان کا اتنا گہرا تعلق تھا کہ ایک ادبی مجلّہ نکالا تو اس کا نام بھی "رومان" رکھا اور برسوں یہ رسالہ اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۴۶ء اس اعتبار سے اختر شیرانی کے لئے خوش نصیبی کا سال تھا کہ ایک سال کے اندر اندر اس کے کلام کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آ گئے۔

آج کے زمانے میں فلمی گیت زبان زدِ عام ہو جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں شاعروں کا کلام زبان زدِ عام ہوتا تھا۔ اقبالؔ تو خیر بہت بڑے شاعر تھے۔ قوم کو جگانے والے اور اُبھارنے والے شاعر تھے اس لئے ان کا کلام تو مقبول ہونا ہی تھا۔ حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" بھی اپنے زمانے میں خوب ہر دلعزیز ہوا اس میں شعری محاسن ٹوٹا نواں ٹانواں تھے لیکن اسلام سے محبت کی بنا پر اور ماضی کی یاد کے حوالے سے اِسے قبولِ عام حاصل ہوا۔ اختر شیرانی پہلے رومانی شاعر تھے جن کی بعض نظموں نے لوک گیتوں کی طرح قبولِ عام پایا۔ مثلاً

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا، کس حال میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن، ایمانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہِ عالم سے، لعنت گہہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں تلے پھرتی ہے، اک خواب نما دُنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دُنیا
جنت کی طرح روشن، شاداب نما دُنیا
لِلّٰہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

احساسات کے واشگاف اظہار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

روپہلی چاندنی نے رات کو کھُلی چھت پر
اداسے سوتے ہوئے. بار بار دیکھا ہے
سُنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مُشکیں بہار دیکھا ہے
سُنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

مری آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اس کے سرمئی کاکل، وہ روئے نازنیں اُس کا
وہ رخسارِ حسین اس کے وہ حُسنِ یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دُنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

تمنا و حیا کی کش مکش کیوں کر مٹاؤں گا
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
اور اس کے لعلِ لب سے کس طرح بوسے چُراؤں گا
وہ پھُولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

سلمیٰ کون تھی، جس کا نام اختر شیرانی نے بار بار لیا۔ کہتے ہیں وہ گجرات کی ایک لڑکی تھی جس سے اختر کو بے حد پیار تھا۔ لیکن اختر نے کسی ایک کا نام تو نہیں لیا۔ عذرا اور ریحانہ سے محبت کے گیت بھی گائے اور ایک نظم "میری داستانِ حیات" میں سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کے علاوہ نسرین، پروین، شمسہ، ثریا، ناہید کے نام بھی لئے! اختر شیرانی اپنے دور کے نوجوانوں میں اتنے مقبول تھے کہ ہر نوجوان نے اُن سے اثر قبول کیا۔ وہی عورت سے خطاب، وہی غنائیت، وہی واشگاف اندازِ محبت۔ وہی رومان پروری!

مولانا اختر علی خان مولانا ظفر علی خان کے فرزند تھے۔ ساری عمر "زمیندار" کی ادارت

میں گزار دی۔ مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ کچھ ابنِ سالک ہونے کی وجہ سے، کچھ منصور علی خان سے دوستی کی بنا پر اور شاید اس میں میری کسی اور خوبی کا بھی دخل ہو۔ اُن کا دل ہر شخص سے محبت سے معمور تھا۔ طبیعت میں گرمجوشی موجود تھی۔ کچھ لوگوں سے ناراض بھی ہو جاتے تھے لیکن غصّہ جلد ہی کافور ہو جاتا تھا۔ باپ سے علم تو وراثت میں نہ پایا۔ کیونکہ تعلیم میں زیادہ جی نہ لگا، لیکن سیاست ضرور ورثے میں پائی۔ چنانچہ تحریکوں میں حصّہ لیا۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ آخری عمر میں انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں قید راس نہ آئی۔ اس لئے کہ بیمار تھے۔ اور صحت میں پُرانا دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ کسی زمانے میں صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سخت سردی میں بھی رات سے پڑے ہوئے سرد یخ پانی سے نہاتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ روش ختم ہو گئی، جسم فربہ ہو گیا اور طرح طرح کے عوارض نے گھیر لیا۔ اگر زندگی میں کچھ بے قاعدگیاں نہ ہوتیں تو شاید زیادہ عمر پاتے۔ کیونکہ طویل العمری اس خاندان کا خاصا رہی ہے۔ جب مولانا ظفر علی خان سیاست کی ہمہ ہمی کی بنا پر اور بعد میں طویل علالت کی وجہ سے "زمیندار" کی نگرانی سے عملاً الگ ہو گئے تو اصل زمامِ ادارت مولانا اختر علی خان کے ہاتھ آ گئی۔ طبیعت سیمابی پائی تھی۔ اس لئے "زمیندار" کی پالیسی میں بھی اتار چڑھاؤ آئے جن میں کچھ پسندیدہ تھے، کچھ ناپسندیدہ۔ "زمیندار" کی اشاعت میں بھی اتار چڑھاؤ آئے۔ کوئی مقبول تحریک ہوتی تو اشاعت آسمان سے باتیں کرنے لگتی اور روپے کی ریل پیل ہوتی۔ تحریک نہ ہوتی تو اشاعت گر جاتی اور مالی حالت بھی زبوں ہو جاتی۔ ذاتی تشہیر کے بہت قائل تھے اور اس کی دلچسپ ترین مثال یہ ہے کہ جب اُن کے چھوٹے فرزند مسعود علی خان انگلستان سے طباعت کی تعلیم پا کر لوٹے تو "زمیندار" کے

پہلے اور آخری صفحے پر ایک طویل باتصویر فیچر شائع ہوا جس میں سواری بادِ بہاری کی آمد آمد کی تصویر کچھ اس ٹھاٹھ سے بیان کی گئی جیسے عوامی دلچسپی کی بہت بڑی شخصیت نے نزولِ اجلال فرمایا ہے۔ منصور علی خان ایسی لغویت کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ جب انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں "زمیندار" ایک سال کے لئے بند کر دیا گیا اور منصور علی خان نے "آثار" جاری کیا تو اس میں کسی کی تشہیر نہیں ہوتی تھی، حتّٰی کہ مولانا ظفر علی خان کی علالت کی خبر بھی ایک کالمی سُرخی سے دی جاتی تھی۔

پاکستان کی تحریک کے دوران میں، بلکہ پاکستان بننے کے پانچ سال تک "زمیندار" لاہور کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا، نوائے وقت سے بھی زیادہ۔ اس زمانے میں مولانا اختر علی خان انجمن جرائد پاکستان کے صدر منتخب ہوئے اور اس دوران انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں پیش پیش رہے کہ یہ چیز اس اخبار کی روائتی پالیسی میں شامل تھی لیکن اس تحریک نے "زمیندار" کی لُٹیا ڈبو دی۔ پابندی اُٹھنے کے بعد "آثار" بند ہوا۔ "زمیندار" کا احیاء ہوا لیکن ساکھ اتنی گر چکی تھی کہ اخبار کو سنبھالا نہ مل سکا۔ اس دوران میں مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے اور "زمیندار" چلانے کا پورا بوجھ منصور علی خان اور ان کی بیگم اور ہماری بھابی فرخ کے کندھوں پر پڑ گیا۔ ان دونوں نے بڑے جتن کئے لیکن کام نہ بنا اور آخر "زمیندار" کو بند کر کے کراچی میں بسیرا کر لیا۔ یہ دونوں کبھی کبھی لاہور آتے ہیں تو غریب خانے کو بھی نوازتے ہیں اور اپنی شگفتہ باتوں سے طبیعت خوش کر دیتے ہیں۔ بھابی فرخ کو تو میں نے "باغ و بہار بھابی" کا خطاب دے رکھا ہے کہ خوش کلامی اُن پر ختم ہے۔

میاں افضل حسین سائنس دان بھی تھے اور ماہرِ تعلیمات بھی

میں انہیں سائنسدان کی حیثیت سے نہیں جانتا لیکن ماہر تعلیمات کی حیثیت سے ضرور جانتا ہوں کیونکہ مجھے برسوں اُن سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ اُس دور میں بھی جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور اُس دور میں بھی جب وہ کسی عہدے پر فائز نہیں تھے، وہ پنجاب کے مایۂ ناز سیاست دان میاں فضل حسین کے بھائی تھے لیکن وہ اس میدان میں داخل نہ ہوئے کہ عام آدمی کو سیاسی دُنیا کے اُتار چڑھاؤ راس نہیں آتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کبھی کبھی علمی انداز میں سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کر دیتے تھے۔ چنانچہ ریٹائرڈ زندگی کے دوران میں انہوں نے اخبارات کے نام مکاتیب میں متناسب نیابت کے انتخابی نظام کے حق میں لکھا۔ یعنی وہ نظام جس میں ووٹ امیدواروں کو نہیں، پارٹیوں کو دیئے جاتے ہیں اور ووٹوں کے فی صد تناسب کے مطابق پارٹیوں کو قانون ساز ایوان میں نشستیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اس تجویز کی طرف متوجہ کیا اور میں نے اس کے حق میں ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا۔ بر سبیل تذکرہ، پاکستان پیپلز پارٹی نے بھی اپنے منشور میں اس انتخابی نظام کو رائج کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

میاں افضل حسین سے میرا ہمیشہ گہرا رابطہ رہا۔ وہ جب کوئی مہم چلاتے مجھے مشورے کے لئے بلاتے اور میرا تعاون چاہتے اور یہ کوئی اس زمانے کا ذکر نہیں، جب وہ وائس چانسلر تھے، بلکہ اس کے بعد بھی، بلکہ آخری دم تک۔ بعض اوقات تحقیق کے دوران میں کسی اخباری حوالے کی ضرورت پڑتی تو مجھے یاد فرماتے اور رابطہ اس حد تک تھا کہ والدِ مرحوم کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے آئے۔ اور مسلم ٹاؤن کے قبرستان کو پُر فضا پایا۔ تو اس کے بعد میرے نام ایک خط لکھا۔ کہ میرے لئے اور میری بیوی کے لئے مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں جگہ لے دو۔ خواہ

اس کے لئے مجھے معاوضہ ہی کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ افسوس! میں اُن کی یہ آرزو پوری نہ کر سکا۔ وہ بہت غصیلے مشہور تھے، لیکن میں نے اُن کا غصّہ نہیں دیکھا البتہ شفقت دیکھی اور وہ بھی بے پایاں، یہاں تک کہ جب وہ وائس چانسلر تھے تو میں صدر شعبۂ صحافت کی حیثیت سے بعض اوقات اتنی تیزی اور ترشی کا مظاہرہ کر جاتا تھا جو دفتری آداب سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن اُن کی طرف سے جو جواب آیا۔ مدلّل اور مُشفقانہ!

وہ ایک تو نظم و ضبط کے معاملے میں کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ دوسرے، اُصولوں کے معاملے میں سمجھوتے کے قائل نہیں تھے۔ تیسرے، کسی کے دباؤ میں نہیں آتے تھے۔ چوتھے، اخبارات میں مخالفانہ پروپیگنڈے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پانچویں، بغیر لاگ لپیٹ کے کھری کھری بات منہ پر کہہ دیتے تھے۔ اس لئے یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ اُن سے نالاں رہتے تھے۔ میاں افضل حسین ہنستے بولتے تو تھے، حسِ مزاح سے بھی عاری نہیں تھے۔ لیکن اُن کے چہرے پر ایک دُرشتی آمیز سنجیدگی سی غالب رہتی تھی۔ جن لوگوں کا اُن سے سطحی سا تعلق ہوتا تھا۔ وہ اُن میں رعونت دیکھتے تھے لیکن جو لوگ زیادہ قریب تھے، اُنہیں رعونت نظر نہیں آتی تھی۔

آج پاکستان میں جو تعلیمی اصلاحات نافذ ہیں اُن میں بیشتر کے لئے زمین میاں صاحب ہی نے تیار کی تھی۔ مثلاً یہ انہی کی تجویز تھی کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کو ڈگری کی تعلیم سے الگ کیا جائے۔ چنانچہ یونیورسٹیاں ان امتحانات کے انتظام سے آزاد ہو گئیں اور ان کے لئے ثانوی تعلیمی بورڈ بن گئے بلکہ ایک مرحلے پر ثانوی اور ڈگری تعلیم کے لیے کالج بھی الگ الگ بن گئے۔ وہ امتحانی نظام کو ناقص قرار دیتے تھے اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اندرونی اور بیرونی ممتحن

کے تقرر کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں سمسٹر سسٹم پاکستان بھر میں نافذ ہو گیا۔ وہ بی۔ اے کے لئے دو سال کی جگہ تین سالہ کورس جاری کرنا چاہتے تھے تاکہ تعلیمی معیار بلند ہو۔ یہ نظام رائج ہو گیا۔ لیکن طلبا کی ایجی ٹیشن نے مشرقی پاکستان میں اتنی سنگین صورت اختیار کر لی کہ حکومت کو اسے منسوخ کرنا پڑا۔ لیکن اُن کی اہم ترین تجویز یہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم میں صرف ذہین اور قابل طلبا کو داخلہ دیا جائے اس پر یار لوگوں نے اِسے "تعلیمی راشن بندی" کا نام دے کر اس کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھی خاصی مفید تجویز گول ہو گئی۔ میاں صاحب نے سال ہا سال کے ڈگری یافتہ افراد کے پُرانے مسلسل ریکارڈ کی چھان بین کے بعد اعداد و شمار کے سہارے سے یہ بات ثابت کی کہ مستثنیات کے سوا عموماً جو طالب علم میٹرک میں تھرڈ ڈویژن لیتے ہیں وہ ایف۔ اے میں فیل ہو جاتے ہیں جو سیکنڈ ڈویژن لیتے ہیں وہ ایف۔ اے میں تھرڈ ڈویژن لیتے ہیں اور بی۔ اے میں فیل ہو جاتے ہیں اور ایم۔ اے اور ایم ایس سی میں جا کر اور بھی پتلا حال ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک تو وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ دوسرے، مالی وسائل ضائع ہوتے ہیں، تیسرے تھرڈ ڈویژن لینے والوں کی اتنی بڑی کھیپ تیار ہو جاتی ہے کہ کسی مصرف میں نہیں آتی اور اس طرح بے روزگاری بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بہتر ہے کہ صرف اُن طلبا کو اعلیٰ تعلیم میں داخلہ دیا جائے جن کے پنپنے اور پھلنے پھُولنے کے مواقع موجود ہوں اور جو طلبا اعلیٰ تعلیم کے قابل نہ ہوں اُن کو تکنیکی اور فنی تعلیم دی جائے تاکہ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر معاشرے کے لئے مفید بن سکیں۔ میاں صاحب نے بیس سال پہلے یہ تجویز پیش کی تھی۔ اگر اس پر عمل ہو جاتا تو پاکستان کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بے پناہ بے روزگاری سے سابقہ نہ پڑتا جو ایک لاینحل مسئلہ بن چکی ہے۔

میاں صاحب بعض اوقات ایسی تجویز بھی پیش کر دیتے تھے، جن کا جواز بہت کم ہوتا تھا اور اس پہ مخالفت بھی شدید ہوتی تھی مثلاً انہوں نے ایک مرحلے پر یہ کہا کہ اُردو زبان کے لیئے رومن رسم الخط اختیار کر لیا جائے بلکہ اس کے حق میں بہت کچھ لکھا، مجھے بھی توجہ دلائی لیکن میں نے مؤدبانہ انداز میں معذرت کر دی۔ اور کہا کہ مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔

میاں صاحب کے کردار میں مَیں نے یہ بات بہت نمایاں دیکھی کہ جب کوئی مہم چلاتے تو دلائل اور اعداد و شمار کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر۔ وہ سطحی بات کرنے کے قابل ہی نہیں تھے اور نہ سطحی بات کرنے والوں کو پسند کرتے تھے، جس منصب پر فائز ہوئے، اُس کا حق ادا کیا، پابندیٔ وقت کا خیال رکھتے تھے، ماتحتوں سے بھی یہی توقع کرتے تھے، انتظامیہ معاملات میں انصاف سے کام لیتے تھے، کسی سے دشمنی نہیں کرتے تھے، سفارش نہیں سنتے تھے۔ اب کتنے لوگ باقی ہیں جو اس راستے پر چل رہے ہیں یا چلنے کے قابل ہیں؟

میاں افتخار الدین پنجاب کے ایک مایۂ ناز فرزند تھے۔ وہ سیاست و صحافت کے ایک آفتاب تھے جو ہمارے سامنے طلوع ہوئے۔ ہمارے سامنے اپنی ضیا باریوں سے ایک عالم کو منور کیا اور ہمارے سامنے غروب ہو گئے۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے کہ میاں افتخار الدین کا نام پہلی بار سُنا۔ وہ قصور کے دیہاتی حلقے سے کانگرس کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑے ہوئے۔ کانگرس کا اثر تو نہ ہونے کے برابر تھا لیکن میاں صاحب کا ذاتی اثر و رسوخ اتنا تھا کہ کامیاب ہو گئے۔ کانگرس نے انہیں سر پر اُٹھا لیا۔ صوبہ کانگرس کمیٹی کا صدر چُن لیا اور لاہور میں اُن کی کوٹھی بیرونِ پنجاب سے آنے والے کانگرسی رہنماؤں کا مرکز بن گئی۔ گاندھی جی

جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور دوسرے رہنما انہی کے ہاں قیام کرتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ سامراج کے خاتمے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے چنانچہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بڑے زور شور سے تحریک پاکستان کے حق میں کام کرنے لگے۔ وہ کانگرس میں بھی بائیں بازو کے رجحانات کے علمبردار تھے اور لیگ میں بھی یہی کیفیت تھی۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ نے ۱۹۴۷ء کے آغاز میں شہری آزادیوں کی بحالی کے لئے جو عوامی سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ اُس میں میاں افتخار الدین کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس تحریک سے بے بس ہو کر ملک خضر حیات ٹوانہ وزارتِ اعلیٰ سے مستعفی ہوئے اور تحریک میں ایک نئی گھن گرج پیدا ہو گئی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پنجاب میں وزیر مہاجرین کے عہدے پر فائز ہوئے اور تھوڑا عرصہ بعد محسوس کیا کہ اراضی کے نظام میں انقلابی تبدیلیوں کے بغیر کام نہیں بنے گا چنانچہ بڑی گھن گرج کے ساتھ یہ نعرہ بلند کر دیا چونکہ مسلم لیگ پر جاگیردار بُری طرح مسلّط تھے اس لئے اُن کا قافیہ تنگ کر دیا گیا اور انہوں نے مسلم لیگ کو چھوڑ دیا اور آزاد پاکستان پارٹی بنالی جس کا نصب العین ایک سوشلسٹ معاشرے کا قیام تھا۔ اس سے بہت پہلے وہ اپنی مرضی سے اور اصولی اختلاف کی بنا پر وزارت سے مستعفی ہوئے۔ یہ چیز پاکستان میں عرصۂ دراز تک بڑی انوکھی رہی کیونکہ ہمارے ملک میں وزیر مستعفی نہیں ہوتے، نکالے جاتے ہیں۔ میاں افتخار الدین پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک کے اوّلین علمبردار تھے۔

... اس مسلک پر آخری دم تک چٹان کی طرح قائم رہے۔ انہیں کامیابی کیوں نصیب نہ ہوئی؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ کچھ اُن کا تساہل، کچھ کارکنوں کی بے حسی کچھ قومی مزاج کا اختلاف!

میاں افتخار الدین نے صحافت کی دُنیا میں جو کارہائے نمایاں سرانجام

دیئے۔ وہ تاریخ صحافت میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں لاہور میں انگریزی زبان کے دو بڑے روزنامے تھے۔ ایک "سول اینڈ ملٹری گزٹ" جس کی ملکیت تو سیٹھ دالمیا کے ہاتھ میں تھی لیکن مزاج انگلو انڈین اور سامراجی تھا دوسرا "ٹریبیون" جو کانگرس اور ہندو سبھا کا ترجمان تھا۔ میاں صاحب نے یکم فروری ۱۹۴۷ء کو "پاکستان ٹائمز" جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر فیض احمد فیض تھے اور نیوز ایڈیٹر مظہر علی خان۔ لاہور سے مسلمانوں کے انگریزی روزنامے پہلے بھی جاری ہوتے رہے تھے لیکن ایسے ٹھاٹھ کا اخبار نہیں نکلا تھا جو "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور "ٹریبیون" کے مقابلے کا ہوتا۔ چنانچہ یہ اخبار فوراً مقبول ہوا۔ پاکستان بنا تو "ٹریبیون" انبالے کو منتقل ہو گیا اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کئی سال تک انجیکشنوں کے سہارے چل کر آخر کار بند ہو گیا۔ "پاکستان ٹائمز" بائیں بازو کے نظریات کا حامل تھا لیکن انتہا پسند نہیں تھا۔ اس کے بعد میاں افتخار الدین نے "امروز" جاری کیا۔ جو اُردو صحافت میں طرزِ نو کا بانی تھا۔ اس کے مدیر اعلیٰ فیض احمد فیض تھے اور مدیر چراغ حسن حسرت۔ "امروز" کے بعد "ہفت روزہ لیل و نہار" جاری ہوا۔ اس کے بھی مدیر اعلیٰ فیض احمد فیض تھے اور عملاً ادارت سبطِ حسن کے سپرد تھی۔ "لیل و نہار" بھی اُردو کی ہفت روزہ صحافت میں ایک نئے انداز کا علمبردار تھا۔

ایوب خان نے جو مارشل لا نظامت قائم کی۔ اس کا ایک شرمناک اقدام یہ تھا کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تینوں اخباروں، پاکستان ٹائمز۔ امروز۔ اور لیل و نہار۔ پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ اس حرکت کے جواز میں کہا گیا کہ یہ ادارہ تجارتی "بدعنوانیوں اور نظریاتی انحراف" کا مرتکب ہے۔ یہ غیر ملکی امداد پر چلتا ہے اور یہ امداد سوویٹ یونین سے نیوز پرنٹ کی خریداری اور چین سے کوئلے کی درآمد کے رُوپ میں حاصل ہوتی ہے۔ تین سال تک حکومت کے مختلف ادارے میاں افتخار الدین پر عائد کردہ الزامات

کی تفتیش کرتے رہے لیکن کوئی ثبوت حاصل نہیں ہو سکا حکومت مسلسل اپنی پوزیشن بدلتی رہی۔ پہلے یہ کہا کہ یہ ادارہ پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے والا مواد چھاپتا ہے۔ یہ ثابت نہ ہو سکا تو کہا گیا کہ مسائل پر تبصرے میں تخریبی رنگ کا حامل تھا۔ میاں افتخار الدین نے بار بار حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ان پر عام عدالت میں مقدمہ چلائے یا کوئی ٹربیونل مقرر کرے لیکن حکومت نے ایسا نہ کیا بلکہ ادارے کو مختلف صنعت کاروں کے ہاتھ بیچا اور اس کے بعد نیشنل پریس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا میاں افتخار الدین کے لئے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا لیکن ایوب راج کے قدم ایسے جمے ہوئے تھے کہ مداوا ناممکن تھا۔

مجھے میاں صاحب سے نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ میں ان کے گھر تو صرف ایک مرتبہ گیا لیکن مجلسی تقریبات میں بعض اوقات طویل گفتگو کا بھی موقع ملا۔ جن دنوں میں ادارہ "انقلاب" کا رکن تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری اُن سے راہ و رسم زیادہ تھی کیونکہ ابھی "امروز" جاری نہیں ہوا تھا اور اراضی کے نظام میں انقلابی تبدیلیوں کی تحریک کا اُردو اخبارات میں صرف "انقلاب" حامی تھا اور وہی اُن کی تقریریں اور بیانات تفصیل سے چھاپا کرتا تھا۔ اُن سے ملاقاتوں کے دوران میں کبھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ ایک جاگیردار سے بات ہو رہی ہے۔ وہ عوامی اور شگفتہ مزاج کے مالک تھے اور گفتگو سے دل موہ لیتے تھے۔

احمد الدین اظہر یا دوسرے لفظوں میں جناب اے۔ ڈی۔ اظہر پہلی مرتبہ نواب زادہ خورشید علی خاں کے ہاں ملے تو چند لمحوں کے اندر اندر یوں گھل مل گئے جیسے برسوں پرانی دوستی ہو اور پھر ملاقاتوں کا تانتا ایسا بندھا کہ جب تک لاہور رہے ہفتے میں دو ملاقاتیں ضرور ہو جاتی تھیں۔ اُن کی تیسری بیگم محترمہ انیسہ بھی

باغ و بہار شخصیت کی مالک تھیں۔ کوئی ملاقات تنہائی میں نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اے۔ڈی۔اظہر کی شخصیت اتنی شگفتہ تھی کہ جملہ اہل خانہ جمع ہو جاتے اور لطائف و ظرائف بلکہ بعض لطائف کی ڈرامائی پیش کش سے محظوظ ہوتے تھے۔ اظہر صاحب نہ صرف اعلیٰ درجے کے شاعر تھے بلکہ فنِ عروض میں بھی کمال مہارت رکھتے تھے۔ بے شمار اساتذہ کا کلام یاد تھا، تلفظ کے بادشاہ تھے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور انگریزی ادب میں بھی خوب درک رکھتے تھے اور زبان و ادب کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا، اُنہی کی طرف رجوع سے تسلّی ہوتی تھی۔ ہم نے اُن کا مجموعۂ کلام "لذّتِ آوارگی" تو پڑھا ہی تھا لیکن میں نے ایک مرتبہ بیاض چھین لی اور الہیاتی پہلو سے بھی آشنا ہو گیا وہ دوستوں کے دوست تھے اور وہ بھی بڑے دھڑلے کے ساتھ، یونیورسٹی کے بعض معاملات میں انہوں نے ڈٹ کر مدد فرمائی اور اس کے بدلے بہت سوں کی دشمنی بھی مول لے لی۔ مجھے ان سے ایک ہی شکایت تھی اور اس کا تعلق سگ پرستی سے تھا۔ اُن کے ہاں ایک خوبصورت کُتا تھا جس کا نام تھا روسی۔ وہ بھونکتا تو نہیں تھا۔ لیکن بدتمیز بہت تھا۔ چائے کی محفل میں درآنہ گھس آتا۔ کبھی اظہر صاحب کی گود میں جا بیٹھتا۔ کبھی انیسہ کی گود میں۔ طرّہ یہ کہ کم بخت ہم سے بھی اسی پیار کا خواہاں تھا۔ مجھے اس سے بڑی کد تھی کیونکہ محفل میں وہی سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ میں کہتا کہ ڈرائنگ روم میں یا روسی رہے گا یا میں۔ بیگم صاحبہ فرماتیں۔ روسی کو نکالو گے تو میں نہیں بیٹھوں گی۔ میں صاف کہتا کہ آپ لوگوں سے تو محبت کر سکتا ہوں لیکن آپ کے کتّے سے نہیں۔ بہر حال دو ایک مرتبہ انیسہ کی مخالفت کے باوجود میں کتّے کو پاس کے کمرے میں بند کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

جناب اظہر بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے۔ پاکستان بنا تو حکومتِ پنجاب کے ناظم مالیات تھے۔ پھر دوسرے عہدوں پر پہنچے۔ مشرقی پاکستان میں بھی رہے

اور برطانیہ کے پاکستانی ہائی کمشن میں وزیر کے عہدے پر رہے۔ اس کے بعد لاہور آئے مطبوعاتِ نوائے وقت میں کچھ دیر فنانشل ایڈمنسٹریٹر کے فرائض ادا کئے۔ مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر بنے تو اُن سے ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا۔ حنیف رامے سے بھی زیادہ تر ملاقاتیں ہوتی رہیں کیونکہ وہ بھی مرکزی اُردو بورڈ میں کام کرتے تھے۔ اظہر صاحب کے بارے میں یہ شکایت عام تھی کہ فرائضِ منصبی پر اُتنی توجہ نہیں دیتے تھے، جتنی اہلِ علم سے ملاقاتوں اور گپّوں پر توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ مرکزی اُردو بورڈ میں بھی ہر وقت محفلیں آراستہ رہتی تھیں۔ ناممکیٔ دل میں عرصے سے مبتلا تھے۔ اس مرض نے کئی حملے کئے لیکن اُن میں قوتِ ارادی اتنی مضبوط تھی کہ بیماری پر جلد قابو پالیتے تھے حالانکہ نہ پرہیز کے قائل تھے، نہ آرام کے۔

اُردو زبان سے انہیں عشق تھا۔ اُسے دفتری زبان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد حکومتِ پنجاب کے ناظمِ مالیات بنے تو کھٹ سے اُردو نیم پلیٹ لگالی۔ کار کی نمبر پلیٹ ہمیشہ اُردو میں لکھواتے۔ ایک دفعہ انہوں نے "پاکستانی اُردو" کی تحریک چلائی۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ اُردو زبان کا نام ہی پاکستانی زبان رکھ دیا جائے۔ اس پر مضامین بھی لکھے لیکن بات آگے نہ بڑھ سکی۔ انہوں نے مزاحیہ شاعری میں بھی بھرپور دلچسپی لی۔ ایسی ایسی نکتہ آفرینی فرماتے کہ اکبر الٰہ آبادی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ سیاست اُن کے بس کا روگ نہیں تھی۔ ۱۹۷۰ء میں اعلان کیا کہ میں پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا ہوں لیکن جب پارٹی کے خلاف رائے عامہ تیز دیکھی تو کنی کترا گئے۔ بعد میں خیال آیا کہ پارٹی میں شامل رہتے تو نیشنل اسمبلی کی رُکنیت آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتی تھی۔ لیکن ~

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

خُدا بخش اظہر امرتسری

جن دنوں مجھے ملے "زمیندار" کے اداریہ نگار تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے۔ اچھے نثر نگار تھے اور نثر نگاری میں مولانا ظفر علی خان کے اسلوبِ نگارش کا تتبع کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خان کا پیغام مطلوب ہوتا تھا۔ وہ اظہر صاحب سے کہتے کہ پیغام لکھ دو۔ اور پیغام کی عبارت سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اسے مولانا نے نہیں لکھا۔ انگریزی زبان سے ناآشنا تھے اس لئے کبھی کبھی اداریہ نگاری میں مشکل پیش آتی تھی۔ بہرحال اچھا گزارہ کرلیتے تھے اور ہمارے لئے تو بہت مفید تھے کیونکہ جب ضرورت پڑتی۔ اُن سے ایک عدد اداریہ لکھوا لیتے تھے۔

پُرانے خلافتی کارکن تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور سیاست میں جو راستہ مولانا اختیار کرتے اُسی کو اپنا لیتے تھے۔ مولانا نے مجلسِ اتحادِ ملّت بنائی تھی اور نیلی پوشوں کی تحریک کا آغاز کیا تو اظہر امرتسری بھی اس میں شامل ہوگئے۔ بلکہ قید بھی کاٹی۔ مولانا مسلم لیگ میں شامل ہوتے تو اظہر صاحب بھی لیگ کے علمبردار بن گئے۔ طبیعت خوشگوار پائی تھی۔ جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ سیاسی مخالفین کے ساتھ بھی مجلسی تعلقات شگفتہ تھے۔ تنخواہ کم تھی۔ غریب تھے۔ مفلوک الحال تھے نہایت معمولی لباس پہنتے تھے لیکن قناعت کی دولت سے مالامال تھے۔ اصل میں وہ اس دور کے سیاسی کارکن تھے۔ جب سیاست کے توسط سے دولت نہیں، افلاس۔ اقتدار نہیں، اسیری ملتی تھی اور سیاست محض بے لوث کاموں اور قربانیوں سے عبارت تھی۔ اظہر امرتسری بھی اس قسم کی سیاست کے رسیا تھے اور اپنے حال میں خوش تھے۔ اُن کی واحد یادگار ایک کتاب ہے۔ "خونین تحریکیں"

میر محمد عسکری اغلبؔ سے عرب ہوٹل میں عبداللہ بٹ کی وساطت سے دو تین بار ملاقات ہوئی۔ شاعر تھے اور دماغ کے کچھ پرزے ڈھیلے تھے اس لئے اپنے آپ کو ذوقؔ سے بہتر شاعر قرار دیتے تھے۔ اور غالبؔ سے شکایت تھی کہ اچھے مطلعے کہہ کر بازی لے جاتا ہے۔ اُن کی بغل میں ہمیشہ ایک تھیلا رہتا تھا جس میں دستاویزات بھی ہوتی تھیں اور مجموعۂ کلام بھی۔ جن دنوں انہیں میں نے دیکھا تھیلا گٹھے کی صورت لے چکا تھا اور ایک مزدور اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اس التزام کی شانِ نزول یہ تھی کہ انہیں ہر لمحہ یہ خوف رہتا تھا کہ کوئی اُن کا کلام چُرا کر خود شاعر بن بیٹھے گا اور اس طرح اُن کی ساری عمر کی محنت اکارت جائے گی۔ عبداللہ بٹ انہیں چھیڑتے تھے اور طرح طرح کی باتیں اُگلوا لیتے تھے لیکن مجھے رحم آتا تھا کیونکہ بزرگ آدمی تھے اور بزرگوں کو "بنانا" مجھے پسند نہیں تھا۔ اُن کے بارے میں والدِ مرحوم کی سرگزشت سے ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ملاحظہ فرمایئے:

"ایک دن ماڈل ٹاؤن بس کے اڈے پر مل گئے۔ میں نے کہا میر صاحب۔ کوئی غزل وزل تو سُنایئے، نہایت آہستگی اور رازداری سے کہنے لگے نہیں اب غزل نہیں سناؤں گا۔ پوچھا خیر باشد کیوں نہیں سنائیں گے؟ کہنے لگے۔ آپ کو معلوم ہے وہ ریڈیو ایجاد ہو گیا ہے۔ اب اگر میں آپ کو غزل سناؤں تو بعض لوگ گھروں میں اپنے ریڈیو پر سُن کر نقل کر لیتے ہیں اور چھاپ کر نفع کماتے ہیں اور مجھے ایک پیسہ نہیں دیتے۔ گویا میر صاحب اپنے آپ کو ٹرانسمیٹر سمجھنے لگے تھے۔"

حضرت علّامہ اقبالؒ کو میں نے پہلی بار میاں امیر الدین کے والد ماجد میاں نظام الدین کے آموں کے باغات میں دیکھا جہاں ایک دعوت کا اہتمام تھا۔ اس میں کون کون لوگ شریک ہوئے؟ چودھری محمد حسین، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام تو یاد ہیں۔ باقی نام یاد نہیں۔ کیونکہ اس وقت میری عمر دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ مہر و سالکؔ بھی مدعو تھے اور میں ان کے ہمراہ گیا تھا۔ میرے ذہن میں علّامہ کی باتوں کا صرف ایک حصّہ محفوظ ہے۔ احباب اُن کے گرد جمع تھے۔ گپ بازی کے دوران میں کبوتر بازی کا تذکرہ آگیا اور حضرتِ علّامہ اس مشغلے کی تفاصیل بیان کر رہے تھے۔ کہنے لگے۔ سالکؔ صاحب! کبوتر کو یوں مٹھیاتے ہیں اور پھر ہاتھ کے اشارے سے طریقہ بتایا۔ دوسری مرتبہ اپنے گھر میں اُن کی محض ایک جھلک دیکھی۔ والد نے ترکیہ کے ایک اخبار نویس کے اعزاز میں دس بارہ شخصیات کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ ان میں حضرتِ علّامہ بھی شامل تھے۔ تیسری بار انہیں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں سٹیج پر بیٹھے دیکھا اُن دنوں اُن کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی نظم لا الٰہ الا اللہ سُنانی شروع کی۔ ابھی یہ دو شعر سنائے تھے ؎

؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

کہ محسوس ہُوا، آواز سب تک نہیں پہنچ رہی۔ چنانچہ ایک صاحب سے کہا گیا کہ وہ پوری نظم سنائیں۔ انہوں نے ترنّم سے سنائی۔ مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اس کے بعد چندے کی اپیل ہوئی اور اس نظم کی بدولت ہزار ہا روپے چندہ جمع ہو گیا

ممکن ہے۔ حضرتِ علاّمہ کو اور پبلک تقریبات میں بھی دیکھا ہو لیکن اس کی یاد ذہن میں محفوظ نہیں۔

اگست ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ہم لوگوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تحریک کا آغاز کیا تو حضرت علاّمہ سے براہِ راست رابطے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں تین چار ملاقاتیں ہوئیں جو میرے لئے فخر و مباہات کا باعث ہیں۔ اگست کے تیسرے ہفتے کی بات ہے۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کی تجویز کا اخبارات میں خاصا چرچا ہو چکا تھا۔ ہم نے سوچا حضرت علامہ کی تائید و حمایت حاصل کریں چنانچہ میں حمید نظامی اور ایک دوست عماد الدین احمد کے ساتھ جاوید منزل میں پہنچا۔ اندر اطلاع کرائی تو میاں محمد شفیع باہر نکلے۔ وہ بغیر کسی رسمی ملازمت کے حضرتِ علاّمہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض ادا کرتے تھے۔ وہ ہمیں اندر لے گئے۔ دو کمرے پہلو بہ پہلو موجود تھے۔ ایک ڈرائنگ روم دوسرا اس اعتبار سے بیڈ روم کہا جا سکتا تھا۔ کہ بیچ میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اور آس پاس کُرسیاں رکھی تھیں۔ حضرتِ علاّمہ گاؤ تکیے کے سہارے بستر پہ دراز تھے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ تینوں کے ساتھ ہاتھ ملائے اور اس کے بعد بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ مسلمان طلبہ میں سیاسی شعور اس نکتے پر پہنچ گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں۔ ہم نے طلبہ کے نام اُن سے پیغام مانگا۔ بولے۔ میرا پیغام تو میرے کلام سے واضح ہے۔ بہر حال میرے اصرار پر انگریزی زبان میں دو سطریں لکھا دیں جن میں ایک اس تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کیا دوسرے، اس اُمید کا اظہار کیا۔ کہ مسلمان نوجوان ہماری آواز پر لبیک کہیں گے۔ میں نے جب یہ مختصر پیغام اخبارات میں چھپوایا تو تحریک کا چرچا تیز تر ہو گیا اور باہر سے آنے والے خطوط میں اضافہ ہو گیا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۷ء کو میں نے اسلامیہ کالج سٹاف روم میں داعیوں کا ایک اجلاس بُلایا۔ میاں محمد شفیع (م۔ ش) سے صدارت کرائی۔ یہاں عہدہ داروں کا عارضی انتخاب ہوا۔ حمید نظامی کو صدر چُنا گیا اور مجھے سیکرٹری اور میاں صاحب نے اعلان کیا کہ حضرتِ علاّمہ نے ابتدائی اخراجات کے لئے کسی بزرگ سے مالی امداد کا وعدہ لیا ہے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ حضرتِ علاّمہ کی خدمت میں پھر حاضر ہوں۔ وہاں پہنچے تو حضرت علامہ تحریک کی رفتار سے بہت خوش نظر آئے۔ انہوں نے بہت سی باتیں کیں جن کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمان نوجوان کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہ بنیں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ آئین سب کمیٹی بنا لی گئی ہے اور ہمیں اپنا نصب العین طے کرنا ہے۔ اگر آپ مشورہ دے سکیں تو ہمارے لئے خوشی کا موجب ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ تم خود سوچو اور اپنا نصب العین خود طے کرو۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ نواب سر شاہنواز خان آف ممدوٹ سے ملو۔ وہ تمہیں ابتدائی اخراجات کے لئے کچھ مدد دینگے دوسرے دن میں حمید نظامی کو ساتھ لے کر نواب صاحب کے ہاں پہنچا۔ انہوں نے بہت پذیرائی فرمائی اور ایک سو روپے کا چیک عنایت کیا۔ چنانچہ ہم نے اُس زمانے کے واحد مسلمان بنک "سنٹرل ایکس چینج بنک" میں حساب کھول لیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے آئین کے خدوخال تو طے ہو گئے لیکن نصب العین کے تعین پر کچھ اختلاف تھا۔ مسلم لیگ کے نصب العین کو اپنانا ممکن نہیں تھا کیونکہ لیگ درجہ نو آبادیات چاہتی تھی اور نوجوان کامل آزادی کے خواہاں تھے ایک تجویز یہ بھی کہ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کے قیام کو نصب العین مان لیا جائے بہر حال اس سلسلے میں رہنمائی کے لئے ہم علاّمہ اقبال کے پاس پہنچے۔ بہت

باتیں ہوئیں ۔ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کے قیام کو مبہم سمجھا گیا ۔ باتوں باتوں میں حضرتِ علامہ نے کہا کہ کیوں نہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ سیشن کا انتظار کر لیا جائے ؟ لیگ بھی تو اپنے نصب العین پر نظرِ ثانی کر رہی ہے ۔ اس پر میں نے قدرے جسارت سے کام لیا ۔ اور کہا ۔ آپ نے خود ہی تو مشورہ دیا تھا کہ ہم سیاسی جماعتوں پر تکیہ نہ کریں ۔ بلکہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں ۔ ایسے میں لکھنؤ سیشن کا انتظار کیوں کیا جائے ؟ اس پر انہوں نے کہا ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ بالکل درست کہتے ہو، ہم نے کہا نصب العین کے بارے میں آپ مشورہ دیجئے گا ۔ چنانچہ انہوں نے یہ نصب العین تجویز کیا "شمال مغربی ہند میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک مسلم نیشنل سٹیٹ کا قیام" یہ تجویز ہمیں پسند آئی اور چودھری رحمت علی کی تحریکِ پاکستان سے ہم پہلے سے آشنا تھے ۔ ویسے علامہ اقبال نے "پاکستان" کا لفظ استعمال نہیں کیا ۔ آئین سب کمیٹی نے یہی نصب العین اختیار کر لیا اور جنرل باڈی نے اس پر صاد کر دیا ۔ یہ ستمبر ۱۹۳۷ء کے اواخر کی بات ہے ۔ گویا حضرتِ علامہ کی قیادت میں ہم نے آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادِ لاہور سے اڑھائی سال پہلے پاکستان کو اپنا نصب العین بنا لیا ۔

اکتوبر کے آغاز میں کمیونسٹ نواز لاہور سٹوڈنٹس یونین نے لاجپت رائے ہال میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مذمت میں ایک جلسۂ عام کیا جس سے طلبہ کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگوا، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، میاں افتخار الدین نے خطاب کیا ۔ میں اور حمید نظامی سو ڈیڑھ سو مسلمان طلبہ کے ساتھ وہاں جا پہنچے ۔ سخت گڑ بڑ کی ۔ اس دوران میں ہمارے دو ساتھیوں نے مخالفین سے ساز باز کر لی بلکہ ہمارے خلاف تقریر بھی کی ۔ دوسرے دن میں اور حمید نظامی حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ۔ وہ ہمیشہ گاؤ تکیے کے سہارے چارپائی پر دراز ملتے تھے ۔ اُس دن

ڈرائنگ روم میں ملے اور صوفہ کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ انہیں اخبارات سے جلسے کی کارروائی کا علم ہو چکا تھا۔ ہم نے تفاصیل سے آگاہ کیا اور جب مشورہ طلب کیا کہ اُن دو ساتھیوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مخالفوں سے مل گئے ہیں تو انہوں نے سخت غصّے میں کہا BREAK THEIR HEADS. EXPEL THEM. (اُن کی سرکوبی کرو۔ انہیں خارج کر دو) چنانچہ ہم دونوں وہاں سے نکل کر سیدھے اخبارات کے دفاتر میں پہنچے اور اخراج کا اعلان اشاعت کے لئے دے دیا۔

حضرتِ علّامہ سے آخری ملاقات دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا پہلا اجلاس کلکتے میں ہونے والا تھا۔ میں بعض نجی وجوہ کی بنا پر شامل نہیں ہو سکتا تھا لیکن دو نمائندے بھیجنے تھے اور اُن کے سفر خرچ کا انتظام کرنا تھا اور وہ بھی جزوی طور پر۔ کیونکہ جبل پور تک ان کے اخراجات اسلامیہ کالج، ایک آل انڈیا مباحثے کے سلسلے میں برداشت کر رہا تھا میں جاوید منزل پہنچا۔ علی بخش کی وساطت سے حضرتِ علّامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُن دنوں بیمار تھے۔ کوٹھی کے باہر ایک جانب چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی بیماری سے متاثر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے مختصر بات کی اور کہا کہ آپ اجازت دیں تو آپ کے حوالے سے نواب آف ممدوٹ سے پچاس روپے مانگ لوں۔ انہوں نے اجازت دے دی اور میں رخصت ہوا۔ اُن سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ کوئی چار مہینے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جن دنوں حضرتِ علّامہ سے رابطہ رہا میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اس سن میں علمی معاملات میں اکتسابِ فیض کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میری خوش نصیبی ہے کہ کم سنی کے عالم میں ان سے چار مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ نوجوانوں سے مل کر کتنے خوش ہوتے تھے اور انہوں نے پنجاب

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام پر کتنی مسرت کا اظہار کیا اور شمال مغربی ہند میں مسلم نیشنل سٹیٹ کے قیام کے نصب العین سے ہمارے اتفاقِ رائے پر اُن کا چہرہ مسرت سے کس طرح دمک اٹھا!

الطاف حسین نے ۱۵ اگست ۱۹۶۴ء کو ڈھائی گھنٹے کی ایک مفصل ملاقات میں بتایا۔ میں چاہتا ہوں۔ زندگی کی مصروفیتوں سے نجات پا کر اپنے گاؤں کو لوٹ جاؤں۔ وہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بناؤں۔ اور پھر کیا ہو؟

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اگلے سال انہوں نے "ڈان" کی ایڈیٹری چھوڑی اور مرکزی وزارت میں شامل ہو گئے اور ۱۹۶۸ء کے وسط میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وزیر نہ بنتے تو شاید اچھا ہوتا۔ کیونکہ ادارت اور وہ بھی "ڈان" کی ادارت وزارت سے کہیں اونچی چیز تھی۔

میں نے کہا کہ اپنی صحافتی زندگی کی داستان سنایئے۔ بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹے لیٹے فرمانے لگے۔ میرا پیشہ پروفیسری تھا۔ چاٹگام سے چھٹی پر کلکتے آیا۔ اُن دنوں خواجہ ناظم الدین نے انگریزی اخبار "دی بنگالی" خرید کر اُسے "سٹار آف انڈیا" کا نام دیا اور ایک انگریز صحافی ایچ۔ بی۔ فرنکیس کو اُس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اسی کے عہد میں میں نے قلمی نام سے ایک فیچر بلا معاوضہ لکھنا شروع کیا جس کا عنوان تھا "حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ"۔ اسے گورنر اور خواجہ ناظم الدین نے بہت پسند کیا۔ ہندوستانی اخبار "سٹیٹسمین" میں مسلم سیاسیات پر کالم لکھنے کا کام جناب ہمایوں کبیر کے سپرد ہوا۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت

علّامہ اقبال کے خلاف ناخوشگوار باتیں لکھ دیں۔ مجھے غُصّہ آیا۔ میں اخبار کے ایڈیٹر آرتھر مُور سے ملا۔ اور کہا۔ یہ بڑا ظلم ہے کہ آپ مسلم سیاسیات پر ایک ایسے شخص سے کالم لکھواتے ہیں جو مسلم سیاسیات کا سرے سے قائل ہی نہیں کیونکہ نیشلسٹ اور کانگرسی ہے۔ بھلا وہ ہماری قوم کے جذبات کی ترجمانی کیسے کر سکتا ہے؟ پھر یہ شخص علّامہ اقبال کے خلاف ناخوشگوار باتیں لکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اُن کا پایہ کتنا بلند ہے۔ جناب آرتھر مُور عقلمند تھے۔ بات سمجھ گئے اور اپنی غلطی کا ازالہ یُوں کیا کہ مسلم زاویۂ نگاہ کی عکاسی کے لئے مجھے ایک پندرہ روزہ فیچر لکھنے کو کہا۔ جسے میں "عین الملک" کے قلمی نام سے لکھتا رہا۔

الطاف حسین کی گفت گو سے معلوم ہوا کہ خواجہ ناظم الدین سے اُن کے گہرے تعلقات تھے لیکن مولوی فضل الحق سے کبھی نہ بنی۔ وجہ یہ تھی کہ خواجہ مرحوم ہمیشہ مسلم لیگ میں رہے اور فضل الحق کی بنیادی وفاداری کرشک، پرجا پارٹی سے تھی۔ وہ جب مسلم لیگ میں آئے تو کچھ ذہنی تحفظات ساتھ لائے۔ جب مسلم لیگ سے فضل الحق کی بگڑی تو الطاف حسین پر عتاب نازل ہوا۔ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں بنگال کے مسلمانوں کی دو سیاسی پارٹیاں ایک دوسری سے برسرپیکار تھیں۔ ایک کرشک پرجا پارٹی، دوسری مسلم لیگ مسلمانوں کا واحد انگریزی روزنامہ "سٹار آف انڈیا" قدرتی طور پر لیگ کے ساتھ تھا۔ الطاف حسین سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اس کی ادارہ نگاری کے فرائض ادا کرتے تھے۔ فضل الحق اقتدار میں تھے۔ اُنہیں غصّہ آیا کہ ان کا ماتحت لیگ کی حمایت کیوں کرتا ہے۔ اس پر انہوں نے الطاف حسین کو کلکتے سے ڈھاکہ تبدیل کر دیا لیکن الطاف حسین کی ہمّت دیکھیئے کہ ادارہ نگاری ڈھاکہ سے بھی جاری رکھی۔

عام انتخابات کے بعد مسلم لیگ اور کرشک پرجا پارٹی نے کولیشن وزارت

بنالی۔ اور اس کے بعد مولوی فضل الحق مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اُس زمانے میں الطاف حسین کو ڈائرکٹر اطلاعاتِ عامہ کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ اتنے میں حالات بدل گئے۔ مولوی فضل الحق اور قائداعظم کے درمیان ٹھن گئی۔ فضل الحق لیگ سے الگ ہو گئے۔ سراج گنج میں صوبہ مسلم لیگ کانفرنس ہوئی تو اُس میں قائدِاعظم کو بُلایا گیا۔ فضل الحق کو یہ منظور نہیں تھا کہ ان کی "مملکت" میں قائداعظم مداخلت فرمائیں۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود مخالفانہ مظاہرے کی تیاری شروع کر دی اور بے احتیاطی یہ کی کہ سراج گنج میں ایک دوست کو اس مضمون کا تار بھیجا کہ "ہمارے دوست کا شایانِ شان استقبال کیا جائے"۔ مطلب یہ تھا کہ مظاہرہ کیا جائے۔ یہ تار خواجہ ناظم الدین کے ہاتھ آگیا۔ انہوں نے گورنر کی خدمت پیش کر دیا۔ تاکہ اُنہیں معلوم ہو کہ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود مولوی صاحب کس طرح صوبے کے امن کا شیرازہ درہم برہم کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اس پر گورنر نے اُنہیں ڈانٹ پلائی۔ اس پر مولوی صاحب نے سارا غصہ الطاف حسین پر اُتارا بلکہ انہیں قربانی کا بکرا بنا ڈالا۔ اطلاعاتِ عامہ کی ڈائرکٹری سے ہٹایا اور راج شاہی کے کالج میں وائس پرنسپل مقرر کر دیا۔ الطاف حسین کو یہ عہدہ قبول نہیں تھا۔ اس لئے طویل چھٹی لے لی۔ پہلے دارجیلنگ پہنچے۔ وہاں اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کا نہایت شُستہ اور برمحل انگریزی ترجمہ کیا۔ کچھ دیر کشمیر میں رہے۔ پھر دہلی پہنچے۔ حکومتِ ہند کے ڈائریکٹر جنرل اطلاعات فریڈرک پکل سے ملاقات کی۔ انہوں نے اخباری مشیر کا عہدہ پیش کیا۔ الطاف حسین نے اُسے قبول کر لیا۔ اور ایک سال سے زیادہ عرصہ دہلی میں گزارا۔ اتنے میں بنگالی سیاست نے نئی کروٹ بدلی۔ خواجہ ناظم الدین دوبارہ اقتدار میں آگئے۔ اور انہوں نے موصوف کو ایک بار پھر بنگال میں ڈائرکٹر اطلاعاتِ عامہ کے عہدے پر

فائز کر دیا۔ "اسٹیٹسمن" کے مدیر آرتھر مور چھٹی پر گئے۔ تو اُن کے نائب ورڈز ورتھ نے ذاتی دشمنی کی بنا پر یہ غیر شاعرانہ حرکت فرمائی کہ الطاف حسین کا کالم بند کر دیا اور ایک بار پھر یہ خدمت ہمایوں کبیر کو سونپ دی۔ الطاف حسین ایک مرتبہ بمبئی گئے تو قائداعظم سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے پوچھا۔ آپ نے کالم لکھنا کیوں بند کر دیا ہے؟ الطاف نے کہا۔ میں نے نہیں "سٹیٹسمین" والوں نے بند کر دیا ہے۔ آرتھر مور چھٹی سے واپس آئے تو قائداعظم نے اُن سے خط وکتابت کی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر یہ کالم الطاف حسین کے سپرد ہو گیا۔ اب اس کا عنوان تھا۔ دار السلام اور قلمی نام تھا "شاہد" یہ کالم ۱۹۴۶ء تک جاری رہا۔

مسلمانوں میں انگریزی زبان کے صحافیوں کی قلت تھی اس لئے جب کوئی انگریزی روزنامہ مسلمان جاری کرتے تو ادارت پر کسی انگریز کو فائز کر دیتے تھے چنانچہ "سٹار آف انڈیا" کے پہلے دو ایڈیٹر انگریز تھے۔ "ڈان" جاری ہوا تو اُس کی ادارت ایک مشہور انگلو انڈین صحافی پوتھن جوزف کو دی گئی۔ جب یہ صاحب مستعفی ہوئے تو قائداعظم کے ارشاد پر نوابزادہ لیاقت علی خان نے خواجہ ناظم الدین کے نام خط میں لکھا کہ الطاف حسین کی خدمات "ڈان" کے سپُرد کر دی جائیں۔ چنانچہ الطاف حسین دہلی گئے اور لیاقت علی خان سے کہا۔ کہ مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دیا جائے۔ موصوف نے مجھے بتایا کہ معاملہ واقعی سوچنے کا تھا۔ ڈائرکٹر اطلاعاتِ عامہ کی تنخواہ بائیس سو روپے ماہانہ تھی۔ میں مستقل سرکاری ملازم تھا۔ تین سال اور ملازمت کر لیتا۔ تو پنشن کا حقدار ہوتا۔ اِدھر "ڈان" سے پیشکش اتنی ہی تھی کہ جو تنخواہ سرکاری ملازمت میں ملتی ہے وہی دے دی جائیگی گورنر بنگال نے مجھے مشورہ دیا کہ نوکری نہ چھوڑو۔ یہیں ٹکے رہو۔ ہم تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیں گے۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ قائداعظم کے ایک خط نے مجھے

فیصلے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے لکھا "میں ایک بار پھر آپ سے کہوں گا کہ ڈان کے ایڈیٹر بن کر آپ ایک بے نظیر حیثیت کے مالک بن جائیں گے۔ یاد رکھیئے۔ پیٹ ہی سب کچھ نہیں ہوتا"۔ اب میرے لئے کوئی اور راستہ باقی نہیں تھا۔ میں نے نوکری پر لات ماری اور "ڈان" کی ادارت سنبھال لی۔

قائد اعظم ڈان ٹرسٹ کے مینجنگ ٹرسٹی تھے۔ اس لئے الطاف حسین کے افسر بھی تھے۔ افسر کی حیثیت سے وہ کیسے تھے؟ یہ الطاف حسین کی زبانی سُنیئے "میرے نزدیک دنیا بھر میں ان جیسا اخباری افسر نہ کبھی پہلے ہوا نہ آئندہ ہوگا۔ انہوں نے کبھی کوئی ہدایات صادر نہ کیں۔ کبھی یہ نہ کہا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ وہ مجھے کہتے تھے کہ ہر مسئلے کا گہرا مطالعہ کرو۔ دیانت داری اور آزادی کے ساتھ جس رائے پر پہنچو۔ بلا تامل اس کا اظہار کر دو۔ خواہ اس میں تمہارا قائد اعظم ہی کیوں نہ ناراض ہوتا ہو۔"

الطاف حسین مسلسل بیس سال تک "ڈان" میں اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ ان کے اداریوں میں دلائل و براہین بھی ہوتے تھے۔ تیزی اور ترشی بلکہ بعض اوقات تلخی بھی موجود ہوتی تھی اور زبان کی روانی بھی غضب کی تھی۔ اگرچہ مجموعی طور پر وہ حکومت کا ساتھ دیتے رہے۔ لیکن ایسے مواقع بھی آئے جب انہوں نے اختلافِ رائے اس گھن گرج اور بھرپور انداز سے کیا کہ پوری سرکاری مشینری "ڈان" کے خلاف حرکت میں آگئی۔ لیکن وہ اپنے موقف سے نہ ہٹے۔ ایسے ہی ایک مرحلے پر "ڈان" نے اس شعر کو مستقل ماٹو بنا لیا۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

الطاف حسین کو اپنی صحافتی زندگی کے دوران ہم عصر صحافیوں کے ساتھ

معرکے بھی پیش آئے۔ پہلا معرکہ پیر علی محمد راشدی کے ساتھ ہوا جو "سندھ آبزرور" کے مدیر تھے۔ حمید نظامی کے ساتھ بھی کش مکش رہی اور زیڈ اے سلیری کے ساتھ بھی۔ اُن کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ پنجابیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خدا جانے یہ بات درست ہے یا غلط لیکن مجموعی طور پر اُن کا صحافتی کردار قابلِ رشک تھا۔

سیّد امتیاز علی تاج کا قتل ہمارے معاشرے کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے اور اُن کی بیگم محترمہ حجاب امتیاز علی کا یہ بیان ہم سب کے لئے شرمناک ہے کہ "تحقیق اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی تھی اور جب بامِ عروج پر پہنچنے والی تھی تو عین وقت پر چند ذمہ دار مگر بدقماش افراد کی مفاد پرستیوں کے تحت پُراسرار طریق پر ساری کارروائی دبا دی گئی اور یہی عمل بار بار دہرایا جاتا رہا اور یُوں قانون اور انصاف کو لاقانونیت اور بے عدلی کے آگے سرنگوں ہونا پڑا اور ہوتا رہا"

۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء کو رات کے دو بجے دو نقاب پوش قاتل آئے۔ تاجؔ اور حجابؔ دونوں کو چھرے کا شکار بنایا۔ تاجؔ جان ہار گئے۔ حجابؔ بچ گئیں، سوگ منانے کے لئے جرائم کے خلاف احتجاج کے لئے لیکن ؎

کون سُنتا ہے فغانِ درویش

امتیاز علی تاج ایک عظیم خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے فرزند، "تہذیب النسواں" کی مدیرہ اور چند کتابوں کی مصنفہ محمدی بیگم کی گود میں پلے ہوئے، "انارکلی" کے خالق۔ بے شمار کتابوں کے مصنف اُردو ڈرامے کی تاریخ کے محقق۔ دارالاشاعت پنجاب کو چلانے والے۔ "پھول" اور "تہذیب النسواں" کے ذریعے سے بے شمار بچوں اور عورتوں کو ادیب بنانے والے۔ مجلسِ ترقئ ادب کے اہتمام میں کلاسیکی کتب کی ایک طویل قطار کو منظرِ عام

پر لانے والے۔ پاکستان آرٹ کونسل کے بانی۔ تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے والے۔ ریڈیائی نشریات کے بہت بڑے ماہر۔ اَن گنت ریڈیائی ڈراموں کی تخلیق کے سزاوار۔ پاکستان بننے کے بعد "پاکستان ہمارا ہے" کے نام سے ایسے پروگراموں کے مرتب، جن سے لوگوں کا حوصلہ بلند کرنے میں بہت مدد ملی گفت گو کے بادشاہ، دل نوازیٔ سخن کے منظہر۔ لاہور کی ادبی شخصیات کی صف اوّل کے ممتاز رُکن۔ حجاب امتیاز علی کے شوہر، جو افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی دنیا میں ایک منفرد اسلوب کی مالک ہیں۔ یاسمین طاہر کے باپ، جو ریڈیائی نشریات میں باپ کی صحیح جانشین ہیں۔ نعیم طاہر کے خُسر، جو ڈرامہ نگار بھی ہیں اور تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں بھی ایک ممتاز کردار کے حامل ہیں۔ ہمارے خاندان سے اُن کا خصوصی تعلق تھا میرے والد کے جانی دوست تھے اور یہ تعلق کم و بیش پنتالیس سال تک رہا۔ میں انہیں اس رعایت سے چچا کہتا تھا۔ اور ہمیشہ اُن کی شفقتِ بے پایاں سے متاثر رہا۔

ڈرامے اور فلم کی دنیا سے ان کا خصوصی رشتہ تھا۔ کالج میں پڑھتے تھے کہ ایک ڈرامہ سٹیج کیا۔ اور اُس میں مغل حکمران اکبر کا کردار ادا کیا۔ اُن کا ڈرامہ "انارکلی" سٹیج کے نقطۂ نگاہ سے مثالی ہو یا نہ ہو۔ اتنی بات واضح ہے کہ وہ ادب کا ایک ایسا شہ پارہ ہے جس کی نظیر ڈرامے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جن دنوں میں سکول میں پڑھتا تھا انہوں نے سلور ٹون ٹاکیز کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ قائم کیا اور ایک فلم "سُہاگ کا دان" بنائی۔ یہ فلم کامیاب نہ رہی۔ کیونکہ کچھ میکانکی سُقم رہ گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد "شہر سے دُور" اور "پگڈنڈی"، کی تیاری میں انہوں نے نمایاں حصّہ لیا اور یہ دونوں فلمیں خاصی کامیاب رہیں۔ ریڈیو ڈرامے کا ذوق بھی ساتھ ساتھ نمو پاتا رہا اور اُن کے بعض ڈرامے خاصے

مقبول رہے۔

ڈرامے کی دنیا میں تحقیق کا بھی شوق تھا، جو برسوں چلتا رہا۔ انہوں نے کھوج اور کُرید سے کام لیتے ہوئے بہت سے پُرانے ڈرامہ نگاروں کی کاوشیں ڈھونڈ نکالیں۔ انہیں ایڈٹ کیا اور مناسب تعارف کے ساتھ چند کتابوں کی صورت میں مرتب کر دیا۔ اس طرح وہ ڈرامے محفوظ ہو گئے جو آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتے اور اُن کا سُراغ بھی نہ ملتا۔ یہی نہیں۔ انہوں نے پُرانے تھیٹر کی موسیقی پر بھی توجہ دی اور بعض ریڈیائی فیچروں میں پرانی دُھنیں محفوظ کر لیں۔ تھیٹر کے احیائے کے لئے بھی بہت کام کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان آرٹ کونسل سے ڈرامے سٹیج کرنے کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے باقاعدہ تھیٹر بھی جنم لے سکتا ہے اور اب بہت سے لوگ ہیں جو اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔

تاج کی تحریریں مزاح بھی موجود تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت "چچا چھکّن" کا کردار ہے کسی زمانے میں یہ کردار بہت مقبول تھا اور اُن کی کتاب "چچا چھکّن" کو اُردو ادب کے مزاحیہ شعبے میں "پطرس کے مضامین" کے برابر اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے خصوصیت سے اچھا ادب تخلیق کیا، کچھ کتابوں کے روپ میں، کچھ ہفت روزہ "پھول" کی صورت میں۔ جو نصف صدی تک جاری رہا۔ آج ہمارے ہاں جتنے بھی ادیب موجود ہیں ان میں بیشتر کسی نہ کسی رنگ میں دار الاشاعت پنجاب کی کتابوں اور "پھول" سے روشنی حاصل کر چکے تھے۔ "پھول" اور "تہذیب النسواں" کی ادارت میں انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل کیا، مثلاً عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، غلام عباس (جزیرۂ سخن وراں والے)، راجہ مہدی علی خان، پنڈت ہری چند اختر، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری اور اختر شیرانی اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور

ناول نگار منشی پریم چند کو بھی سب سے پہلے تاج نے ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی، بازارِ حسن، چوگان ہستی، دارالاشاعت پنجاب ہی نے چھاپیں۔ تحریکِ خلافت کے دوران میں والدِ مرحوم اسیرِ فرنگ ہوئے تو تاج نے اُن کے کلام کا مجموعہ "راہ ورسم منزل ہا" چھاپا۔ افسانوں کا مجموعہ "چمپا اور دیگر افسانے" کے نام سے مرتب کیا۔ ٹیگور کے ڈرامہ "چترا" کا ترجمہ بھی طبع کیا اور "دنیا چاند" بھی۔ جب والدِ مرحوم نے "زمیندار" سے کچھ عرصہ چھٹی لی۔ تو اُن سے "کاری گری" "ایجادات" "آئینِ حکومتِ ہند" وغیرہ کتابیں لکھوائیں۔ احمد ندیم قاسمی کو بھی سب سے پہلے انہی نے ادبی حلقوں سے متعارف کرایا اور ان کی پہلی کتاب "چوپال" چھاپی۔

پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوئے اور "پاکستان ہمارا ہے" کے نام سے اُن کی نگرانی میں ہر روز نصف گھنٹے کا ایک فیچر نشر ہوتا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ وہ ہفتے میں ایک فیچر مجھ سے لکھواتے تھے اور بعض اوقات بہت مختصر نوٹس دیتے تھے۔ اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ وہ میرے فیچر پسند فرماتے تھے مجلسِ ترقیٔ ادب کے ناظم مقرر ہوئے تو انہوں نے مجھ سے "صحافت پاکستان وہند میں" لکھوائی۔ اس کا نصف حصہ والدِ مرحوم کی زندگی میں لکھا۔ آدھا بعد میں۔ کچھ لوگوں کو مجھ پر اعتراض تھا کہ میں اپنی تحریروں میں والد کے صحافتی کردار کی زیادہ تعریف کر جاتا ہوں۔ چنانچہ جب کتاب کا دوسرا حصّہ میں نے تاج صاحب کے حوالے کیا تو کہا۔ کہ "انقلاب" والا باب ذرا پڑھ لیجئے گا۔ کہنے لگے۔ کیوں؟ میں نے کہا۔ اس لئے کہ یار لوگ کہتے ہیں۔ میں باپ کی زیادہ تعریف کر جاتا ہوں۔ بولے اس میں کیا خرابی ہے؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ اُن کی زیادہ سے زیادہ تعریف کرو۔

والد کی وفات سے پہلے اُن سے ملاقات تو ہوتی تھی لیکن کم کم۔ بعد میں ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ مجلسی تقریبات میں تو میں اُن کے بہت قریب ہوتا۔ کبھی

کبھی وہ خود بھی ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد اُن کے جن دوستوں نے خصوصیت سے وضعداری نباہی اُن میں نواب زادہ خورشید علی خان اور پروفیسر حمید احمد خان کے علاوہ سیّد امتیاز علی تاج بھی شامل تھے اور انہوں نے بعض نجی مسائل کو سلجھانے میں بھی بہت امداد فرمائی۔

ایک بات اور یاد آئی۔ خود اپنی ولادت سے پہلے کی! سید امتیاز علی تاج نے ۱۹۱۸ء میں "کہکشاں" کے نام سے ایک علمی و ادبی مجلّہ جاری کیا۔ جو غالباً ۱۹۲۲ء میں بند ہوا۔ اس میں والد مرحوم "گمنام" کے قلمی نام سے اُن کی معاونت فرماتے تھے۔ والد کے کُتب خانے سے اس کے چند پرچے ملے۔ اس کے بعد ایک اور ذریعے سے مزید شمارے دستیاب ہوئے تو میں نے اُس پر ایک مقالہ قلمبند کر لیا جو "صحیفہ" کے تاج نمبر میں چھپا اور میں نے اسے ایک سو "ری پرنٹ" تیار کر کے پمفلٹ کے رُوپ میں بھی پیش کر دیا۔ یہ ان کی زندگی کا ایک ایسا پہلو تھا جو عام لوگوں کی نظر سے اُوجھل تھا۔ اس لئے مجھے اس کام کی افادیت کا احساس ہے۔ میرے نزدیک یاسمین طاہر کو چاہیئے کہ اپنے والدِ مرحوم کے سوانح مرتب کر ڈالیں۔

امین الدین صحرائی ڈھنگ قسم کے سیاسی کارکن تھے۔ تحریکِ مسجد شہید گنج کی تخلیق تھے۔ پہلے مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی جماعت۔ مجلسِ اتحادِ ملت سے وابستہ تھے۔ پھر مسلم لیگ کا دامن تھاما۔ اور اُس کے ہو رہے۔ وہ ہمارے ڈھب کے آدمی نہیں تھے۔ لیکن ایک بار برکت علی اسلامیہ ہال میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ ہوا تو وہ بھی آ ٹپکے۔ چنانچہ اُن سے بھی تقریر کرا لی۔ ایک بار ... لیفوں کا ایک جلسہ اٹھانے میں اُن سے مدد لے لی تھی کیونکہ اُن کے پاس

اس کینڈے کے کچھ آدمی موجود تھے۔ اور اگر اُن سے کوئی خائف۔ تو اسی بنا پر پاکستان بننے کے بعد انہوں نے ایک ضمیمہ نما روزنامہ "جدید نظام" کے نام سے جاری کیا۔ جس کی بدولت اُنہیں پریس کانفرنسوں تک رسائی ہو گئی۔ اور اب اُن سے ملاقات کا یہی ذریعہ رہ گیا تھا۔ وہ ہر پریس کانفرنس میں اپنے ہمراہ ایک خوش گِل نوجوان ضرور لاتے۔ اور لوگ انگشت نمائی کرتے۔ ایک بار میں نے اُن سے پوچھا۔ یہ صاحب کون ہیں؟ کہنے لگے۔ جدید نظام کے رپورٹر ہیں۔ میں نے پوچھا تو پھر آپ نے تشریف آوری کی زحمت کیوں گوارا فرمائی۔ بولے زیادہ باتیں مت کرو۔

حمید نظامی مرحوم سے اُن کی گاڑھی چھنتی تھی۔ لیکن صرف ایک محدود زمانے میں۔ نظامی صاحب "ڈان" کے الطاف حسین سے معرکہ آرائی پر اُترے۔ تو انہیں یہ دقّت پیش آئی کہ پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی باتیں لکھنا اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کیونکہ "نوائے وقت" نے سنجیدہ مزاج پایا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسی باتیں لکھنے کا فریضہ امین الدین صحرائی کے سپرد کر دیا اور پھر کچھ نہ پوچھیئے کیا کچھ ہوا۔ ایک دفعہ موصوف توہینِ عدالت کے جُرم میں پکڑے گئے۔ ایک مہینے کی قید کا حکم سُنایا گیا لیکن پندرہ دن بعد رہا ہو گئے۔ کیونکہ خون دینے کی وجہ سے پندرہ دن کی معافی مل گئی تھی۔ موٹے تازے آدمی تھے۔ اس لئے خون دینے سے اُن کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ ثواب کا ثواب اور رعایت کی رعایت۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی دنیائے اسلام کے ایک داستانی کردار تھے۔ اُن کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے۔ جب ۱۹۴۷ء میں

اسّی سال سے زیادہ عمر پانے کے بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ تو سب سے زیادہ ماتم پاکستان میں ہوا لیکن فلسطینی عوام متاثر نہ ہوئے کیونکہ فلسطین کی جس نسل کے ہیرو امین الحسینی تھے۔ وہ کبھی کی مر کھپ چکی ہے۔ امین الحسینی پچھلی صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ، یروشلم اور قسطنطنیہ (استانبول) میں تعلیم پائی۔ یروشلم میں مفتیٔ اعظم کا ایک عہدہ مدّت سے چلا آتا تھا۔ اس پر اُن کے بھائی فائز تھے۔ وہ فوت ہو گئے تو ۱۹۲۱ء میں اُس عہدے پر امین الحسینی مقرر ہوئے اور کم و بیش ۲۰ سال تک یہ خدمت سر انجام دیتے رہے لیکن برطانوی حکومت نے اُنہیں برطرف کر دیا اور وہ اپنے وطن سے ایسے باہر نکلے کہ پھر کبھی نہ لوٹے لیکن مفتیٔ اعظم کا لقب بدستور استعمال ہوتا رہا۔

امین الحسینی اُن عرب سیاست دانوں میں شامل تھے جو پہلی عالمی جنگ کے دوران میں خلافتِ عثمانیہ سے عرب علاقوں کو آزاد کرانے کے آرزومند تھے اور اس سلسلے میں برطانیہ سے تعاون کرتے رہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد اعلانِ بالفور کی روشنی میں یہودی آبادکاروں کا نفوذ شروع ہوا تو مفتیٔ اعظم برطانوی سامراج کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں اُنہوں نے ایک بین الاقوامی کانفرنس یروشلم میں کی جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے بھی شامل ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہندوستان آئے۔ لاہور بھی تشریف لائے اور مختلف مجالس سے خطاب کیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس زمانے میں انہیں دیکھا جب یہودیوں کے داخلے کی رفتار بڑھی تو مفتیٔ اعظم کی قیادت میں فلسطین کے عوام نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ جسے انگریزوں نے بنوکِ سنگین کچل ڈالا اور مفتیٔ اعظم کو دس سال قید کا حکم سنایا۔ لیکن رائے عامہ کی شدت کے پیشِ نظر رہا کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے چند مہینے پہلے انگریزوں نے اس مسئلے کو حل

کرنے کے لئے لندن میں عرب حکمرانوں کی ایک کانفرنس بلائی لیکن عالمی جنگ چھڑ گئی تو یہ معاملہ ٹھپ ہو گیا۔

حالات نے ایک ڈرامائی کروٹ لی۔ ایک دن اچانک مفتئ اعظم روپوش ہو گئے اور چند دن بعد اُن کی آواز روم ریڈیو اور برلین ریڈیو سے سُنی گئی اُنہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہٹلر اور مسولینی یہودیوں کے جانی دشمن تھے۔ اور ہٹلر نے جنگ کے پہلے دَور میں پورے مغربی یورپ پر قبضہ کر کے یہ تاثر پیدا کر رکھا تھا کہ اب انگریزوں کا اقتدار چند دنوں کی بات ہے۔ ایسے میں مفتئ اعظم نے سوچا کہ فلسطین کو پنجۂ یہود سے آزاد کرانے کی ایک ہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ برطانیہ کے خلاف جرمنی کا سہارا لیا جائے۔ اُن کی نیت نیک تھی لیکن اُن کی رضاکارانہ جلاوطنی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ فلسطین سے ہمیشہ کے لئے بے دخل ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شرقِ اُردن کے برطانیہ نواز حکمران عبداللہ سے اُن کی پُرانی دشمنی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل قائم ہوا اور چھ عرب ملکوں کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو کر ہار گئیں تو اُردن کی فوج نے بیت المقدس اور اُس دو ہزار مربع میل رقبے پر قبضہ کر لیا، جسے بعد میں مغربی اُردن کا نام دیا گیا۔ ظاہر ہے اس علاقے میں مفتئ اعظم کو آنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ شاہ حسین نے جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اُنہیں اپنے ہاں بلایا لیکن اُس وقت تک امین الحسینی بالکل "آؤٹ آف ڈیٹ" ہو چکے تھے۔ کیونکہ نئی فلسطینی نسل انہیں پہچانتی ہی نہیں تھی اور اس دوران میں ایک نئی اور جاندار قیادت جنم لے چکی تھی۔ ویسے امین الحسینی صیہونیت کے خلاف مسلسل صف آرا رہے۔ اُنہوں نے عرصے سے اپنی صدارت میں ورلڈ مسلم کانگرس بنا رکھی تھی جس کا صدر دفتر بیروت میں تھا اور اگر اُن کی پذیرائی ہوئی

تو پاکستان میں جہاں وہ کم از کم تین مرتبہ آئے۔ مجھے اُن سے چودھری نذیر احمد خاں کے ہاں ملنے کا موقع ملا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب میرا تعارف کرایا گیا تو وہ میرے نام سے آگاہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند سال قبل میں نے "مشرق" میں "واقعات عالم" کے کالم میں ایک غیر ملکی اخبار کے حوالے سے یہ ذکر کیا تھا کہ اسرائیل نے باب المندب میں "عالیب" کے ننھے مُنے جزیرے میں ایک خفیہ اڈا بنا رکھا ہے۔ یہ اطلاع یہاں کے موتمر عالم اسلامی نے اُنہیں دی اور انہوں نے میرے نام ایک خط لکھا جس میں اس اہم خبر کا ذریعہ دریافت کیا۔ میں نے فوراً جواب دیا اور متعلقہ معلومات حاضر کر دیں۔ اسی حوالے سے وہ مجھے جانتے تھے۔

یہ درست ہے کہ مفتیٔ اعظم کو فلسطینی باشندوں نے اُن کے کردار کی عظمت سے بے خبری کی بنا پر چنداں اہمیت نہ دی لیکن فلسطین کی تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ زریں حروف سے لکھا جائے گا کیونکہ وہ پہلی شخصیت تھے، جنہوں نے صیہونیت کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ انگریزوں کے دانت کھٹے کئے اور انگریزوں کے پٹھو عرب سیاست دانوں کی ایک نہ چلنے دی اور اُن کے کردار کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ تمام عمر اتحادِ عالمِ اسلامی کے لئے جدوجہد فرماتے رہے۔

اوم پرکاش کا نام کون نہیں جانتا۔ ہندوستان کے نامی گرامی فلمی اداکار۔ جو ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی۔ اچھے کردار بھی ادا کرتے ہیں اور وِلین کے کردار بھی۔ اُن سے کچھ دلچسپ صحبتیں رہی ہیں۔ بلکہ ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن

؎ یہ باتیں ہیں تب کی کہ آتش جواں تھا

وہ شباب کی منزل پر تھے۔ میں عنفوانِ شباب کے مرحلے میں۔ وہ لاہور ریڈیو سٹیشن کے مستقل آرٹسٹ تھے۔ میں جنگی خبروں کا وہ مکالمہ پنجابی زبان میں لکھتا تھا۔ جو دیہاتی پروگرام کے آخر میں نشر ہوتا تھا۔ مکالمے میں دو کردار تھے۔ ایک فتح دین، دوسرا رام داس۔ فتح دین کا کردار اوم پرکاش ادا کرتے تھے۔ اور رام داس کا طفیل فاروقی۔ وہی طفیل فاروقی جو پاکستان کی دنیائے فلم میں موسیقی کی ہدایت کاری کے لئے مشہور ہیں۔ یہ دونوں بہت شوخ و شنگ جوان تھے اور مکالمے میں ؎

بڑھا بھی دیتے تھے کچھ زیبِ داستاں کے لئے

اس پر افسروں کو اعتراض ہوا اور مجھے حکم دیا گیا کہ اپنی نگرانی میں ریہرسل کرایا کرو۔ میں عجیب مصیبت میں پڑھ گیا کہ دونوں عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے۔ چلتا پُرزہ تھے۔ مجھے خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اوّل تو ریہرسل ہی میں "تنگ کرتے تھے۔ ورنہ براڈکاسٹنگ کے وقت ڈنڈی مار جاتے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار رپورٹ کر دی۔ تو اوم پرکاش نے مُنہ بنا لیا لیکن اپنی عادت نہ چھوڑی۔ اور مجھے اس صورتِ حالات سے اُس وقت نجات ملی جب ریڈیو کا کام چھوڑ کر ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں سب ایڈیٹری کر لی۔ بہرحال ان دونوں سے صاحب سلامت رہی۔ امرتسر ٹیلی ویژن سٹیشن سے ہندوستانی فلمیں نشر ہونی شروع ہوئیں تو اوم پرکاش سے غائبانہ تعلق ایک دفعہ پھر اُستوار ہو گیا۔ اُنہیں جب دیکھتا ہوں۔ بھولی بسری یادیں دامن تھام لیتی ہیں اور یوں میرے ذہن میں کہانی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

باری کو دو ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ ایک باری علیگ، کیونکہ اُنہوں نے چند مہینے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ دوسرے اشتراکی ادیب باری، کیونکہ وہ اشتراکیت کے حامی تھے اور اُنہوں نے اشتراکی ادب کی تخلیق میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران کا ذکر ہے کافی ہاؤس میں حریفانِ بادہ پیما کی محفل گرم تھی۔ باری برطانوی سامراج کے خلاف گرج رہا تھا کہ ایک بے تکلف دوست بول اٹھا "باری صاحب! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کہاں کی آزادی اور کہاں کا سواراج؟ ہمارے پاس تو بندوق ہے نہ توپ ہم برطانوی سامراج کا تختہ کیسے اُلٹ سکتے ہیں؟" اس پر باری نے کہا "جانتے ہو۔ کیا ہوگا؟ جنگ ختم ہوتے ہی چچا سٹالین چرچل سے کہے گا، ہندوستان کو آزاد کر دو۔ چرچل نہیں مانے گا تو چچا لشکر لے کر گھوڑے دوڑاتا دیوانہ وار اِدھر کا رُخ کرے گا اور ہمیں آزادی دلائے گا"۔ باری نے اپنے ہاتھوں سے گھوڑے دوڑانے کا جو نقشہ پیش کیا اس پر احباب کے قہقہوں سے سارا کافی ہاؤس گونج اُٹھا اور خود باری بھی ہنسنے لگا۔ ویسے یہ بات صرف ہنسی کی نہیں تھی۔ برعظیم کے لوگ صدیوں پُرانی تاریخ کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے۔ وہ آزادی کی جدوجہد میں دار و رسن کی آزمائشوں سے گھبراتے نہیں تھے لیکن ذہن کے ایک گوشے میں ایک ایسی اُمید بھی پرورش پا رہی تھی کہ وسطی ایشیا سے کوئی شخصیت نمودار ہوگی جو مسیحا بن کر اُس لُٹی پٹی انسانیت کے لئے نجات کا پیغام لائے گی جو ہمالہ سے راس کماری تک اجنبی راج کے ظلم تلے زندگی کے دن کاٹ رہی ہے ؎

ہوا ہے درۂ خیبر ہے وقفِ انتظار اب بھی
کہ آجائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

مجھے باری کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ بہرحال ایک بات تھی کہ اُس نے تعلیم بیچ میں چھوڑ دی اور پاؤں میں ایسا چکّر پڑا کہ برما کے دارالحکومت رنگون جا پہنچا۔ اُن دنوں برما ہندوستان کا صوبہ تھا اور رنگون سے اردو اخبار نکلتے تھے۔ باری نے ایک اخبار "شیر" میں کچھ عرصہ کام کیا اور پھر شہر بہ شہر پھرتے لاہور آ پہنچا۔ "انقلاب فرانس" پر ایک ننھی منّی کتاب لکھی جس کا اندازِ بیان خطیبانہ اور پُر جوش تھا۔ میں نے فرسٹ ایئر کے زمانے میں یہ کتاب پڑھی اور یہیں سے انقلاباتِ عالم کی تاریخ پڑھنے کا ذوق اُبھرا۔ یاد نہیں کہ پہلی ملاقات کب ہوئی بہرحال طالبعلمی کے زمانے ہی میں رابطہ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد باری نے "کمپنی کی حکومت" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو خوب مقبول ہوئی کیونکہ اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی چیرہ دستیوں کی داستان بیان ہوئی تھی اور لوگ سامراج دشمن ادب پسند کرتے تھے۔ اس کے بعد مارکس ازم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک کتاب کارل مارکس پر لکھی۔ ایک کمیونسٹ مینی فیسٹو پر اور طرّہ یہ کہ "محمد عربیؐ" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھ ڈالی۔ ان سب میں اسلوبِ تحریر میں خطابت، شدّت اور تیزی کے عناصر موجود تھے لیکن اس کے بعد "تاریخ کا مطالعہ" لکھی تو اندازِ بیان میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا اور سوچ میں ٹھوس پن اور گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔

باری فطرتاً انقلاب پسند تھا لیکن اس پیٹ کا کیا کیجئے گا کہ ہر دروازے پر دستک دینے پر مجبور کرتا ہے۔ پیشہ صحافت تھا چنانچہ بھانت بھانت کے اخباروں میں کام کیا۔ پہلے "احسان" میں، جو مسلم لیگی اخبار تھا، پھر "شہباز" میں، جو ابتدائی دور میں لیگی تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ستیہ پال کے روزنامہ

"نیشنل کانگرس" میں قلم چلاتا رہا۔ وہاں سے سرکاری ہفت روزہ "پنچایت" میں قدم رکھا اور کھیتی باڑی کے مسائل پر اظہارِ خیال کرتا رہا۔ وہاں گزارہ نہ ہوا تو سکھوں کے روزنامہ "اجیت" میں چلا گیا۔ کہاں باری۔ کہاں "اجیت"۔ حکومتِ پنجاب کے کثیر الاشاعت ہفت روزہ "ہمارا پنجاب" میں انہیں میں لے آیا۔ پاکستان بنا تو یہ اخبار بند ہو گیا اور باری برٹش انفرمیشن سروس میں ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس سے قوتِ لایموت کے معاملے میں آسودگی میسر آئی لیکن شرابِ خانہ خراب نے عارضۂ قلب کو جنم دیا اور ؎

آخر اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

بیگم باری کی ہمت قابلِ داد ہے کہ ننھے منوں کو حسن و خوبی کے ساتھ پالا۔ بڑا کیا اور کارزارِ زندگی میں داخل کر دیا۔

باری کو پنجاب سے پیار تھا۔ مجھے بھی پیار تھا اور سجاد حیدر کو بھی۔ چنانچہ ہم نے دوسرے احباب کے تعاون سے ایک ایسی مہم شروع کی جس کا یہ مقصد تھا کہ اردو اور پنجابی، دونوں کو ذریعہ بنا کر پنجاب کے عوام کو احساس دلایا جائے کہ وہ عظیم ثقافتی ورثے کے مالک ہیں چنانچہ پنجاب کے صوفیا، شعرا، لوک گیت، لوک رومان، تاریخی عمارات، پنجابی ادب اور تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کے ڈھیر لگ گئے جن کا ثبوت "پنچایت" اور "ہمارا پنجاب" کے فائل اور اُس زمانے کی ریڈیائی نشریات فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد جب حالات قدرے نارمل ہوئے تو ہم لوگ "پنجاب اکیڈمی" بنانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ باری اللہ کو پیارا ہو گیا۔ موت سے صرف چند دن پہلے اکیڈمی پر گفت گو ہو رہی تھی کہ اچانک باری نے کہا کہ آؤ ہم اکٹھے تصویر اتروائیں۔ فوٹوگرافر کے پاس گئے تو باری نے کہا کہ اکیڈمی کا سمبل شمع ہو گی چنانچہ ہم نے بیچ میں

شمع رکھ کر تصویر اُتروائی۔ دوسرے دن پروف دیکھا تو وہ پسند نہ آیا اور فیصلہ ہوا کہ ایک اور تصویر اُتروائیں گے لیکن کوئی اچھی شمع دستیاب نہ ہو سکی۔ باری کی شمعِ زندگی بُجھ گئی تو میں نے اور سجاد حیدر نے فوٹو گرافر سے پُرانی تصویر ہی حاصل کر لی۔

باریؔ کو عمرانیات (سوشیالوجی) کے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ یہ علم اُس وقت نیا نیا تھا اور پنجاب یونیورسٹی میں تو اس کی تدریس ایک عرصے کے بعد شروع ہوئی۔ اپنی کتاب "تاریخ کا مطالعہ" میں اس علم کا بڑی چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا۔ اصل میں "تاریخ کا مطالعہ" کو تین جلدوں پر مشتمل ہونا تھا اور تینوں جلدوں کی تحریر بیک وقت شروع کی۔ کبھی ایک جلد کے دو باب لکھ ڈالتے۔ کبھی دوسری جلد کے اور کبھی تیسری جلد کے۔ پہلی جلد اس کی زندگی میں ہی چھپ گئی۔ باقی جلدیں نامکمل رہیں۔ وفات کے کوئی بائیس تئیس سال بعد دوسری جلد نامکمل صورت ہی میں چھاپ دی گئی اور تیسری جلد اس لئے نہ چھپ سکی کہ بہت تھوڑے باب لکھے ہوئے تھے اور اُن سے کام نہیں بنتا تھا۔

باریؔ ریستورانوں کا رسیا تھا۔ شراب کا شغل تو "روزِ ابر و شب مہتاب" کی بات تھی اور ایسی نشستیں مخصوص احباب پر مشتمل ہوتی تھیں جو سٹفلز یا لورنگیز ریستورانوں میں لگتی تھیں۔ کافی ہاؤس اور نگینہ بیکری میں کافی اور چائے کے دور چلتے تھے اور یہاں کھلا دربار لگتا تھا۔ کافی ہاؤس میں عبداللہ بٹ، عبداللہ ملک چراغ حسن حسرت، شیخ خورشید احمد خان، حیات احمد خان، گیان چند، فیروز الدین منصور، اور دوسرے دوست جمع ہوتے تھے۔ نگینہ بیکری کی محفل میں اس سے مختلف لوگ آتے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا علم الدین سالک اور ان کے "ہم زاد" عبداللہ قریشی، مولانا صلاح الدین احمد، عاشق بٹالوی، نور الحسن ہاشمی اور کبھی کبھی

آغا شورش کاشمیری بیٹھتے تھے۔ باری اور عبداللہ بٹ دونوں محفلوں میں بیٹھتے تھے میں کافی ہاؤس کو ترجیح دیتا تھا لیکن نگینہ بیکری میں بھی بیٹھتا تھا۔ ان محفلوں میں دنیا بھر کے مسائل پر بڑی گرما گرم بحث ہوتی اور باری سوشلزم کے پرچار میں پیش پیش ہوتے تھے۔ لطیفے بھی چلتے تھے، ہنگامے بھی ہوتے تھے، نگینہ بیکری میں باری کے ہمراہ اُس کی بڑی لڑکی بھی کبھی کبھی ہوتی تھی۔ عمر سات آٹھ سال ہو گی۔ وہ پیسٹری کا شوق فرماتی تھی۔ اب تو وہ بڑی ہو گئی ہے اور چند بچوں کی ماں ہے۔ میرا اس خاندان سے ہمیشہ سے گہرا رابطہ چلا آتا ہے۔

مارچ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے۔ ایک دن شہر کی بڑی حالت تھی۔ ہم لشتم پشتم دفتر تو پہنچ گئے لیکن واپسی خطرے سے خالی نہیں تھی سجاد کی کار زیر مرمت تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ باری مُصر تھے کہ کافی ہاؤس ضرور جائیں گے چنانچہ ہم نے نیڈوز بلڈنگ (جو بعد میں پارک لگژری ہوٹل بن گیا) سے نکلے۔ باری نے کہا چھرے سے نہ ڈرو اور مزے مزے مال کی سیر کرو۔ مال سنسان تھی۔ ایک جگہ کوئی دیوانہ صفت شخص گنڈیریاں رکھے بیٹھا تھا۔ باری نے گنڈیریاں خریدیں۔ پھر اُس نے جنرل پوسٹ آفس کی بیرونی دیوار پہ ایک طرف مجھے بٹھایا اور دوسری طرف سجاد کو اور بیچ میں خود بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ ٹنڈے لاٹ کی پرواہ نہ کرو اور گنڈیریاں کھاؤ۔ اتنے میں ایک سہما سہما، ڈرا ڈرا سا ہندو لوربیا سامنے سے گزرا۔ باری نے اُسے بلایا تو اُس نے سمجھا۔ یہ لوگ مار ڈالیں گے۔ وہ بھاگنے لگا تو باری نے کہا، پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔ ہم تینوں بڑھے اور اُسے پکڑ لیا۔ باری نے کہا۔ گنڈیریاں کھا کر جاؤ۔ میں نے پوچھا حضور! ہمارا حصّہ دوسروں کو کیوں دے رہے ہیں۔ باری بولا۔ صرف ہندو مسلم اتحاد کی خاطر!

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو میں دفتر سے نصف مہینے کی تنخواہ لینے کے بعد کافی ہاؤس گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ باریؔ سفید براق کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہن کر نہایت مقطع صورت میں ایک کرسی پر براجمان ہے۔ میں نے پوچھا حضور! آج یہ لباس کیوں پہنا؟ کوئی فراڈ تو پیش نظر نہیں۔ بولے۔ آج پاکستان بنا ہے اس لئے میں بالکل پاک ہو کر آیا ہوں۔ چونکہ ہم لوگ اُن کے سگرٹوں کے قاتل تھے۔ اس لئے باریؔ نے سگریٹ بچانے کی یہ ترکیب اختیار کی کہ ڈبیا سے سگریٹ نکالتے اور میز کے نیچے پھینک دیتے۔ تاکہ ہم سمجھیں کہ ڈبیا ختم ہے۔ یہ فراڈ کچھ دیر چلتا رہا لیکن کبھی تو راز کھلنا ہی تھا۔ ایک دن ہمیں اس چال کا علم ہو گیا۔ اب ہمارا وطیرہ یہ بن گیا کہ جونہی وہ ڈبیا میز کے نیچے پھینکتے ہم اُٹھا لیتے اور سگریٹ پی لیتے۔ ایک دن باریؔ نے کہا۔ کیا فائدہ اُٹھانے کا۔ ڈبیا خالی ہے۔ ہم نے کہا کوئی بات نہیں۔ خالی ہے تو خالی ہی سہی۔ اتفاق سے ڈبیا خالی نکلی۔ باریؔ نے ہماری کرکری دیکھی تو کہنے لگے۔ تم لوگ بڑے بدمعاش ہو۔

باریؔ کے مزاج میں شوخی اور شرارت ابتدا ہی سے تھی۔ جن دنوں وہ رنگون سے آئے اور چراغ حسن حسرتؔ سے اُن کی گاڑھی چھننے لگی تو باریؔ نے والد مرحوم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دونوں نے مل کر سازش بنائی۔ اور دفتر "انقلاب" میں والد صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ باریؔ نے مسکین سی صورت بنا رکھی تھی۔ حسرت نے والد سے کہا۔ کارِ ثواب پر آیا ہوں۔ یہ صاحب رنگون کے مہاجر ہیں۔ صرف برمی زبان جانتے ہیں کسی زمانے میں امیر و کبیر تھے لیکن اب ایسے قلاش ہوئے ہیں کہ روٹی کے محتاج ہیں۔ آپ کے پاس لایا ہوں۔ حسبِ توفیق مدد فرمائیے۔ والد نے بڑے معذرت خواہانہ انداز

میں دو روپے پیش کئے۔ اور کہا۔ اس وقت یہی حاضر کرسکتا ہوں۔ اس پر باریؔ اور حسرتؔ نے زور کا قہقہہ لگایا اور اس کے بعد باقاعدہ تعارف کرایا اور گپ شروع ہوگئی۔

باریؔ کچھ عرصہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا رُکن رہا۔ تقسیم کے بعد دو ایک سال میں بھی اس جماعت سے وابستہ رہا۔ آخر ہم دونوں بدظن ہو کر نکلے۔ دونوں کا مزاج جمہوری تھا اور اس جماعت میں بات جمہوریت کی ہوتی تھی لیکن حکم کمیونسٹ پارٹی کا چلتا تھا۔ پھر کمیونسٹ حضرات کی پالیسی میں ایشیائی محبوب کا سا بانک پن اور تلون موجود تھا ؎

یہ لوگ بھی عجب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

ہم اس آہن سازی اور دوسرے لفظوں میں انتہا پسندی سے نالاں تھے اس لیے کنارہ کش ہو گئے۔

باغ علی ایک غریب اور بے سروسامان کمیونسٹ کارکن تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اُن سے اُس وقت رابطہ پیدا ہوا جب میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا والہ و شیدا تھا۔ کمیونسٹ ادیبوں سے میرا جھگڑا ہو گیا اور معاملہ اخباروں تک پہنچ گیا تو باغ علی ملے اور انہوں نے بتایا کہ میاں افتخار الدین نے کمیونسٹ پارٹی کو جکڑ رکھا ہے۔ وہ خود جاگیردار ہیں اور انہوں نے بائیں بازو کے نظریات کو فیشن کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ ورنہ کہاں وہ، کہاں کمیونزم۔ چونکہ پارٹی کو پیسہ انہی سے ملتا ہے اس لئے پالیسی کی تکمیل بھی انہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی مرضی کے کارکنوں کو آگے بڑھاتے ہیں اور جن کارکنوں سے اختلاف

ہوتا ہے، انہیں پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں۔ اُن دنوں مجھے اور کمیونسٹ کارکن بھی ملے۔ وہ بھی یہی کہانی سُناتے تھے۔ چنانچہ میں نے قلمی نام سے اخباروں میں ایک مضمون لکھا جس میں اس صورتِ حالات کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر پارٹی کے لوگ برہم ہوئے۔ باغ علی سے خاص طور پر باز پُرس کی اور اُن سے توبہ کرائی اور حکم دیا کہ نیلا گنبد کے الیف سی کالج بس کے سٹینڈ پر چند کارکنوں کی معیت میں اس وقت کمیونسٹ ترجمان "سازِ نو" بلند آواز سے بیچیں جب میں وہاں کھڑا ہوں، تاکہ مجھے کمیونسٹ پارٹی کی قوت کا احساس ہو لیکن باغ علی سے آنکھیں ملیں تو وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ بے ساختہ کہہ اُٹھے "خورشید صاحب! ہور کوئی رستہ نہیں لبھدا"۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ اپنا کام کرتے چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ لوگ دو ایک نعرے بلند کر کے چلے گئے۔ کئی سال بعد اُن سے ملاقات ہوئی۔ تو ٹیکسی میں۔ وہ ٹیکسی ڈرائیو کر رہے تھے۔ میں نے انہیں نہ پہچانا اور کہا مسلم ٹاؤن جانا ہے۔ اچھرے سے ایک میل آگے۔ بولے۔ مجھے معلوم ہے۔ پوچھا۔ وہ کیسے؟ کہنے لگے۔ خورشید صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں باغ علی ہوں۔ اس پر میں نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ راستے میں خوب باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ نئی، کچھ پُرانی۔ وہ اس کے بعد ٹیکسی ڈرائیورز یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن تپ دق میں مُبتلا ہو کر جان ہار گئے۔ کہ غریب سیاسی کارکنوں کا محبوب مرض یہی ہے۔

آغا باقر نبیرۂ آزاد آغا طاہر سے بالکل مختلف تھے۔ وہ نہ ہنسوڑ تھے، نہ زیادہ خوش مزاج۔ ایک سنجیدہ طبیعت پائی تھی اور محفل آرائی سے کہیں زیادہ علم و ادب سے واسطہ تھا۔ لاہور کے نامی گرامی ادیبوں سے رابطہ رکھتے تھے

مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال پر کچھ عرصہ "ادبی دنیا" کے مشیر رہے۔ علم کے معاملے میں خِسّت کے روادار نہیں تھے۔ جو آتا فیض پاتا۔ ایک بار مجھے مولانا محمد حسین آزاد کی صحافت پر ایک مقالہ لکھنا تھا۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کمالِ شفقت سے پیش آئے۔ اور نہ صرف پرانے رسائل و جرائد کے مطالعہ کا موقع دیا بلکہ بعض اہم دستاویزات بھی دکھائیں۔ جن سے میں نے اقتباسات نقل کئے اور اس کے بعد ایک جامع مقالہ لکھنے کے قابل ہو گیا۔

آغا باقر نے ساری عمر لاہور میں گزاری۔ اُردو ادب کی تاریخ پر چند کتابیں لکھیں۔ ادبی رسائل کے لئے علمی مقالے تحریر کئے اور کبھی کبھی کسی ادبی محفل سے خطاب بھی فرمایا۔ لیکن زبانی نہیں، تحریری طور پر۔ اُن سے میرا تعلق مولانا صلاح الدین احمد کی وساطت سے ہوا۔ کیونکہ وہ اکثر مولانا ہی کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "ادبی دنیا" کے دفتر اور اُن کے مسکن میں بہت کم فاصلہ تھا۔ انہوں نے اس دوستی کو نباہنے کی بہت سعی کی۔ مولانا کی وفات کے بعد بڑی کوشش کی کہ "ادبی دنیا" میں جان پڑ جائے۔ اس کے مدیر عبداللہ قریشی کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ لیکن "ادبی دنیا" کا نصیب ہی کچھ ایسا پھوٹ گیا تھا کہ یہ جاری نہ رہ سکا۔

ملک برکت علی کی شخصیت بڑی دلآویز، بڑی پُرکشش تھی۔ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ جب جاتا، سر پر اُٹھا لیتے۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو اُن سے بڑا اعتماد تھا۔ اعلیٰ درجے کے پارلیمانی مقرر تھے۔ انگریزی زبان میں فصاحت و بلاغت اُن پر ختم تھی۔ آواز گونج دار تھی۔ اندازِ خطاب مدلّل تھا۔ چونکہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے واحد نام لیوا تھے۔ اس لئے والدِ مرحوم نے اپنے مزاجیہ

کالم "افکار و حوادث" میں اُن پر "لالۂ صحرائی" کی پھبتی کسی جس سے سب لُطف اندوز ہوئے۔ وہ اس صدی کے آغاز میں "پنجاب آبزرور" کی ادارت فرماتے رہے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو خوب چمکے۔ لیگ میں آئے تو قائداعظمؒ کے بہت محبوب ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ سال تک آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رُکن نامزد ہوتے رہے۔ سکندر جناح پیکٹ کے بعد وہ بھی بے آسرا ہو گئے لیکن انہوں نے لیگ کا دامن نہ چھوڑا۔ ایک آدھ بیان سر سکندر کے خلاف دیا اور پھر منقار زیر پر ہو گئے۔ لیگ سے سرگرم وابستگی کے دوران میں غالباً ۱۹۳۶ء میں "نیو ٹائمز" کے نام سے ایک ہفت روزہ جریدہ نکالا اس میں میرے بیانات بھی چھپتے تھے، اور مضامین بھی۔ سکندر جناح پیکٹ کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔

ایک دفعہ ہمارے حریفوں نے خدا جانے اُن پر کیسے ڈورے ڈالے کہ ملک صاحب نے اُن کے حق میں ایک بیان دے دیا۔ حریفوں نے اسے خوب اُچھالا اور ہمیں زچ کیا۔ میری رگوں میں بھی جوانی کا خون موجیں مار رہا تھا میں نے ایک بیان داغ دیا جو متوازن زبان اور لہجے سے عاری تھا۔ کسی نے بتایا کہ ملک صاحب بڑے ناراض ہیں۔ کہتے ہیں۔ خورشید آیا تو اس کا سر توڑ دوں گا میں اس ڈر کے مارے کافی دیر تک اُن سے نہ ملا۔ لیکن جب ایک مجلسی تقریب میں ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے ایسی شفقت فرمائی کہ میں حیران رہ گیا اُن کے بیٹوں ملک مراتب علی، ملک شوکت علی اور ملک افتخار علی سے بھی مجھے شرفِ نیاز مندی حاصل رہا۔

چودھری برکت علی لاہور کے مشہور ناشر تھے۔ مکتبۂ اُردو اور پنجاب بُک ڈپو

کے بانی تھے۔ اُن کا مزاج سیاسی تھا۔ کچھ مجلسِ احرار کے ساتھ وابستگی تھی۔ کچھ کانگریس کے ساتھ۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مکتبۂ اُردو کے اہتمام میں سیاسی ادب کی نشر و اشاعت فرمائی۔ کارل مارکس، اینجلز اور لینن کے بعض کتابچے چھاپے، مارکس ازم اور کمیونسٹ مینی فیسٹو اور سرمایہ داری اور جاگیرداری پر کتابیں شائع کیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر باری، عبداللہ ملک اور گوپال متّل کے قلم سے نکلیں۔ برطانیہ میں چھ چھ پنس کی پیپر بیک کتابوں کا پنگوئن سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے اُردو میں چھ چھ آنے کی درجنوں کتابیں چھاپ ڈالیں۔ جو بہت مقبول ہوئیں۔ مصنّفوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہیں تھا کیونکہ مسودات مصنفین کی مالی مشکلات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اونے پَونے داموں خرید لیتے۔ اس میں مصنفین کا بھی قصور تھا کہ وہ رقم پیشگی چاہتے تھے۔ "انقلاب" بند ہونے پر میں نے فری لانس کام شروع کیا تو چودھری صاحب کے لئے کچھ کتابیں لکھیں۔ پیسے مل تو جاتے تھے لیکن بڑی مصیبت کے بعد۔ ایک کتاب کے معاوضے میں انہوں نے جھگڑا کیا۔ اس سے میرا دل کھٹا ہو گیا اور میں نے اُن سے کتاب نویسی کا رشتہ توڑ لیا۔ بہرحال عام روابط جاری رہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ گپ بھی چلتی رہی۔ اُن کی تمام کمزوریوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اُنہوں نے اُردو ادب کی نشر و اشاعت میں ایک نمایاں اور بھرپور کردار ادا کیا اور بے شمار نئے ادیبوں کو عوام سے متعارف کرایا۔

الف۔ ڈبلیو لیسٹن "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے دورِ عروج کے آخری ایڈیٹر تھے۔ بڑے دھڑلے کے آدمی تھے۔ اور سچ مچ کے آزاد منش ایڈیٹر تھے۔ کسی قسم کے دباؤ میں نہیں آتے تھے لیکن توازن و اعتدال کے ساتھ لکھتے

تھے۔ اُن کے اداریئے مختصر، مدلل اور جان دار ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اُن کے دَور میں ایک آفت بھی آئی۔ وہ یہ کہ دہلی کے نامہ نگار کے حوالے سے صفحۂ اوّل پر ایک خبر میں بتایا گیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ریاست جموں وکشمیر کی تقسیم کا منصوبہ زیرِ غور ہے۔ اس کے خلاف پاکستان کے سات آٹھ نمائندہ روزناموں نے ایک مشترکہ اداریہ چھاپا جس میں اخبار کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ حکومت نے تین مہینے کے لئے اخبار بند کر دیا۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے اس کارروائی کے خلاف شدید احتجاج کیا اور ایجی ٹیشن بھی کی۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مسٹر لیسٹن نہایت انصاف پسند اخبار نویس تھے دو دفعہ اخبار کے بعض کارکنوں نے میرے خلاف غلط خبر چھاپ دی۔ میں نے اس پر احتجاج کیا تو موصوف نے حکماً ان کی تردید یں شائع کرائیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اخبار کو ذاتی دشمنی کا آلۂ کار بنا لیا جائے۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بین الاقوامی سیاست پر میرے مضامین مسٹر لیسٹن نہایت اہتمام سے چھاپتے رہے۔ خواجہ نذیر احمد مالک بنے تو انہوں نے ادارت میں مداخلت کی سعی فرمائی۔ لیسٹن اس چیز کے قائل نہیں تھے اس لئے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے اخراجات گھٹانے کے لئے برسوں پرانے ملازمین کو جواب دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ لیسٹن اس دھاندلی کے قائل نہیں تھے کیونکہ اس سے اخبار کا معیار گرنا شروع ہو گیا۔ آخر کش مکش اتنی بڑھی کہ اُنہیں مستعفی ہونا پڑا اور وہ اپنے وطن انگلستان کو لوٹ گئے۔ اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا وہی حشر ہوا جس کا وہ مستحق تھا۔

بنسی خاکروب کس طرح آنریبل چودھری بنسی لال بن گئے؟ اس سے ایک

دلچسپ داستان والبتہ ہے۔ آزادی سے کئی سال پہلے کا ذکر ہے مرکزی اسمبلی کے انتخابات آئے تو کانگرس نے اُن کا مقاطعہ کر دیا۔ اس کی بنا یہ تھی کہ یہ اسمبلی محض ڈھونگ ہے۔ اس لیئے اس کے انتخاب میں حصّہ لینا محض تضیعِ اوقات ہے لیکن کانگرس کو یہ سوجھ بھی آئی کہ بائیکاٹ ٹاؤٹوں اور کاسہ لیس حضرات کے لئے سنہرا موقع ثابت ہوگا اور وہ آسانی کے ساتھ اسمبلی کی رکنیت حاصل کرلیں گے۔ اس کا علاج یہ تجویز ہوا کہ کانگرس کا ٹکٹ ادنیٰ ذات کے اُمیدواروں کو دیا جائے تاکہ اسمبلی انہی سے بھر جائے۔ لاہور سے بلنسی نامی ایک خاکروب کو کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بلیٹ بکس کا نشان جھاڑو قرار پایا۔ پولنگ اسٹیشنوں پر اس کے کیمپوں میں ٹوکریوں اور جھاڑوؤں کی نمائش کی گئی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ شخص کامیاب ہوگیا اور مدّتوں اسمبلی کا رکن رہا۔ ایک تو نام بدل گیا، کیونکہ اب وہ آنریبل چودھری بلنسی لال کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ دوسرے، اُس نے دھوتی کُرتا چھوڑ کر تنگ پاجامہ اور اچکن کا لباس اختیار کر لیا اور بعد میں کانگرس کے خلاف بھی بیان دینے لگا۔

لاہور کے مسلم حلقے سے کانگرس نے ایک کمہار کو کھڑا کیا۔ اس کا نام معراج دین تھا۔ باغ بیرون موچی دروازے میں، میں نے پولنگ سٹیشن پر اُس کا کیمپ دیکھا۔ ہر طرف لوٹے، ہانڈیاں اور مٹکے نظر آتے تھے۔ بہر حال مسلمان اس لغویت کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے معراج دین کی ضمانت ضبط ہوگئی۔

میاں بشیر احمد کا گھرانہ برعظیم کی سیاست میں پیش پیش رہا۔ ان کے والد جناب جسٹس شاہ دین جج بننے سے پہلے اسلامی سیاست کے نمایاں کرداروں میں شامل تھے۔ اُن کے خُسر سر محمد شفیع تو مسلمانوں کے بہت بڑے رہنما تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ

کے صدر رہے۔ جُداگانہ انتخاب کے حق میں ہمیشہ شمشیر برہنہ بنے رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۱ء میں اُنھوں نے لاہور کے انگریزی ہفت روزہ "پنجاب آبزرور" میں ایک سلسلۂ مقالات لکھا جس میں اس بات پر زور دیا کہ مُسلمان سیاست سے علیحدہ رہنے کی روش کو چھوڑ دیں اور اپنی سیاسی تنظیم کریں۔ میاں بشیر احمد کی بیگم گیتی آرا بھی مسلم لیگ کی سیاست میں پیش پیش رہیں اور تحریکِ پاکستان میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیا

میاں بشیر احمد پہلے ہلکی پھلکی سیاست سے وابستہ رہے۔ کچھ دیر پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت فرمائی پھر تحریکِ پاکستان کو اُوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ پاکستان بننے کے بعد ترکیہ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں زور شور سے حصّہ لیا۔ اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ سیاسی زندگی سے کہیں زیادہ اُن کی ادبی زندگی بھرپور کیفیت کی حامل تھی۔ انہوں نے اپنے والدِ مرحوم جناب جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں رسالہ "ہمایوں" جاری کیا جو پچیس سال تک زندہ رہا۔ مالی اعتبار سے خسارے کا سودا تھا لیکن میاں صاحب نے محض خدمتِ ادب سے مجبور ہو کر یہ خسارہ برداشت کیا اور اِسے بند کیا۔ تو سلور جوبلی نمبر چھاپنے کے بعد۔ "ہمایوں" کی ادارت میں مولانا حامد علی خاں اور حفیظ ہوشیار پوری اُن کی معاونت کرتے رہے۔ یہ رسالہ نہایت ثقہ، سنجیدہ اور علمی نوعیت کا تھا محض ادبی رسالہ نہیں تھا اس میں حالاتِ حاضرہ اور فنونِ لطیفہ پر بھی مقالات درج ہوتے تھے۔ اس رسالے کے ذریعے سے بہت سے نوجوانوں کی ادبی صلاحیت کو جلا ملی۔ اور وہ آسمانِ ادب پر چاند بن کر چمکے۔ "ہمایوں" کسی خاص دبستانِ ادب سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ ترقی پسند ادب سے بھی غیر متاثر رہا لیکن غیر ملکی ادب کو اُردو میں منتقل کرنے

کے سلسلے میں اس کا کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اُردو زبان کا پہلا رسالہ تھا جس نے چینی ادب اور روسی ادب پر خصوصی نمبر چھاپے۔ اور اس طرح اُردو ادیبوں کے نقطۂ نگاہ میں وسعت پیدا کی۔ میاں بشیر احمد خود بھی منجھے ہوئے ادیب تھے۔ اُنھوں نے زیادہ تر ادبِ لطیف کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ ادبِ لطیف سے مُراد تھی، نثر میں شاعری۔ یہ صنف اُس زمانے میں بہت مقبول تھی۔ لیکن میاں بشیر احمد نے اس میں تخصص پیدا کیا۔ اور اُن کی خوبصورت کتاب "طلسم زندگی" اب بھی پڑھیئے تو اس سے لُطف حاصل ہوگا۔ انھوں نے شعر و شاعری بھی فرمائی لیکن کم کم۔ اُن کی نظم "ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح"، تو تحریکِ پاکستان میں زبان زدِ عام تھی اور بیشتر جلسوں میں پڑھی جاتی تھی۔

سر شیخ عبدالقادر کے بعد اُردو تحریک کی زمامِ قیادت میاں بشیر احمد کے ہاتھ آئی۔ آزادی سے کئی سال پہلے اُنھوں نے انجمنِ اُردو پنجاب کی بنیاد رکھی۔ اس کے صدر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تھے اور سیکرٹری میاں بشیر احمد۔ مشہور سائنس دان سر شانتی سروپ بھٹناگر کو اُردو تحریک میں لانے کا سہرا بھی میاں صاحب کے سر تھا۔ چونکہ وہ ایک مرنجاں مرنج بزرگ تھے اس لئے اُردو تحریک کے سلسلے میں بہت سے غیر مسلم ادیبوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہی وہ اُردو تحریک تھی، جسے بعد میں مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے آگے بڑھایا۔

میاں بشیر احمد سے مجھے ایک تہائی صدی تک شرفِ نیازمندی حاصل رہا۔ پہلے "ہمایوں" کے مضمون نگار کی حیثیت سے، پھر پنجاب مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے حوالے سے۔ اسلامیہ کالج لاہور کی ادبی مجالس کی صدارت کے لئے میں نے انہیں جب مدعو کیا، اُنھوں نے بہ کمال شفقت

میری درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا۔ چودھری نذیر احمد خان کی بنائی ہوئی جماعت "الاحبار" میں اُن سے اور گیتی آرا بیگم سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی آخری ملاقات سید امتیاز علی تاج کے انتقال پر ہوئی۔ اس وقت تک وہ بہت کمزور ہو چکے تھے اور سہارے کے ساتھ چلتے تھے۔

میاں بشیر احمد نہایت پتلے دُبلے تھے۔ شائستگی اُن پر ختم تھی بڑے دلآویز انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ نیک نیت اور مخلص تھے۔ ان کے دو فرزند تھے۔ ایک اصغر بشیر، ایک منظر بشیر، اصغر بشیر عین عالمِ شباب میں برطانیہ میں ایک دریا میں ڈوب کر انتقال کر گئے۔ یہ ایک ایسا داغ تھا جو میاں صاحب اور اُن کی بیگم کے لئے ایک عرصے تک ناقابلِ برداشت رہا۔ منظر بشیر کے نام سے ہم سب آگاہ ہیں۔ وہ بھی خاندان کی سیاسی روایت پر گامزن رہے۔ وہ دانشور بھی ہیں اور قانون دان بھی۔

بشیر احمد ہاشمی میرے والد کے عزیز دوست تھے۔ اسی رعایت سے مجھے اُن سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ ہم میں وہ تمام فاصلے حائل تھے جو عمر، حیثیت اور مقام کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں اُن کی بے پایاں شفقت سے محروم نہ ہوا۔ اُن کی وفات سے دو سال پہلے اُن کے بھائی انتقال کر گئے۔ میں نے تعزیتی مکتوب لکھا۔ چونکہ ملاقات کو ایک مدت گزر چکی تھی اس لئے اپنے نام کے نیچے خطوطِ وحدانی کے اندر "ابن سالک" لکھ دیا۔ تاکہ یاد دہانی ہو جائے۔ اس پر اُنہوں نے جو خط لکھا وہ اُن کی وضعداری کا ایسا غماز ہے کہ میں اسے درج کرنے پر مجبور ہوں۔ "عزیزم میاں سلام سلمہ! آپ کا خط ملا۔ دل نے محبت کی لذت محسوس کی۔ یہ آپ نے ابنِ سالک

مجھے میرے عزیز و محترم دوست کی یاد دلانے کے لئے لکھا تھا تو خوب کیا، ورنہ بغرضِ تعارف بجا نہ تھا۔ سنو میاں! آپ کے گھر کے مقابل ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم کی ایک زمین پڑی تھی۔ وہاں ایک موٹا، تھوڑی سی دُم کٹا ہوا، گہرے رنگ کا کتّا رہتا تھا۔ میں جب وہاں موٹر کھڑی کرتا تو وہ کبھی غرّا کر اور کبھی دُم ہلا کر میرا خیر مقدم کیا کرتا تھا۔ اب سوچو، مجھے وہ کتّا بھی یاد ہے تو سالک کی اولاد کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ اللہ تمہیں کامرانیاں زیادہ زیادہ نصیب کرے۔ دُعاگو، بشیر ہاشمی۔"

ہاشمی صاحب شروع سے میری قدر افزائی فرماتے تھے۔ جن دنوں سنٹرل ٹریننگ کالج (لاہور) کے پرنسپل تھے اور یہ پاکستان بننے سے بہت پہلے کی بات ہے، وہ ایک تعلیمی مجلّہ "آموزش" کی ادارت بھی فرماتے تھے چونکہ دنیائے اسلام میں میری دلچسپی سے آگاہ تھے، اس لئے "آموزش" کے لئے مجھ سے اسلامی ممالک کے نظام ہائے تعلیم پر مقالے لکھواتے تھے۔ وہ میرے لئے ڈپلومیٹک کیئریر تجویز فرماتے تھے۔ والد صاحب سے بار بار کہا کہ خورشید کو عربی اور فرانسیسی زبانوں کی بھی تعلیم دلوائی جائے۔ تاکہ دنیا میں جہاں جائے آسانی سے تبادلۂ خیالات کر سکے۔ والد اُن کا پیغام مجھ تک پہنچا دیتے تھے لیکن مجھے صحافت کا نشہ تھا۔ اور ؎

یہ وُہ نشہ نہیں جسے تُرشی اُتار دے

ہاشمی صاحب بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ آخری دور میں کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ میں کچھ عرصہ گزارا۔ نظم و ضبط کے خود بھی پابند تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ سخت گیر افسر ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن سخت گیری

کا مقصد افسرانہ ٹھاٹھ کا مظاہرہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے فرائضِ منصبی توجہ اور حسنِ کارکردگی کے ساتھ ادا کرے۔ دیانت داری اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ کسی پرچے کے ممتحن تھے۔ ایک دوست نے کسی کے ہاتھ سفارشی رقعہ بھیجا تو اُنھوں نے جواب دیا ''بھائی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں آپ کے لئے جان پر کھیل سکتا ہوں۔ آن پر نہیں''۔

بشیر احمد ہاشمی ایک روشن ستارہ تھے۔ جو شرافت، حسنِ اخلاق اور وضعداری کی قدریں اپنے ساتھ لے گئے۔ آج کے میکانکی اور مادی دور میں ان قدروں کا پنپنا جس قدر مشکل ہے اس سے ہم لوگ خوب آشنا ہیں۔

شیخ بشیر احمد سے اُس وقت رابطہ پیدا ہوا جب وہ پنجاب کی عدالتِ عالیہ کی ججی سے سبکدوش ایک بار پھر وکالت کا ڈول ڈال چکے تھے۔ وہ سفید ریش، نیک سیرت اور بلند کردار انسان تھے۔ بلند کردار اس اعتبار سے کہ ظاہر و باطن یکساں تھا اور قول و فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ دین سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ عشقِ رسولؐ کے جذبے سے سرشار تھے۔ ملکی سیاست پر گفت گو میں حزبی سیاست سے بالا رہتے اور صرف اس نقطۂ نگاہ سے سیاسی مسائل کا تجزیہ کرتے تھے کہ پاکستان میں ایک عادلانہ نظام قائم ہو جائے اور یہ دنیا کے لئے شمعِ ہدایت بنے۔ مجھے اُن کی صحبت میں بیٹھ کر ایک بے پایاں روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی۔ حالانکہ اُن کا عقیدہ مجھ سے مختلف تھا کیونکہ وہ قادیانی فرقے کے احمدی تھے۔ ایک بار میں نے اُنہیں کہا کہ آپ کی جماعت نے ۱۹۵۳ء کے ہنگاموں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ تکفیر کی روایت بھی جاری ہے۔ اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں سے رشتے ناطے

بند ہیں۔ اُن کی نمازِ جنازہ ادا نہیں کی جاتی اور فاتحہ پڑھنے سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔ ایسے میں عجب نہیں کہ آپ کے خلاف ایسا طوفان اُٹھے جس کے سامنے ۱۹۵۳ء کا طوفان ماند پڑ جائے۔ اُنہوں نے عظیم تر طوفان کی توقع سے اتفاق کیا لیکن باقی باتوں کے جواب میں ایک ایسی تاویل فرمائی جس سے میں اتفاق نہ کر سکا۔ وہ یکم اپریل ۱۹۷۳ء کو وفات پا گئے اور ایک سال بعد جب طوفان آیا تو وہ مجھے بار بار یاد آتے رہے۔

ملکی حالات پر بہت مشوش رہتے تھے۔ وہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے تو میں نے ایک خط میں مزاج پُرسی سے گریز کا یہ سبب بیان کیا کہ ملکی حالات اچھے نہیں ہیں اور میں اُن پر تبادلۂ خیالات کر کے مرض میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ عرصہ بعد ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے بتایا کہ دل کے دورے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ملکی حالات پر غیر معمولی انداز میں مشوش تھا۔

پرتھوی پال سنگھ میرے اُستاد تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت کے بانی تھے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں اُن کے اوّلین تلامذہ میں شامل تھا۔ "ٹریبیون" کے سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر راجا جنگ بہادر سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ تھوڑی بہت صحافت فرمائی۔ ایک غیر ملکی یونیورسٹی سے صحافت کا ڈپلومہ حاصل کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں ۱۹۴۱ء میں شعبہ صحافت کا ڈول ڈال دیا چونکہ میں اُن کے اچھے شاگردوں میں شامل تھا اس لئے بہت پیار کرتے تھے اور جب کوئی سالانہ تقریب ہوتی تو مجھے مقالہ پڑھنے کے لئے بلاتے تھے۔ دوستوں کو معلوم تھا کہ پرتھوی پال سنگھ میری بات مانتے ہیں۔ غالباً ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے کہ اُن کی کلاس میں ایک ہندو طالب علم للت کمار پوری پڑھتے تھے۔ ایک دوست

اُنہیں بہت پسند کرتے تھے۔ بلکہ یُوں سمجھیئے۔ جان دیتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ اپنے اُستاد سے سفارش کرو کہ فلاں پرچے میں اُن کے نمبروں میں کمی کو کسی طرح پورا کر دیں۔ میں نے سوچا ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

چنانچہ کھٹ سے پرتھوی پال سنگھ صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ چائے پلائی اور شانِ نزول دریافت فرمائی۔ حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ تو وہ زیرِلب مسکرائے۔ پوچھنے لگے۔ رلت آپ کے دوست ہیں؟ میں اُن کا مطلب بھانپ گیا۔ کچھ نہ پوچھیئے۔ کیا حال ہوا۔ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ جی وہ میرے دوست نہیں ہیں۔ ایک دوست کے دوست ہیں اور پھر کوئی بہانہ بنا کر جلد ہی روانہ ہو گیا۔ بہرحال اُنہوں نے کام کر دیا۔

پاکستان بننے کے بعد وہ سرحد پار چلے گئے اور مشرقی پنجاب کی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ صحافت کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ پاکستان بننے کے چار سال بعد میں اُن کا جانشین بن گیا تو بہت خوش ہوئے اور خط و کتابت کے ذریعہ سے حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔

اب دیکھیئے اللہ تعالیٰ نے ملاقات کی سبیل کیسے پیدا کی۔ انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ (زیورخ) نے ایشیائی اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس سیلون کے پہاڑی مقام کانڈی میں منعقد کی۔ میں بھی مدعو تھا۔ پہلے کولمبو پہنچا۔ کولمبو سے لبسوں کے ایک قافلے میں سوار ہو کر کانڈی کو جانے والے تھے کہ مجھے اچانک ایک شناسا آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو پرتھوی پال سنگھ کھڑے تھے۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔ اکٹھے بیٹھے۔ سفر کے دوران میں باتیں کرتے رہے اور خدا جانے کس ضمن

میں میں نے ذکر کر دیا کہ غیر ملکی سفر پہ جاؤں تو دو چار نیند آور گولیاں ساتھ رکھتا ہوں تاکہ اگر اجنبی ماحول کی وجہ سے نہ سو سکوں تو کام آ جائیں۔ شاید اُنہوں نے یہ بات پلّے باندھ لی۔ سارے مندوب کانڈی کے کوئینز ہوٹل میں ٹھہرے۔ رات کے ایک بجے اچانک کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں گھبرایا۔ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اس وقت کسے میری ضرورت پڑی ہے۔ دروازہ کھولا تو سامنے پرتھوی پال سنگھ اور اُن کے ایک ساتھی کھڑے تھے۔ فرمانے لگے۔ خورشید مجھے ابھی تک نیند نہیں آئی اور بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ اس لئے ایک گولی دے دو۔ میں نے فوراً حاضر کر دی لیکن تمام رات متفکر رہا۔ صبح اُنہیں خوش و خرم پایا تو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ تین دن تک اُن سے خوب صحبت رہی۔ بھولی بسری یادیں تازہ ہوئیں۔ جی چاہتا تھا۔ یہ محفلیں طول پکڑیں۔ لیکن ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

سید احمد شاہ بخاری "پطرس" والدِ مرحوم کے گہرے دوستوں میں شامل تھے والد کے نام اُن کے چھہتر خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ جو حقیقت میں ادب پارے ہیں۔ اُن میں ظرافت بھی ہے اور درد بھی۔ درد اس لئے، کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی زیڈ اے بخاری سے کسی زمانے میں سخت نالاں تھے۔ پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر تھے۔ کنٹرولر کے عہدے پہ ایک انگریز لائنل فیلڈن فائز تھے زیڈ اے بخاری بھی آل انڈیا ریڈیو میں تھے۔ چھوٹے بھائی نے فیلڈن کے ساتھ مل کر بڑے بھائی کے خلاف سازش کا ایسا چکر چلایا کہ آخرِ کار پطرس کو ریڈیو کی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ اُس دور کے خطوط میں بلا کا درد موجود ہے۔

احمد شاہ بخاری کیمبرج کے فارغ التحصیل تھے۔ ڈویژنل انسپکٹر مدارس

کے عہدے پر رہے ۔ پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادب کے پروفیسر بنے سالہا سال تک تدریس فرماتے رہے ۔ پرنسپل شپ پر بھی پہنچے ۔ چونکہ غیر معمولی طور پر ذہین اور طبّاع تھے ۔ اس لئے حکومتِ پاکستان نے اُنہیں اقوام متحدہ میں اپنا مستقل نمائندہ نامزد کیا ۔ اس دور میں اُنہوں نے اپنی لیاقت اور قابلیّت کا سکّہ ایسا جمایا کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک کے سیاست دان اُن سے متاثر ہوئے ۔

انگریزی ادب میں تخصص حاصل کرنے کے باوجود اُردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا ۔ عنفوانِ شباب میں بعض ڈرامے اُردو میں ترجمہ کئے ۔ کچھ تنقیدی مقالات لکھے جو ادبی رسالوں کی زینت بنے ۔ لیکن اُردو ادب میں اُنہیں شہرت دوام حاصل ہوئی تو "پطرس کے مضامین" کی بدولت ۔ یہ کتاب مزاح نگاری کا عظیم شاہکار تھی اور خوب مقبول ہوئی ۔ اب تک اُس کے جتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ اُس کی مثال کوئی اور ادبی کتاب پیش نہیں کر سکتی ۔

پطرس والد کے دوست تھے ۔ اس رعایت سے مجھے بعض اوقات اُن کی خدمت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ۔ مارچ ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوئے تو جس علاقے میں اُن کی کوٹھی تھی ۔ وہاں ہندوؤں کی غالب اکثریت کی وجہ سے کچھ خطرہ پیدا ہوا ۔ اس لئے وہ تین چار دن کے لئے ہمارے گھر رہے ۔ اُسی زمانے میں معلوم ہوا کہ قائداعظمؒ کے ساتھ اُن کے تعلقات خاصے خوشگوار رہے ۔ اُنہوں نے بتایا ۔ ایک مرتبہ میں نے قائداعظمؒ سے پوچھا آپ کی ورکنگ کمیٹی کا کیا حال ہے ؟ جواب دیا ۔ بہتر ہے ۔ کیونکہ اب بعض ارکان بولتے ہیں ۔ بات یہ تھی کہ قائداعظم ورکنگ کمیٹی سے مشورے چاہتے

تھے۔ لیکن اس کے ارکان جی حضوری پر اکتفا کرتے تھے۔ اور یہ بات قائداعظم کو ناپسند تھی۔ پطرس نے یہ بھی بتایا کہ سردار پٹیل کے بارے میں یہ تاثر زیادہ درست نہیں کہ وہ مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اصل میں وہ محض اقتدار پسند ہے۔ جو اقتدار میں حائل ہو۔ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ سردار پٹیل اس کا مخالف ہے۔

ایک دفعہ میں نے والد سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ احمد شاہ کا ذکر کرتے ہیں تو "بخاری صاحب" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور زیڈ اے بخاری کا ذکر آتا ہے۔ تو محض ذوالفقار کہہ دیتے ہیں۔ آخر وہ بھی تو بخاری ہیں۔ اس پر والد بولے۔ بھئی احمد شاہ "صحیح بخاری" ہیں اس لئے انہیں بخاری صاحب کہتا ہوں۔

جن دنوں پطرس اقوام متحدہ میں اسسٹنٹ سیکرٹری (اطلاعات) تھے۔ مجھے یونیسکو کے زیر اہتمام منعقدہ اساتذہ صحافت کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ والد نے ان کے نام خط میں اس کا تذکرہ کر دیا۔ کانفرنس سے پہلے بخاری صاحب کو پیرس جانے کا اتفاق ہوا تو ابلاغِ عام کے ڈائرکٹر مسٹر تورحبدل کے کان میں کچھ پھونک گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں جس وقت پیرس پہنچا۔ ڈائرکٹر صاحب نے اپنا ایک نمائندہ میرے پاس بھیجا جس نے کانفرنس کے ایک گروپ کی صدارت مجھے پیش کی جو میں نے قبول کر لی۔ کانفرنس شروع ہوئی تو میری غیر معمولی آؤ بھگت ہوئی اور مجھے یہ موقعہ بھی دیا گیا کہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر کے بتاؤں کہ ابلاغِ عام میں تحقیق کے سلسلے میں میرے گروپ نے کیا فیصلے کئے ہیں۔

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ والد مرحوم اور مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے درمیان صلح کرائی۔ تو پطرس نے، انہوں نے دونوں

کو بتائے بغیر ایک ہی وقت پر اپنے گھر مدعو کیا۔ کچھ اور دوست بھی بلا لئے اور وہاں دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو سارے گلے شکوے ختم ہو گئے۔

پطرس بہت بڑے اُستاد تھے۔ اُن میں وہ تمام خصائص موجود تھے جن سے ایک عظیم استاد کی شخصیت عبارت ہوتی ہے۔ گہرا اور مسلسل مطالعہ اُن کی عادت میں داخل تھا۔ تدریس انگریزی ادب کی کرتے تھے لیکن مطالعہ جدید ترین انگریزی ادب کے پہلو بہ پہلو جدید اُردو ادب اور فارسی ادب پر بھی حاوی تھا۔ انگریزی ادب کی تدریس کے دوران میں اُردو اور فارسی ادب کے ساتھ موازنہ بھی کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی ادب کے طلبہ مشرقی ادب سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ طلبہ کے ساتھ فاصلہ بھی قائم رکھتے تھے لیکن اُن سے پیار بھی کرتے تھے۔ جن نوجوانوں کو اُن سے شرفِ تلمّذ حاصل ہوا اور قرب بھی پا سکے وہ تعلیم کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے۔ اُردو ادب سے وابستگی اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں "مجلس" کے نام سے ایک انجمن بنائی جس میں ذہین اور طبّاع طلبہ علمی موضوعات پر مقالات پڑھتے ان مقالات کا ایک مجموعہ شائع ہوا جو میرے پاس اب تک موجود ہے۔ ایک محفل میں صرف ایک مقالے کی پیش کش اور اُس پر گرما گرم بحث کی ریت "مجلس" سے شروع ہوئی اور پھر اس ریت نے اسلامیہ کالج میں رواج پایا جہاں ڈاکٹر تاثیر نے بزمِ فروغِ اُردو کی بنیاد رکھی۔ اور اس بزم کے زیرِ اہتمام بیسیوں مقالے پڑھے گئے اور ان کے تین چار مجموعے شائع ہوئے۔

برّعظیم میں انگریزی زبان میں لکھنے اور بولنے والے تو بہت پیدا ہوئے لیکن ایسے لوگ بہت کم تھے جو اس زبان پر مکمل عبور رکھتے اور وہ بھی اس انداز میں کہ اہلِ زبان بھی عش عش کر اُٹھتے۔ بخاری انھی چند گنے

چُنے لوگوں کی صف میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر شاعر تھے۔ ادیب تھے، نقاد تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محفل آرا تھے۔ لڑنے پر آتے تو ساری حدود پھلانگ جاتے تھے۔ کبھی جیت جاتے تھے۔ کبھی چاروں شانے چت ہو جاتے تھے۔ لیکن مخالفت میں مزاج کی شدّت میں کبھی کمی کے روادار نہیں تھے۔ "نیاز مندانِ لاہور" میں شامل تھے۔ پطرس۔ سالک۔ فیض، حسرت، تبسم سے گاڑھی چھنتی تھی۔ کسی زمانے میں سب نے مل کر "اہل زبان" سے علمی جنگ لڑی۔ پاکستان بننے کے بعد فیضؔ اور حسرتؔ سے ٹھن گئی۔ تاثیرؔ نے روز نامہ "مغربی پاکستان" میں اڈا جمایا۔ فیضؔ اور حسرتؔ کے پاس "امروز" کا قلعہ موجود تھا۔ جب کاغذی گولہ باری سے تعفّن آنے لگا تو سالکؔ نے فریقین میں "سیز فائر" کرا دیا لیکن یہ محض جنگ بندی تھی۔ صُلح کا سمجھوتہ نہ ہونا تھا۔ نہ ہوا۔

ڈاکٹر تاثیر کے سیاسی عقائد میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے۔ پاکستان بننے سے دس سال پہلے وہ امرتسر کے ایم اے او کالج کے پرنسپل تھے اور سوشلزم سے رشتہ جوڑ چکے تھے۔ لیگ کانگرس کی کشمکش کو بے سود جانتے تھے۔ یہی عقائد شاعری میں منعکس ہوئے۔ چنانچہ فرمایا:

ہندو کیا ہیں؟ مسلم کیا ہیں؟ جھوٹی ذاتیں پاتیں ہیں
سب دولت کے الجھاؤ ہیں سب دولت کی باتیں ہیں
مندر، گرجے اونچے اونچے جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں
اور عبادت کرنے والے بھوکے ننگے مرتے ہیں
تعمیریں ہیں خیراتیں ہیں حج اور تیرتھ ہوتے ہیں

یوں دامن سے خون کے دھبّے دولت والے دھوتے ہیں
مذہب کیا ہیں؟ راہگزر ہیں اک منزل کو جاتے ہیں
پنڈت مُلّا آپ بہک کر اوروں کو بہکاتے ہیں
یہ لغو لیفیں یہ تنظیمیں سرمائے کی گھاتیں ہیں
گورے کالے سب اُس کے ہیں جب کے دن اور راتیں ہیں

اُنہی دنوں ترقی پسند ادبی تحریکوں سے وابستگی ہوئی۔ اور وہ ترقی پسند ادب کے بہت بڑے داعی بن گئے۔ تحریک پاکستان کامیابی کی منزل پر آگئی تو ڈاکٹر تاثیر نے اس طرف کا رُخ کیا۔ پاکستان بننے کے بعد "پاکستان ٹائمز" میں ایک سلسلۂ مقالات لکھا جس کا عنوان تھا۔ پاکستان مبارک۔ شیخ عبداللہ کے ساتھ ان کا پُرانا رابطہ تھا کیونکہ سری نگر کے ایک کالج میں پرنسپل رہ چکے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے شیخ عبداللہ کے ساتھ خصوصی گفتگو میں یہ کوشش کی کہ وہ پاکستان کا ساتھ دیں۔ اس معاملے میں اربابِ پاکستان نے بے توجہی سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر تاثیر کی کوشش ناکام رہی اور شیخ عبداللہ ہندوستان کی گود میں جا بیٹھے۔

پاکستان بننے کے بعد لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی اور ترقی پسند ادب کا غُلغلہ بلند ہوا تو ڈاکٹر تاثیر لنگر لنگوٹے کس کر میدان میں داخل ہو گئے اور ترقی پسند ادب کی مخالفت کرنے لگے۔ اُنہوں نے ماضی کی روایت سے انحراف کیوں کیا؟ اس کا نظریاتی پہلو یہ تھا کہ وہ ترقی پسند تحریک کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کو سونپنے کے خلاف تھے۔ لیکن اس کا ایک ذاتی پہلو بھی تھا۔ وہ یہ کہ فیض احمد فیضؔ تدریس کی دنیا میں اُن سے جونیئر تھے لیکن اپنی شاعری کے بل بوتے پر کہیں آگے بڑھ گئے اور "پاکستان ٹائمز" کی

ادارت پر فائز ہو گئے۔ بلکہ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن نے بھی اُنہیں اپنا صدر چُن لیا اور ترقی پسند مصنفین نے بھی اُنہی کی قیادت قبول کر لی۔ یہ صورت ڈاکٹر تاثیر کو پسند نہیں تھی اس لئے وہ دنگل میں مصروف ہو گئے۔ حدُود کو پھلانگ ڈالنا اُن کی روایت بن چکا تھا چنانچہ اُنہوں نے ایسی زیادتیوں کا ارتکاب فرمایا کہ ادیبوں کے بڑے حلقے سے کٹ کر رہ گئے۔

ڈاکٹر تاثیر کی ادبی زندگی کا آغاز اُس وقت ہوا جب پنجاب میں "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کا طوطی بولتا تھا۔ ابتدائی دور میں وہ انہی رسالوں میں چھپے اور انہی کے سہارے مقبول ہوئے۔ لاہور سے ایک اعلیٰ درجے کا ادبی سالنامہ جاری ہوا جس کا نام تھا "کارواں" ایک سال اس کی ادارت ڈاکٹر تاثیر کے سپرد ہوئی۔ وہ بہت لکھتے تھے۔ تنقید میں بھی انہیں بہت درک تھا لیکن کبھی کتاب نہ لکھی اور مجموعۂ کلام "آتش کدہ" مرتّب ہوا تو موت کے بعد۔ اگر تاثیر منظم انداز میں لکھتے تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کرتے تو شاید اُنہیں تاریخِ ادب میں ایک زیادہ ممتاز مقام حاصل ہو جاتا۔

ڈاکٹر تاثیر تنقید، تدریس اور تعلیم کی دنیا میں نمایاں رہے۔ لیکن بنیادی طور پر شاعر تھے۔ غزلیات بھی کہیں۔ لیکن زیادہ نام نظم لکھنے سے پایا۔ بلینک وَرس میں بھی بہت سی چیزیں لکھیں۔ جن کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اُن میں روانی بھی تھی، آہنگ بھی تھا اور شعریت بھی۔ مجھے ان کی نظم "رس بھرے ہونٹ" کسی زمانے میں خاص طور پر پسند تھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

رس بھرے ہونٹ، پھول سے ہلکے
جیسے بلور کی صُراحی میں

بادۂ آتشیں نفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفقِ صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے، سنبھل سنبھل ڈھلکے
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
پاؤں چھلنی نگاہ متزلزل
وقت صحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگِ منزل نما نہ آج نہ کل
دفعتاً دُور۔ دُور۔ آنکھ سے دُور
شفقِ شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک اُٹھے
ایک دھوکا سراب منبعٔ نورُ
رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیرؔ
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
یوں لرزتے ہیں یوں ترستے ہیں

ایک بات اچانک یاد آئی ہے۔ ایک دن ڈاکٹر تاثیر چند احباب کے ساتھ ہمارے ہاں آئے۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ والد

کو اطلاع دی۔ کہنے لگے۔ اُن سے پوچھو۔ کیا پئیں گے۔ لیمونیڈ، سکواش یا شربت۔ میں نے پوچھا۔ تو ڈاکٹر تاثیر نے کہا۔ بھئی اُن سے کہو۔ ہم تو شربتِ وصل پئیں گے۔ میں نے جا کر والد صاحب سے کہہ دیا کہ وہ شربتِ وصل کے آرزومند ہیں۔ اس پر والد ہنس پڑے۔ ڈرائنگ روم میں آئے اور گپ شروع ہو گئی۔

پیر تاج الدین نامور بیرسٹر تھے۔ مشہور ڈرامہ نگار رفیع پیر کے والد ماجد تھے۔ کسی زمانے میں مسلم لیگ کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ اُن سے میرا رشتہ بہت کم رہا۔ مسلم لیگی رہنما ملک برکت علی مرحوم کے ہاں دو ایک بار ملاقات ہوئی لیکن بہت مختصر۔ ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ میں صبح سویرے ملک برکت علی کے ہاں گیا۔ ابھی باتیں شروع ہی ہوئی تھیں کہ پیر صاحب روتے پیٹتے کمرے میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ اُن کا ایک بیٹا انتقال کر گیا ہے۔ میرے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور مدتوں رنجیدہ رہا۔

تاج الدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ نہایت بے باک طبیعت پائی تھی۔ جو جی میں آتی تھی، کہہ ڈالتے تھے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ مُنہ پھٹ تھے اور اصحابِ اقتدار کو تو کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ سُنا ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کا احترام تو بہت کرتے تھے۔ اُن کے نیازمند بھی تھے۔ لیکن اُن کی موجودگی میں بھی اپنی بے باک طبیعت پر قابو نہ پا سکتے تھے۔ اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ دشنام طرازی میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ مقطّع گالیاں دینے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور تقریبات میں بھی بڑی بڑی ثقہ شخصیتوں کو دشنام طرازی کا نشانہ بنا لیتے تھے۔ ایک دفعہ سر سکندر حیات

(وزیر اعلیٰ پنجاب) کو بھی بھری محفل میں گالیوں کا ہدف بنا لیا اور وہ بے چارے کیا کرتے، خاموش رہے۔ صرف اتنا کہا۔ پیر جی غصہ تھوک دو۔

پیر تاج الدین اُس زمانے میں ایک ممتاز بیرسٹر تھے۔ جب مسلمانوں میں ایسے قابل لوگوں کی کمی تھی۔ ایسے میں اگر مزاج میں تلوّن نہ ہوتا اور حدود کو نہ پھلانگتے تو شاید کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاتے لیکن تلوّن کی وجہ سے نہ کسی عُہدے پر پہنچ سکے اور نہ مسلم لیگ میں کوئی نمایاں مقام حاصل کر سکے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی شاعر بھی تھے، مزاح نگار بھی۔ ادیب بھی تھے اور معلّم بھی۔ مدتوں دیال سنگھ کالج میں پروفیسری پر فائز رہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں وہ لاہور کے ایک ادبی دھڑے کے رہنما تھے، مشاعرے کراتے، ادبی محفلیں برپا کرتے۔ ساری عمر ادبی دھڑے بندی میں گزر گئی۔ لیکن تخلیقات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور زبان پر عبور کے سلسلے میں مخالفین بھی اُن کے قائل تھے، حکامِ بالا سے ایک گونہ مناسبت تھی۔ اسی بنا پر انگریزی راج میں انہیں شمس العلماء کا خطاب مل گیا جو بہت بڑا اعزاز کہا جاتا ہے۔

مولانا تاجور مجلاتی صحافت سے مدتوں وابستہ رہے۔ میں بچپن میں بچوں کا رسالہ "پریم" بھی پڑھا کرتا تھا اور اُس وقت سے اُنہیں جانتا ہوں کیونکہ وہ اس رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ میاں بشیر احمد نے "ہمایوں" جاری کیا تو اُنہیں نائب مدیر مقرر کیا۔ اُنہوں نے ایک مرتبہ "تازیانہ" کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا، جو زیادہ دیر نہ چلا لیکن ان کا اصل کارنامہ "ادبی دنیا" کا اجرا تھا۔ جہازی تقطیع۔ اچھی کتابت۔ اچھی طباعت

باتصویر۔ اچھا کاغذ اور اچھے مضامین۔ یہ رسالہ خوب چلا لیکن خدا جانے حالات نے کیسا پلٹا کھایا کہ اُنہوں نے "ادبی دنیا" منصور احمد مرحوم کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ منصور احمد کے انتقال کے بعد اس کی ادارت پر مولانا صلاح الدین احمد اور میراجی فائز ہوئے۔ "ادبی دنیا" بیچ دینے کے بعد مولانا پچھتائے لیکن ہمت والے آدمی تھے۔ اس لئے ایک اور رسالے کا ڈول ڈال دیا۔ اُس کا نام تھا "شاہکار"۔ یہ بھی اُسی ٹھاٹھ سے نکلا جو "ادبی دنیا" سے عبارت تھا۔ دو تین سال نکلتا رہا لیکن تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ کچھ مالی پریشانیاں آن پڑیں اور مولانا نے اسے بھی کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس کے بعد "شاہکار" کافی دیر جاری رہا لیکن مولانا والی بات پیدا نہ ہوسکی۔ آخر سِسک سِسک کر بند ہوگیا۔ ہندوؤں کے ساتھ مولانا کے خصوصی تعلقات تھے۔ بہت سے ہندو ادیب اور شاعر اُن کے شاگرد تھے ہندو مسلم اتحاد اُنہیں مرغوب تھا اور وہ بھی اس حد تک کہ اُنہوں نے ایک بیٹے کا نام محمد پرکاش رکھ دیا۔ جس پر بہت چہ میگوئیاں ہوئیں کیونکہ عام مسلمانوں کو ایک فاضل دیوبند سے ایسی توقع نہیں تھی۔

تاجور نجیب آبادی کسی زمانے میں والدِ مرحوم کے گہرے دوست تھے۔ ادبی گروہ بندی بڑھی تو تعلقات کا سلسلہ ایسا منقطع ہوا کہ سالہا سال تک بات چیت بھی بند رہی۔ پاکستان بننے سے دو تین سال پہلے حکومتِ پنجاب نے "ہمارا پنجاب" کے نام سے ایک شاندار باتصویر ہفت روزہ جاری کیا جس میں "پنچایت" کو بھی مدغم کر دیا۔ جس کا میں مدیر تھا۔ "ہمارا پنجاب" کے چیف ایڈیٹر لاجپت رائے نیّر تھے۔ لٹریری ایڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر میں اور صادق قریشی۔ میں مولانا سے کچھ کھنچا کھنچا رہتا

تھا۔ لیکن مولانا نے اس تسلسل کے ساتھ شفقت کا مظاہرہ کیا کہ سارے حجاب ٹوٹ گئے۔ وہ مجھے ہر روز چائے پلاتے۔ اپنی ڈبیا سے نکال کر پان کھلاتے اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ والد سے دوستی کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے تھے اور کہتے کہ تمہارے گھر میری بہت خاطر و مدارات ہوتی تھی۔ جب لاجپت رائے نیّر کی جگہ باری مرحوم چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے اور میرے عزیز دوست سجاد حیدر بھی تعلقاتِ عامہ کے دفتر میں آگئے تو گہما گہمی بڑھ گئی اور مولانا کی صحبت سے ہم تینوں لطف اندوز ہونے لگے۔ پاکستان بننے پر "ہمارا پنجاب" بند ہوا تو یہ محفلیں بھی ختم ہو گئیں۔ لیکن میں تجدید تعلق کے لئے کبھی کبھار مولانا کے ہاں جاتا رہا۔

ایک دن والد گھر آئے تو کہنے لگے۔ آج مولوی تاجور سے صلح ہو گئی۔ میں نے کہا۔ وہ کیسے؟ بولے۔ وہ کچہری روڈ پر یونیورسٹی کی جانب سے آرہے تھے۔ میں انارکلی کے چوک سے یونیورسٹی کی طرف جا رہا تھا۔ آنکھیں ملیں تاجور کترانے لگے۔ میں نے اپنی چھڑی کی نوک اُن کی توند پر رکھ کر کہا۔ مولوی کہاں جاتے ہو؟ اس پہ وہ بغلگیر ہو گئے اور کہنے لگے۔ ظالم! اتنے سال ضائع کر دیئے؟ چنانچہ ؎

جب گلے سے مل گئے سارے گلے جاتے رہے

سیّد جماعت علی شاہ، علی پور سیّداں والے، بہت بڑے روحانی رہنما تھے۔ ان کے ارادت مند سارے برِعظیم میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور تو اور نظام حیدرآباد دکن بھی اُن کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ میں بزرگوں کی عزت کرتا ہوں اُن سے عقیدت کا دم بھرتا ہوں لیکن اپنے والد کی طرح پیری مریدی کا قائل

نہیں ہوں۔ اس کے باوجود ۱۹۳۵ء میں حضرت جماعت علی شاہ کی خدمت میں چند لمحوں کے لئے حاضر ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ میرے ماموں مشتاق سنیاسی اُن سے بیعت رکھتے تھے اور بہت وفاشعار مُریدوں میں شامل تھے اور وہ بستر مرگ پر تھے اور اُنہی کے حکم پر دعا کے لئے حضرت کی خدمت میں پہنچا۔ اُنھوں نے دعا فرمائی اور پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ کیونکہ ماموں فوت ہو گئے اور اُن کے کُنبے کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ماموں کی بیٹی میری منگیتر تھی۔ چنانچہ چند سال بعد شادی ہو گئی۔ اب ایک حیرت انگیز واقعہ ملاحظہ ہو کہ ۱۹۵۱ء میں مَیں اپنے بال بچوں کے ساتھ مری میں تھا کہ ایک دن دوپہر کے قیلولے کے بعد میری بیوی جاگی، تو اُس نے بتایا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ریڈیو پاکستان سے ایک بجے کے خبرنامے میں اعلان ہوا ہے کہ حضرت صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ سوموار کا دن تھا۔ سات دن بعد سوموار ہی کے دن ہم ایک بجے کا خبرنامہ سُن رہے تھے کہ وہی اعلان ہوا جو ایک ہفتہ پہلے خواب میں سُنا تھا۔ اب اس کی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس پر کوئی ایسا شخص ہی روشنی ڈال سکتا ہے جسے روحانیت میں درک ہو۔

ہماری سیاست میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا تھا جب پنجاب میں ہر خیال کے مسلمانوں نے پیر سید جماعت علی شاہ کی قیادت پر اتفاق کر لیا تھا اور اُنہیں "اُمیرِ ملّت"، چُنا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ ان کی رہنمائی میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اُن دنوں وہ سب کو محبوب تھے اور خود والدِ مرحوم نے اپنی ایک نظم میں ان کی طرف یُوں اشارہ کیا ہے

چلے پیرِ طریقت بھی کفن باندھے ہوئے سر سے
جنودِ کفر سے اسلام کی پیکار ہے ساقی

عبدالرحمان چغتائی فنونِ لطیفہ کی دنیا میں ایک نابغۂ روزگار تھے۔ اس صدی کے پہلے نصف حصّے میں جنوبی ایشیا نے دو ایسے مصوّر پیدا کئے جو عہدِ شباب ہی میں اپنے ہم عصروں سے اتنے آگے نکل گئے کہ اُنہیں مینار رہائے عظمت کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ ایک عبدالرحمٰن چغتائی، دوسرے استاد اللہ بخش۔ ایک نے مغل اور راجپوت مصوری کی روایات کو لیا اور اُن کی تہذیب و تحسین کے بعد اُس آرٹ کو جنم دیا جو چغتائی آرٹ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دوسرے نے آرٹ میں حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری کی روایات کو ایک ایسا جمالیاتی رُوپ دیا کہ وہ بھی آرٹ کی دنیا میں ایک منفرد اسلوب بن گیا۔ اللہ بخش نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو رنگ و آہنگ میں منعکس کیا، ہندو دیومالائی دیوتاؤں کو موضوع بنایا اور آخری دَور میں کسی قدر تجریدی رنگ بھی اختیار کیا۔ میری دونوں سے آشنائی تھی چغتائی سے کم، لیکن غائبانہ طور پر زیادہ۔ اللہ بخش سے زیادہ، کہ وہ میرے پڑوسی بھی ہیں اور میری مصور بیٹی ریحانہ خورشید کے اُستاد ہیں۔

مجھے آرٹ کی تفہیم میں کسی درک کا دعویٰ نہیں۔ نہ میں نے کبھی آرٹ کا نقاد بننے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک وہی تصویر شہپارہ ہے جو نظر کو بھلی لگے اور دل پر اثر کرے۔ چغتائی خطوط اور رنگوں کے امتزاج سے جو تصاویر بناتا رہا میں ان سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ان تصویروں نے مجھے ایک ان دیکھی حسین و جمیل دُنیا سے آشنا کیا اور میرے ذہن اور نظر اور قلب نے اُن سے آسودگی پائی اور یہ سلسلہ بچپن سے چلا آتا ہے۔ میں سکول میں پڑھتا تھا کہ "مُرقع چغتائی" گھر میں آیا۔ اس میں دیوانِ غالب بھی شامل تھا اور غالب کے اشعار پر چغتائی کی تصاویر بھی۔ اس وقت چغتائی کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کی صرف دو سو کاپیاں چھاپی گئیں۔ قیمت ایک سو دس روپے

تھی۔ اُس کے بعد ایک سستا ایڈیشن سترہ روپے میں بکنے لگا۔ اس کتاب کا تعارف آرٹ کے مشہور ناقد جیمز۔ ایس۔ کزنز نے لکھا اور پیش لفظ اقبالؒ نے۔ اس کتاب نے چغتائی کو اُنتیس سال کی عمر میں بین الاقوامی شہرت بخش دی۔ اس کے چار پانچ سال بعد "نقشِ چغتائی" منظرِ عام پر آیا۔ یہ بھی دیوانِ غالب تھا اور اس میں بھی غالبؔ کے اشعار پر ہی تصاویر پیش کی گئیں۔ اس زمانے میں نقادوں کی متفقہ رائے تھی کہ چغتائی آرٹ نے ترقی کی طرف ایک اور قدم آگے بڑھایا ہے۔ اس میں صرف ایک تصویر رنگین تھی۔ باقی سب یک رنگی۔ گویا رنگوں کا سہارا لئے بغیر صرف خطوط اور شیڈز سے کام لیا گیا۔ یہ کتاب مجھے ایک مباحثے میں انعام میں ملی۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد چغتائی آرٹ نے ترقی کی طرف نئے قدم بڑھائے۔ اقبالؒ کے کلام پر تصاویر بنائیں۔ دوسری تصاویر کے مجموعے بھی مرتب کئے اور چھاپے۔ اور جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل چکی تھی۔ چغتائی نے افسانے بھی لکھے۔ فنونِ لطیفہ پر مقالات بھی قلمبند کئے لیکن وہ زندۂ جاوداں ہیں تو اپنے آرٹ کی بدولت۔

چنانچہ مرچنٹ کی آواز اتنی ہی چٹخارے دار اور تیز و طرار تھی جتنی "چنا جور گرم، ملائم مزیدار" کا ہوکا لگانے والوں کی ہوتی تھی۔ اُن کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وجہ تسمیہ ہوتی تو والدِ مرحوم مجھے ضرور بتا دیتے۔ موصوف ایک چلتے پھرتے اشتہار تھے، ہر چیز کے۔ جلسوں کے اعلانات کے، کسی علاقے میں نئی دکان کے۔ مٹھائی کے، جوتوں کے، کپڑے کے۔ سارا دن شہر میں گھومتے تھے۔ ہاتھ میں ایک گھنٹی ہوتی تھی۔ گھنٹی بجاتے۔ لوگوں کو اکٹھا کرتے اور مختلف النوع اعلان کرتے۔ آج باغ بیرون موری دروازہ میں کانگرس کا جلسہ ہوگا۔ ڈاکٹر ستیہ پال۔ ڈاکٹر گوپی چند اور کدار ناتھ سہگل عوام سے خطاب فرمائیں گے جوتوں کے لئے بہترین دکان کرنال شاپ ہے۔ بوٹ لیجئے۔ چپل لیجئے۔ گرگابی لیجئے۔ اعلیٰ چمڑہ۔ بازار میں لاثانی۔ یہ سلسلہ چار پانچ منٹ جاری رہتا اور پھر نئی منزل کو روانہ ہو جاتے۔ کبھی کبھی اخباروں کے دفاتر میں داخل ہو جاتے گھنٹی بجاتے، کاتب، ایڈیٹر، کلرک، چپڑاسی سب متوجہ ہو جاتے۔ خوش ہوتے کہ چنانچہ مرچنٹ سے ملاقات کا موقع ملا۔ موصوف سارے اعلان کرتے اور بیچ میں اُس اخبار کی بھی تعریف کر دیتے۔ اس پر ایڈیٹر صاحب ازراہِ کرم و نوازش دو چار آنے ہدیے کے طور پر پیش کر دیتے۔

چنانچہ مرچنٹ سے مجھے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ایک اخبار نویس یا اخبار گو یاد آگیا۔ اُس کا نام چونی لال تھا۔ کام یہ تھا کہ دہلی میں جا بجا پھر تا خبریں جمع کرتا۔ ایک کاغذ پر لکھ لیتا اور پھر شہر کے دورے کو نکلتا۔ ڈھول بجا کر لوگوں کو اکٹھا کرتا اور تازہ خبریں سنا کر حاضرین سے ایک ایک پیسہ لیتا۔ شام تک اتنے پیسے ہو جاتے تھے کہ کم از کم روٹی کا سامان فراہم ہو جاتا تھا۔ انگریزوں نے

بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا تو اِسے بھی استغاثہ کے گواہ کے طور پر پیش کیا۔

مولانا سید حبیب ادیب نہیں، محض صحافی تھے۔ اس لئے وہ اپنے ہم عصروں کی طرح زیادہ ممتاز نہ ہو سکے۔ اصل میں ان کا زمانہ ایسے صحافیوں کا دور تھا جو بیک وقت ادب، سیاست اور صحافت کے رسیا تھے۔ اور کسی مشن کو لے کر نکلے تھے۔ سید حبیب پہلی عالمی جنگ سے پہلے دارالاشاعت پنجاب میں کام کرتے تھے۔ پھر منشی محمد دین فوق کے "کشمیری میگزین" سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد فوج کے کسی محکمے میں بھرتی ہو کر شنگھائی چلے گئے ۱۹۱۷ء میں کلکتے پہنچے اور ایک اخبار "ترمذی" کے نام سے جاری کیا۔ کلکتے جانے کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں صحافت پر اس لئے زیادہ پابندیاں لگیں ہوئی تھیں کہ یہ صوبہ فوجی بھرتی کا مرکز تھا۔ ایسے میں کلکتے سے اخبار جاری کر کے پنجاب بھیجنا نسبتاً آسان تھا۔ "ترمذی" پر پابندی لگی، تو "رہبر" جاری کیا۔ اُس کا داخلہ بند ہوا تو "نقاش" نکال لیا۔ اور اس پر بھی پابندی لگی تو منفار زیر پر ہو گئے۔ پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی۔ پابندیاں اُٹھیں۔ تو لاہور آئے۔ اور "سیاست" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کر لیا جو اُنیس بیس سال تک جاری رہا۔ تحریک خلافت میں تین سال قید کی سزا ہوئی۔ سر سکندر کی وزارت سے اُلجھے تو "سیاست" بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کی اشاعت ہمیشہ محدود رہی۔ کیونکہ مقابلے میں "زمیندار" اور "انقلاب" جیسے وقیع اخبارات موجود تھے "سیاست" ہمیشہ مالی پریشانیوں کا شکار رہا۔ چنانچہ سید حبیب نے چھوٹے چھوٹے والیانِ ریاست سے رابطہ پیدا کیا۔ ان کے بارے میں بالاقساط مضامین لکھتے اور چار پیسے لے لیتے۔ "سیاست" کے بعد "منشور" نکالا تو اس کا حال بھی پتلا

رہا اور سید حبیب لاہور کے رؤسا سے چندہ لے کر اخبار چلاتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد "غازی" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا لیکن یہ بھی نہ چلا اور اس مایوسی کے عالم میں انتقال فرما گئے۔

چراغ حسن حسرت کو دیکھے بغیر نصف صدی پہلے سالک نے لکھا "ایک شخص چراغ حسن حسرت کاشمیری ہے جو کلکتے کے روزنامے "نئی دنیا" میں کولمبس کے نام سے افکار و حوادث جیسا کالم لکھتا ہے۔ اس کی تحریر کے بانکپن سے معلوم ہوتا ہے کہ میری اور اُس کی رُوحیں اس دنیا میں آنے سے پہلے کہیں ملی ہیں اور ان کے درمیان گہرے تعلقات رہے ہیں۔ اس کا ذوقِ ادب و مزاح یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بہت ہی پیارا اور پیار کرنے والا شخص ہوگا، خشک طبع اور بے مروّت نہ ہوگا۔" دو تین سال بعد ان دونوں میں پیار کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا۔ جو صرف موت کے ہاتھوں ٹوٹ سکا۔

سالک نے "زمیندار" کو چھوڑ کر "انقلاب" جاری کیا تو افکار و حوادث بھی وہیں منتقل ہو گیا۔ ظفر علی خان نے اس کی جگہ "فکاہات" کا کالم شروع کیا۔ تو کلکتے سے چراغ حسن حسرت کو بُلا لیا۔ "زمیندار" اور "انقلاب" میں چشمک تھی جس نے کبھی کبھی معرکہ آرائی اور محاذ بندی کا روپ بھی لیا۔ حسرت اور سالک دونوں ایک ہی میدان کے کھلاڑی تھے، ایسے میں رقابت ہو جاتی تو اچنبھا نہ ہوتا۔ لیکن ان کے درمیان رفاقت بڑھ گئی۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی دونوں سے آشنائی تھی۔ انہوں نے کبھی ایک کو اُکسایا، کبھی دوسرے کو انگیخت دی، بدنیتی سے نہیں، نیک نیتی سے۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں میں کوئی دلچسپ جنگ چھڑے اور ایسی نکتہ آفرینیاں ہوں جن سے گلشنِ صحافت میں رونق پیدا ہو

رامتثالِ امر کی خاطر کبھی کبھی معرکہ آرائی ہوئی لیکن خالص علمی اور ادبی انداز کی۔ آتش بازی ہوئی لیکن بات پھلجھڑیوں سے آگے بڑھی تو ایک آدھ انار چھوٹا لیکن چھچھوندر تک نوبت نہ آئی۔

حسرت نے "احسان" میں مطائبات کا سلسلہ چلایا۔ یہیں سے اُن کا قلمی نام سندباد جہازی قرار پایا اور یہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کے سامنے چراغ حسن حسرت کی شہرت بھی ماند پڑ گئی۔ نئے دستور کی آمد آمد، کانگرس لیگ تنازعہ، یونینسٹ لیگ کش مکش اور ہندو اخباروں کی فرقہ پرستانہ پالیسی نے حسرت کو طنز کے نشتر چلانے کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دیا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے چند پیروڈیاں اور مزاحیہ نظمیں لکھیں جن میں یہ بول تو خوب مشہور ہوئے ؎

تیرے گورے گورے گال اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال اتحاد پارٹی
تیرا یار نریندر ناتھ اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ اتحاد پارٹی

اس زمانے میں بھی یار لوگوں نے سالک و حسرت کو قلمی جنگ میں اُلجھانے کی کوشش فرمائی لیکن دونوں طرح دے جاتے تھے۔

"احسان" کے زمانے ہی میں حسرت نے ایک نیا صحافتی تجربہ کیا۔ "شیرازہ" کے نام سے ایک ہلکا پھلکا مزاحیہ اور علمی و ادبی ہفت روزہ جاری کیا مقصود یہ تھا کہ اُردو صحافت کو ایک ایسی نئی صنف سے آشنا کیا جائے جو مزاحیہ بھی ہو لیکن اس میں وہ پھکڑپن بھی نہ ہو۔ جو ماضی میں پنچ اخبارات کا طرۂ امتیاز رہا تھا۔ اس میں حالاتِ حاضرہ پر طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں تبصرہ ہوتا تھا کچھ مزاحیہ مضامین ہوتے تھے۔ ایک آدھ معلوماتی مضمون بھی آجاتا تھا کلاسیکی شعرا

کے کلام کا انتخاب چھپتا تھا اور مزاحیہ نظمیں بھی ہوتی تھیں۔ اسی ہفت روزہ میں حسرت نے بالاقساط "پنجاب کا جغرافیہ" لکھا جس میں صوبے کی سیاسی زندگی کو جغرافیائی اصطلاحات میں قلمبند کر دیا۔ پنجاب کی سیاست میں دو ڈاکٹر بہت نمایاں تھے۔ ایک ڈاکٹر ستیہ پال، جو صوبہ کانگرس کمیٹی کے صدر تھے، دوسرے ڈاکٹر محمد عالم، جو بنیادی طور پر کانگرسی تھے۔ لیکن ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آنا اور سیاسی قلابازیاں لگانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ حسرت نے ان دونوں کے طویل اور دلچسپ خاکے لکھے جو بعد میں "دو ڈاکٹر" کے نام سے کتابی صورت میں بھی چھپ گئے۔ سالک کے بغیر تو انہیں چند قدم چلنا بھی گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ حکم دیا کہ "شیرازہ" کے لئے کالم لکھو۔ حسرت کا حکم ٹالنا سالک کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چنانچہ کالم لکھنا شروع کر دیا۔ اس کا عنوان افکار و حوادث کا الٹ تھا یعنی حوادث و افکار!

سندباد جہازی سفر پر روانہ ہوئے اور "شہباز" میں لنگر ڈال دیا۔ صورت یوں ہوئی کہ "احسان" کے عملہ ادارت اور مالک اخبار کے درمیان جھگڑا ہوا اور اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا۔ مرتضیٰ احمد خان میکش، حسرت اور دوسرے رفقائے کار نے "شہباز" جاری کر لیا۔ جو "احسان" سے کہیں زیادہ شگفتہ اور پُرشکوہ اخبار تھا۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو ڈاکٹر ستیہ پال کے اخبار "نیشنل کانگرس" میں آ گئے۔ یہاں کالم نویسی کے ساتھ ساتھ اداریہ نگاری کا سلسلہ بھی چلا۔ طبیعت اکتائی تو سرکاری ملازمت کو جی چاہا۔ بی بی سی کے شعبہ مخابرات میں ملازمت تو مل گئی لیکن پاسپورٹ نہ ملا۔ کیونکہ آدمی "خطرناک" تھے۔ والد نے سید احمد شاہ بخاری (پطرس) سے ذکر کیا جو آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر تھے۔ وہ حسرت کو دہلی لے گئے اور انہیں یہ کام سونپا کہ ریڈیائی خبروں کے لئے ایسا ذخیرۂ الفاظ

مرتب کریں جو نہ سنسکرت زدہ ہو نہ فارسی زدہ، نہ عربی زدہ اور عام فہم بھی ہو۔ یہ کام حسرت کی دلچسپی کا تھا۔ کیونکہ وہ "پربت کی بیٹی" لکھ چکے تھے جس کی زبان ایسی تھی کہ اُردو رسم الخط میں لکھو، تو اُردو اور دیوناگری رسم الخط میں لکھو تو ہندی۔ اور طرّہ یہ کہ نہایت میٹھی اور عام فہم زبان تھی۔ چونکہ مزاج سیمابی پایا تھا، اس لئے ایک دن جی میں کیا آئی کہ نوکری سے استعفا داغ دیا اور لاہور آپہنچے۔ یہاں سرکاری ہفت روزہ "پنچایت" کی ادارت سنبھال لی۔ ابھی غالباً دو سال کام کیا تھا کہ "فوجی اخبار" دہلی سے ایک بہتر پیش کش آگئی۔ وہاں پہنچے تو کچھ عرصہ کام کے بعد انہیں کوالالمپور بھیج دیا گیا جو آج کل ملائشیا کا دارالحکومت ہے۔ چونکہ زمانۂ جنگ میں ہزارہا ہندوستانی جوان اور افسر جنوب مشرقی ایشیا میں موجود تھے اس لئے اُن کے لئے رومن رسم الخط میں ایک اُردو روزنامہ "جوان" کے نام سے جاری ہوا۔ اس کی ادارت حسرت کے سپرد ہوئی۔ وہیں اُنہوں نے بعض انگریز صحافیوں سے اخباری میک اپ کے جدید اصول سیکھے "جوان" حسرت کی کمزوری بن گیا۔ چنانچہ جب جدید اُردو صحافت کا ذکر آتا وہ "جوان" کا تذکرہ لے بیٹھتے۔ ایک دن میں نے یہ کہنے کی جسارت کر ڈالی۔ کہ مولانا! آپ تو "جوان" کا تذکرہ ایسے کرتے ہیں جیسے یہ "نیویارک ٹائمز" کا ہم پلّہ اخبار تھا۔ حسرت اس جسارت کی توقع نہیں کرتے تھے اس لئے ایک لمحہ کے لئے اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُنہوں نے ایک کتاب کشمیر پر لکھی۔ اس کا نام "کشمیر" ہی تھا۔ کتاب یقیناً اچھی تھی۔ لیکن حسرت اس کا غیر معمولی تذکرہ کرتے تھے اور جب نوجوان اس کتاب کا ذکر کرتے تھے تو وہ اُنہیں باقاعدہ نقشہ بنا کر محاذ کشمیر کی کیفیت سمجھایا کرتے تھے۔ ہمارے کچھ دوستوں نے ایک شرارت سوچی۔ ایک دن کافی ہاؤس میں ایک دوست

اُن کے پاس جا بیٹھا۔ کشمیر کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ حسرت نے نقشہ بنا کر رہنمائی فرمائی۔ وہ دوست نقشہ لے کر چلا گیا تو دوسرا آ گیا۔ اور یہی عمل دہرایا گیا پھر تیسرا آیا اور یہی کیفیت پیش آئی۔ جب چوتھا آیا اور اس نے بھی اسی موضوع پر گفت گو شروع کر دی تو حسرت کو شرارت کا علم ہو گیا اور وہ بہت جز بز ہوئے

سالک اور حسرت کے طبائع میں ایک فرق نمایاں تھا۔ سالک نئے لکھنے والوں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتے تھے اور غلطی پر ٹوکتے تو ملائمت کے ساتھ۔ حسرت کا مزاج مختلف تھا۔ وہ نئے لکھنے والوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور غلطی پر اس شدت سے لوٹکتے۔ کہ الامان۔ جہالت کا فتویٰ فوراً صادر کر دیتے تھے۔ پھر سالک نوجوانوں کے ساتھ بحث میں رکھ رکھاؤ سے کام لیتے تھے۔ حسرت حدود کو پھلانگ جاتے۔ چنانچہ بعض اوقات بڑی گرما گرمی ہو جاتی تھی۔ نوجوان گستاخی پر اُتر آتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں معافی مانگ لیتے تھے اور حسرت بھی معاف کر دیتے تھے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد حسرت نے ایک اور سرکاری ملازمت کر لی۔ مرکزی حکومت نے "مہاجرین" کے نام سے غالباً ایک ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار جاری کیا۔ حسرت اس کے ایڈیٹر بن گئے اور عبداللہ ملک نائب مدیر اتنے میں میاں افتخار الدین مرحوم نے "امروز" جاری کیا۔ تو اس کی ادارت حسرت کے سپرد کر دی۔ ایوب کرمانی، محمد سرور اور حامد علی خان اُن کے رفقائے کار تھے۔ مزاحیہ کالم کا نام "حرف و حکایت" قرار پایا۔ لیکن حسرت کا کام کالم نویسی تک محدود نہیں تھا۔ وہ پورے اخبار کی ادارت کے نگران تھے۔ انہوں نے "امروز" میں میک اَپ اور خبروں کی تزئین و ترتیب ایک ایسے انداز سے کی جو بالکل نیا تھا۔ اس سلسلے میں "قومی آواز" (لکھنؤ) اور "انقلاب" (لاہور) کچھ نئے تجربے

کر چکے تھے لیکن "امروز" نے ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ حسرت نے شعبۂ مخابرات میں کہنہ مشق اور تجربہ کار صحافیوں کی جگہ چند نوجوان لکھنے والے مقرر کئے اور انہیں اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق تربیت دی۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے بتایا کہ کہنہ مشق صحافی نئے تصورات کو اپنانے سے گریز کرتے ہیں اس لئے میں نے ایک نئی ٹیم تیار کر لی ہے۔ تین سال بعد "امروز" میں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ حسرت اپنے چند ساتھیوں کو لے کر مستعفی ہو گئے اور کچھ دن نیا اخبار جاری کرنے کی ادھیڑ بُن میں رہے اور جب کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو ریڈیو پاکستان میں ڈائریکٹر نیشنل پروگرامز مقرر ہوئے۔ پھر چند مہینے ایک غیر ملکی فرم کے لئے درسی کتب کا ترجمہ کرتے رہے۔ سالک کی رفاقت میں کچھ درسی کتابوں کے سیٹ لکھے۔ پھر لاہور کو لوٹے۔ یہاں دورۂ قلبی نے صحت کو ایسا دھکا دیا کہ پھر مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو سکے۔ "نوائے وقت" میں "باغ و بہار" کے نام سے کچھ دیر مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ اتنے میں اچانک بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا اور حسرت چل بسے۔

حسرت کے ادبی اور صحافتی کردار میں سرِ فہرست سندباد جہازی کا کالم تھا۔ ایک تو طبیعت میں طنز و مزاح کُوٹ کُوٹ کر بھرے تھے۔ دوسرے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ زبان پر ایسا عبور حاصل تھا کہ اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ "فسانۂ آزاد" سے بے حد متاثر تھے۔ ان سب عناصر کے امتزاج کا نتیجہ "مطائبات" تھا۔ مطائبات یا حرف و حکایت یا باغ و بہار میں لطائف کم بیان کرتے تھے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے قارئین کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ بات سے بات نکلتی تھی۔ چٹکلوں کا ایک دریا تھا کہ بہتا چلا جاتا تھا پھر مختلف علوم اور پیشوں کے مبادیات سے آگہی کی وجہ سے اُنہیں یہ فائدہ

تھا۔ کہ ان کی اصطلاحات کا اطلاق حالاتِ حاضرہ پر کرتے ۔مثلاً کبھی سیاسی صورتِ حالات کو طبّی اصطلاحات سے واضح کرتے ۔یا سیاست کو تپنگ بازی سے تشبیہ دے کر تپنگ بازی کی اصطلاحات کا انبار جمع کر دیتے تھے ۔ ڈاکٹر وزیر آغا درست کہتے ہیں کہ "چراغ حسن حسرت کی طنز بے محابا ہے اور ان کے ترکش کے تیر سیاسی زندگی کی ہر ناہمواری کو نشانہ بنا لیتے ہیں ۔سیاسی زندگی کے علاوہ اُنہوں نے معاشرے کے بعض پہلوؤں پر جو مضامین لکھے ہیں وہ ادبی لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں اور اُن میں طنز و مزاح کا خوشگوار امتزاج موجود ہے"۔ حسرت نے ابتدائی دور میں "مطائبات" کا ایک انتخاب چھاپا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ضمیر جعفری نے "حرف و حکایت" کے نام سے اُن کے مزاحیہ کالموں کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کر دیا جس سے وہ لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جنہیں اُس زمانے کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا علم تھا۔

حسرت کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اُردو صحافت کی تکنیک میں ایک نئے دور کا آغاز کیا "امروز" نے اپنے ابتدائی دور میں میک اپ، ترتیب اور مواد کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہم عصر صحافت کے لئے نمونہ بن گیا اور کئی سال تک سب اخباروں پر اس کی چھاپ نظر آتی رہی۔ پھر "شیرازہ"، بھی اُردو کی مزاحیہ صحافت میں ایک طرحِ نو کا بانی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ لالۂ صحرائی بنا رہا۔ آخر کار مُرجھا گیا اور زمین پھر بنجر ہو گئی۔

اور اب ملاحظہ فرمائیے ایک "فلیش بیک" حسرت کی ابتدائی صحافت کا عنفوان شباب ہیں لاہور سے کلکتے گئے۔ اس طویل سفر کی وجہ کیا تھی؟ اس سے کچھ حکائتیں وابستہ تھیں اور کہتے تھے۔ کہ ؎

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

ذہانت گھٹی میں تھی۔ علم و ادب میں دلچسپی موجود تھی۔ اس لئے بہت جلد کلکتے کی علمی دنیا میں دخل پایا۔ نواب نصیر حسین خیال اور مولانا ابو الکلام آزاد جیسی نامور شخصیات کے حلقۂ ارادت میں بیٹھے، روزنامہ "عصر جدید" میں سب ایڈیٹر بنے اور حسنِ کارکردگی کی بدولت پندرہ روز کے اندر اندر ایک ذمہ دار اعلیٰ ادارتی عہدے پر فائز ہو گئے۔ جب یہ اخبار اُن کی سیمابی طبیعت کا متحمل نہ ہوا۔ تو "آفتاب" کے نام سے اپنا ادبی ماہنامہ جاری کر لیا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے قلمی معاونت فرمائی لیکن اس میں روپے کی ضرورت تھی۔ اور حسرت کی حالت یہ تھی کہ

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

آخر رسالہ بند کیا اور مقامی روزنامہ "نئی دنیا" میں کالم نویسی کا آغاز کیا اور یہیں اُن کے جوہر کھلے۔ کالم کا عنوان "نئی دنیا" ہی تھا اور قلمی نام کوملبس تھا۔ دوسرے کالم کا عنوان تھا "کلکتے کی باتیں" اور قلمی نام "کوچہ گرد" تھا۔ موخر الذکر کالم تو مقامی دلچسپی کا تھا۔ لیکن "نئی دنیا" ایک عمومی مزاحیہ کالم تھا جس کا چرچا دور دور تک ہوا۔ کلکتہ میں قیام کے دوران میں مولانا آزاد کے اخبار "پیغام" میں بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۲۷ء میں لاہور آئے "زمیندار" میں "فکاہات" لکھتے رہے۔ چند ماہ بعد حسرت "زمیندار" سے اُکتا گئے۔ یا "زمیندار" اُن سے اُکتا گیا۔ چنانچہ وہاں سے اٹھے اور ایک دلچسپ تجربہ کیا۔ کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر "آزاد" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو لاہور میں "مشرق" کی تقطیع کا پہلا اُردو اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر، مترجم، کلرک، کاتب بلکہ چپڑاسی بھی ملکیت میں شامل تھے۔ خیال تو بُرا نہیں تھا لیکن اخبار پیسے سے چلتا ہے

اور پیسہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ ایک آدھ مہینہ اُدھار سے لشتم پشتم کام چلایا اور جب اُدھار محبت کی قینچی بنا تو اخبار ٹھپ ہوگیا۔ رہا اخبار کا اثاثہ۔ کُرسیاں، میزیں قلم دوات، رجسٹر اور سب سے بڑھ کر ردّی۔ تو جس کا ہاتھ لگا۔ اٹھالے گیا اور بس اللہ کا نام رہ گیا۔ اس پر سالک نے کہا کہ اب ہنگامہ خیزیاں چھوڑیئے، اور گوشۂ سکون تلاش کیجئے چنانچہ شمس العلماء سید ممتاز علی مرحوم اور سیّد امتیاز علی تاج مرحوم کے ادارے "دارالاشاعت پنجاب" میں ملازمت کرلی۔ بچوں کا رسالہ "پھول" اور عورتوں کا مجلّہ "تہذیب النسواں" ایڈٹ کرنے لگے۔ حسرت کو یہ ماحول پسند تھا اس لئے چند سال یہیں گزارے اور اسی دوران میں بچوں کے لئے چند کتابیں لکھیں لیکن روزانہ صحافت کا نشہ ایسا نہیں تھا جسے مجلاتی صحافت کی تلخی اتار دیتی چنانچہ حسرت پھر روزانہ صحافت میں داخل ہونے کے لئے بے قرار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سامان فراہم کردیا۔ مجلسِ احرار نے تحریکِ کشمیر چلائی۔ ہزار ہا رضاکار گرفتار ہونے لگے۔ ایسے میں مجلس نے "احرار" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ اس کی ادارت حسرت کے سپرد ہوئی۔ کچھ مہینے خوب ہنگامہ رہا۔ اتنے میں تحریک ختم ہوگئی اور "احرار" موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ اور حسرت پھر یکّہ و تنہا رہ گئے۔ ایک بار پھر "زمیندار" میں ملازمت کرلی۔ اور تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا اور وہ "زمیندار" سے مستعفی ہوگئے۔ اور "احسان" کے اجرا سے اُن کے لئے کسی قدر مستقل شغل مہیا ہوگیا۔

حسرت کا ادبی کردار بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ "مردمِ دیدہ" میں اُنہوں نے ابوالکلام آزاد، نصیر حسین خیال، آغائے موید الاسلام اور بعض دوسری شخصیات کی جیتی جاگتی قلمی تصویریں پیش کیں "پربت کی بیٹی" میں ہندو دیو مالا کی چند کہانیوں کو نہایت خوبصورت زبان میں قلمبند کیا۔ "زریخ کے خطوط"

میں عصرِ حاضر کے معاشرے پر ملفوف انداز میں طنز کی "سرگزشتِ اسلام" میں تاریخِ اسلام کو سادہ اور سلیس لیکن مستند انداز میں قلمبند کیا۔ "کیلے کا چھلکا" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ "دوڈ اکٹر"، "پنجاب کا جغرافیہ" اور "کشمیر" کا تذکرہ ابھی کر چکا ہوں اور اگر حسرت کی شاعری کا ذکر نہ کیا جائے۔ تو اُن کی کہانی نامکمل رہے گی۔ ان کی بعض غزلیں تو بہت مشہور ہوئیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے

آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں
زُلف کی رخسار کی باتیں کریں

اُنہوں نے اُردو زبان میں ٹپے بھی لکھے۔ ایک ٹپہ یاد ہے۔ آپ بھی سُن لیجئے ۔

راوی کا کنارہ ہے
ہر موج کے ہونٹوں پر افسانہ تمہارا ہے

•

حسرت موہانی کو میں نے دیکھا تو کئی بار، لیکن ہم کلامی کے شرف سے محروم رہا وہ دو تین مرتبہ ہمارے گھر آئے۔ والد سے ملنے! اور میں خاموش تماشائی رہا یا سامع۔ اُنہیں جلسوں میں بھی سُنا ہے لیکن اُن کی ابتدائی انقلابی زندگی اور ریڈیکل سیاست اور شاعری سے آگہی ہوئی۔ تو "اُردوئے معلیٰ" کی فائلوں کی ورق گردانی سے۔ یہ رسالہ اس صدی کے آغاز میں نکلا اور کلاسیکی ادب اور ریڈیکل سیاست کا ترجمان تھا۔ حسرت موہانی سوشلسٹ تھے اور مسلمان تھے۔ سوشلسٹ بھی پکے اور مسلمان بھی پکے۔ آپ چاہیں تو اُنہیں اسلامی سوشلسٹ کہہ سکتے ہیں حسرت اُس زمانے میں سوشلسٹ تھے جب سوشلزم کا نام لینا نہایت خطرناک تھا اور جب جاگیرداروں کا سوشلزم شروع نہیں ہوا تھا حسرت موہانی کی ایک دلفریب ادا

یہ تھی کہ اُنہوں نے ساری عمر اپنے لئے افلاس پسند فرمایا اور درویشی اور قلندری میں زندگی گزار دی۔ اُن کا رہن سہن اور لباس اتنا سادہ اور غریبانہ تھا کہ برِعظیم کی سیاست میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے۔ سٹیشن پر بستر خود اٹھاتے۔ سواریوں کے تانگے میں بیٹھ جاتے۔ ہندوستانی پارلیمینٹ کے رکن تھے لیکن اجلاس کے دِنوں میں کسی مسجد کے حجرے میں قیام فرماتے۔ لاہور آتے تو شیخ مبارک علی کی لوہاری منڈی والی دکان میں قیام فرماتے۔ ایک بار میاں افتخار الدین نے اُنہیں اپنا مہمان بنایا۔ لیکن اُن کی کوٹھی کا ٹھاٹھ باٹھ حسرت موہانی کو راس نہ آیا۔ دوسرے ہی دن صبح سویرے بستر اٹھایا۔ لوہاری منڈی پہنچے۔ شیخ مبارک علی کی دکان بند تھی۔ اس کے تھڑے پر بیٹھ گئے اور لگے انتظار کرنے!

حسرت موہانی بہت سی باتوں میں بے نظیر تھے۔ انہوں نے ایسے وقت پر برطانوی سامراج کے خلاف نعرۂ مستانہ بلند کیا جب مسلمانوں میں دور دور تک سامراج دشمن کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے بال گنگادھر تلک آربندو گھوش اور بپن چندر پال جیسے سرفروشوں کا ساتھ دیا اور برطانوی مصنوعات کے مقاطعے کا نعرہ بلند کیا اور وہ بھی اُن دنوں، جب مسلمانوں کی سیاست پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ مسلمانوں میں سامراج دشمن صحافت کا آغاز حسرت موہانی کے ہاتھوں "اُردوئے معلیٰ" کے روپ میں ہوا۔ حسرت موہانی اس صدی کے پہلے اخبار نویس تھے جو صحافت کی اعلیٰ قدروں کی پاسبانی کی پاداش میں پسِ دیوارِ زنداں جا پہنچے PASSIVE RESISTANCE کا جو اُصول گاندھی جی سے منسوب ہوا، اور جسے مزاحمتِ دفاعی، عدمِ تعاون، عدمِ تشدد، ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کے نام دیئے گئے۔ اس کے اصل موجد حسرت موہانی تھے۔ کیونکہ

اُنہوں نے گاندھی جی سے دس بارہ سال پہلے "اُردوئے معلیٰ" میں لکھا: "سرِدست ہمارے نزدیک انگریزی تشدد کے مقابلے پر مزاحمتِ دفاعی یعنی PASSIVE RESISTANCE کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیئے" [مئی ۱۹۰۷] کانگرس اور مسلم لیگ نے نشو و نما پانے کے بعد درجۂ نوآبادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ حسرت موہانی برعظیم کی پہلی شخصیت تھے جنہوں نے پہلے انڈین نیشنل کانگرس کے اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند کی کہ یہ جماعتیں درجۂ نوآبادیات کی جگہ کامل آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں۔ پہلے اُن کی آواز پر کان نہ دھرے گئے لیکن آخرِ کار کانگرس نے ۱۹۳۰ء میں اور مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء میں کامل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔

برعظیم کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ابتدا سے آخری دم تک ان کا نظریہ یہی رہا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور اُن کا قومی تشخص بحال ہونا چاہیئے۔ ریڈیکل سیاست کے دوران میں بھی وہ ہندوستان کو قوم الاقوام قرار دیتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ مسلمانوں کو اُن کے سیاسی حقوق کی محکم ضمانت دی جائے۔ وہ پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے ۱۹۲۴ء میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں اور ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ عزائم کے پیشِ نظر یہ منصوبہ پیش کیا کہ برعظیم میں مسلم اکثریت کے علاقوں کی الگ ریاستیں قائم ہوں بلکہ ہندو انڈیا کے اندر بھی جہاں کسی چھوٹے سے علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں ایک خود مختار ریاست قائم کر دی جائے اور اس کے بعد ہندو اور مسلمان ریاستیں ایک فیڈریشن میں منسلک ہو جائیں۔ یہی وہ منصوبہ تھا جس کو بنیاد بنا کر لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۵ء میں برعظیم کی تقسیم کے سلسلے میں اپنا وہ

منصوبہ پیش کیا جو، ۱۹۴۰ء میں عمل میں لایا گیا۔ حسرت موہانی مدّتوں مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ جب ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ جناح لیگ اور شفیع لیگ میں بٹ گئی تو حسرت نے شفیع لیگ کا دامن پکڑا جس کے صدر سر محمد شفیع تھے اور سیکرٹری ڈاکٹر اقبال۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شفیع لیگ جُداگانہ انتخاب کے اصول پر کسی مصالحت کی روادار نہیں تھی۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی دھڑلے کے ساتھ تائید کی اور جب پاکستان بن گیا تو جہاں ہندوستان کے بہت سے مسلمان رہنماؤں نے پاکستان کو وطن بنا لیا حسرت موہانی ہندوستان ہی میں رہے۔ وہاں کے مسلمانوں کے دُکھ اور سُکھ میں شریک رہے اور وہیں جان دے دی۔ حسرت موہانی نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ کوئی املاک نہ بنائی۔ اس لحاظ سے بھی وہ بے نظیر سیاست دان تھے!

حسرت بہت بڑے غزل گو شاعر تھے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ جیل کی کال کوٹھڑی میں چکی پیستے پیستے کس ٹھاٹھ کی غزل کہہ گئے:

لایا ہے دل پر کتنی خرابی
اے یار تیرا حُسنِ شرابی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی
عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر
نُورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت اُس کی وہ نیم خوابی
بزمِ طرب ہے وہ بزم، کیوں ہو

ہم غمزدوں کو واں باریابی
اس نازنیں نے باوصفِ عصمت
کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوق اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی، حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قیدِ غم پر قربان حسرتؔ
عالی جنابی، گردوں رکابی

خواجہ حسن نظامی کی ذاتِ گرامی میں بہت سی خصوصیات مرتکز تھیں۔ تصوف ادب، ظرافت، طنز، پروپیگنڈہ، سیاست اور صحافت۔ وہ صاحب طرز نثر نگار تھے۔ زبان میں سادگی، رس اور گھلاوٹ۔ اندازِ بیان میں غضب کی بے ساختگی بات سے بات نکالنے میں ملکۂ خاص، ہلکے پھلکے انداز میں بھاری بھرکم حقائق کا بیان۔ چھوٹے چھوٹے موضوعات پر اظہارِ خیال میں نوبہ نو نکتہ آفرینی۔ ابلاغ میں اس درجہ کمال، کہ اُن کی بات سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی تعلیم کی ضرورت نہیں تھی۔ کہتے ہیں اُردو ادب میں انشائیہ نگاری کی صنف چند سال پہلے شروع ہوئی لیکن حسن نظامی نے جو بے شمار کتابیں لکھ ڈالیں۔ اُنہیں پڑھیئے گا تو یہ محسوس ہوگا کہ اس صنف کے اصل بانی وہی تھے۔ غالبؔ نے خطوط میں ایک نئی شگفتہ اور ہلکی پھلکی نثر کی بنیاد رکھی۔ سر سید احمد خان نے سادہ نثر میں قوم کی رہنمائی

سرانجام دی۔ حسن نظامی میں دونوں کی خوبیاں جمع تھیں۔ عبدالعزیز "فلک پیما" نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی نگارشات کی دلچسپی اور روانی سے انکار نہیں لیکن حسن نظامی کی بات ہی اور تھی۔ اُن کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی روزنامچہ باقاعدگی سے لکھتے اور چھاپ دیتے تھے۔ جو واقعہ پیش آتا اُسے قلمبند کر دیتے تھے اور اس طرح قاری کو احساس ہوتا تھا جیسے وہ حسن نظامی کی صحبت سے لُطف اندوز ہو رہا ہے۔ طُرّہ یہ کہ اپنی کمزوریاں بھی بے نقاب کر دیتے تھے روزنامچے سے دو اقتباس آپ بھی سُن لیجئے۔ تانگے پر سوار اپنے ہم سفر غزالی سے کہتے ہیں: "سنو بھائی غزالی! مجھ سے تو یہ تانگے والا اچھا ہے جو اپنے فرض کا ہر پہلو سمجھتا ہے اور احتیاط سے عمل میں لاتا ہے۔ تو کیا میں بھی اُن لوگوں کو، جو میری رہنمائی کے تانگے میں سوار ہیں، اس احتیاط، اس خوف اور اس ذمہ داری کے ساتھ راہِ راست پر لے جاتا ہوں؟ نہیں۔ اے نرگسیں چشم والے میں اس تانگے والے سے بھی ادنیٰ ہوں۔ میں بہت غافل ہوں۔ میں بہت بھولا ہوا ہوں۔ تانگے کے پہیوں کی طرح میری زندگی کو رات دن کی گردش گھما رہی ہے۔ مگر پہیے منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور شب و روز کی گردش مجھ کو منزل تک پہنچنے نہیں دیتی۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "ایک دن ایک ہندو طوائف، جو نعت گانے میں مشہور ہے، میرے پاس بیٹھی تھی کہ ایک بڑے دہلوی غیر مقلد مولانا صاحب تشریف لے آئے اور طوائف کو دیکھ کر اُنہوں نے بہت زور سے لاحول پڑھی۔ مولانا کی لاحول سُن کر طوائف کو اپنے گناہ کا احساس ہوا اور وہ رونے لگی۔ میری اس کے رونے سے وجد کی سی حالت ہو گئی اور میں نے اس سے کہا۔ اری سُن، سُن۔ میرا اور تیرا تو ایک ہی حال ہے۔ تو بھی لوگوں کو لوٹنے

کے لئے بناوٹی کپڑے اور زیور پہن کر فریب کی شکل بناتی ہے اور میں بھی پرہیزگار مشہور ہونے کے لئے ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھاتا ہوں اور لمبا کرتا پہنتا ہوں۔ تو بھی محفل میں ناچتی ہے اور میں بھی قوالی میں رقص کرتا ہوں۔ مگر تو روتی ہے کیونکہ تجھ کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے اور میری آنکھ میں آنسو نہیں آتا۔ کہ میں اپنی ریاکاری سے غافل ہوں۔ پھر میں نے اس طوائف سے کہا۔ کھڑی ہو اور مولانا سے مصافحہ کر۔ طوائف کھڑی ہوئی اور اس نے مولانا سے مصافحہ کرنا چاہا۔ مولانا نے ہاتھ کھینچ لیا اور مصافحہ کرنے سے انکار کیا۔ میں نے طوائف سے کہا۔ تو بڑی بدتمیز ہے۔ مولانا محرم کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ریشمی دوپٹے میں اپنے ہاتھ کو لپیٹ لے اور پھر مصافحہ کر۔ اس بے چاری نے ایسا ہی کیا۔ اور ریشمی دوپٹے میں لپٹا ہوا ہاتھ اُس نے اُن کی طرف بڑھایا تو مولانا نے للچائی ہوئی بے تابانہ آنکھوں سے اس کو دیکھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا ریشمی ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کر لیا۔ جب یہ مصافحہ ہو چکا۔ طوائف اپنی جگہ بیٹھ گئی تو میں نے دیکھا تمام مجلس پر سکوت کا سناٹا طاری ہے۔"

خواجہ گیسو دراز کے نزدیک گیسوئے صحافت بھی منت پذیر شانہ تھے چنانچہ اُنہوں نے ایک آدھ نہیں، کئی اخبار اور رسالے نکالے۔ سب شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے لیکن ایک زندہ رہا۔ اور وہ تھا "منادی" یہ ہفت روزہ تنہا نگار صحافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس صنف میں گاندھی جی نے "ہری جن" نکالا لیکن وہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے "سچ" جاری کیا جس نے پہلے "صدق" کا روپ لیا۔ پھر "صدقِ جدید" کا۔ لیکن حسن نظامی کا "منادی" مسلسل نکلتا رہا۔ کبھی بڑی تقطیع پر۔ کبھی کتابی تقطیع پر۔ ایک بار مخالفوں سے معرکہ ہوا۔ جواب میں کسی نے "سنادی" نکالا۔ حسن نظامی نے مقابلے میں "اڑادی"

جاری کر دیا۔ جھگڑا ختم ہوا۔ تو نہ "سنادی" باقی رہا۔ نہ "اُڑادی" اور "منادی" بدستور زندہ رہا۔ اس پرچے میں ان کا روزنامچہ چھپتا تھا۔ "منادی" بچپن سے شباب تک میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ اور اتنا پسند تھا کہ میں نے اس کے ابتدائی شمارے بھی پڑھ ڈالے۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں والدِ مرحوم مجھے دہلی لے گئے تو خواجہ حسن نظامی سے ملایا اور یوں میں اُن کی من موہنی شخصیت سے روبرو متعارف ہو گیا، افسوس تقسیم کے بعد "منادی" سے میرا رابطہ عملاً کٹ گیا۔

خواجہ حسن نظامی بہت بڑے پروپیگنڈسٹ تھے۔ زندگی بھر میں کوئی ایک تحریک شروع کی ہو تو اس کا تذکرہ کروں۔ ہر سال دو سال بعد کوئی نیا شوشہ چھوڑتے۔ اخبار نکالتے۔ پوسٹر تیار کرتے۔ بڑی بڑی شخصیتوں سے ملتے۔ مُریدوں سے اپیل کرتے۔ کچھ دیر بہت غلغلہ رہتا اور اس کے بعد یہ شور اشوری بے دلی میں بدل جاتی اور پھر کوئی نئی تحریک شروع ہو جاتی۔ ان کے مریدانِ باصفا برعظیم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن دنوں برما بھی ہندوستان کا جزو تھا۔ چنانچہ اُن کا پیغام رنگون اور مانڈلے سے لے کر پشاور تک پہنچ جاتا۔ ان کی راہ و رسم عوام کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے رؤسا اور رہنماؤں سے قائم تھی جس سے چاہتے مل لیتے اور وہ بھی اپنے احترام کو برقرار رکھتے ہوئے۔

مسلمان ہونے، اسلامی تحریکوں میں حصہ لینے اور درگاہ نظام الدین اولیائؒ کے سجادہ نشین ہونے کے باوجود غیر مسلموں سے بھی ان کا گہرا رابطہ تھا۔ چنانچہ اُن کے حلقۂ ارادت میں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ سچ پوچھیے۔ تو وہ ایک "کاسمو پالی ٹن" شخصیت تھے اور اُنہیں ہر کوئی پسند کرتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دہلی میں جو کیفیت پیش آئی۔ اس سے وہ بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے لئے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ جب طوفان تھم گیا تو پھر دہلی واپس آ گئے۔

اور اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ اللہ کو پیارے ہوئے تو بیٹے نے گدی سنبھالی۔ سنا ہے "منادی" جاری ہے اور اب بیٹا بھی روز نامچہ لکھتا ہے۔

حفیظ ہوشیارپوری کا نام سامنے آتا ہے تو ان بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جب طالب علمی کے زمانے میں مَیں اور میرے احباب اُن کی محفل میں بیٹھتے اور تکلّف کی ساری حدود کو پھلانگ کر ہر قسم کی لغو باتیں کر لیتے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب وہ "پھول" اور "تہذیب النسواں" کے مدیر تھے۔ یا جب "ہمایوں" کی نائب ادارت پر فائز تھے۔ ہماری محفلیں عرب ہوٹل اور کافی ہاؤس میں جمتی تھیں اور اُن کی بعض عادات بے تکلّف گفتگو کا موضوع بنتی تھیں۔ اُنہوں نے اُردو تحریک میں بھی حصہ لیا۔ اُس زمانے میں اس تحریک کے رہنما پنجاب میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں" ہوتے تھے۔ اُنہوں نے انجمنِ اُردو پنجاب کی بنیاد رکھی اور حفیظ ہوشیارپوری اس کے سرگرم کارکنوں میں شامل تھے۔

کچھ عرصہ بعد وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر کراچی میں رہے۔ وہیں ریٹائر ہوئے اور کچھ عرصہ بعد ۱۹۷۳ء کے اوائل میں انتقال کر گئے۔ اس دوران میں قدرتی طور پر ملاقاتوں میں بہت کمی ہو گئی۔ لیکن جب ملتے، وہی پرانی بے تکلفی اور بے حجابی عود کر آتی۔ حفیظ ہوشیارپوری اعلیٰ درجے کے غزل گو شاعر تھے لیکن اُنہیں کسی انجمن ستائش باہمی کی محکم رُکنیت نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے ان کے فن کی وہ قدر نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ یہاں تک کہ وفات پائی۔ تو اخبار نویس حضرات نے اُنہیں چند سطروں میں چلتا کیا اور وہ بھی بے خبری پر مبنی سطور میں

اور احباب کو یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ اُن کی ایک آدھ برسی ہی منا لیں بہرحال اُن کے کلام میں جان تھی۔ اور کبھی نہ کبھی کوئی دیوانہ اُٹھے گا اور اس کا مفصّل مطالعہ کر کے حفیظ ہوشیارپوری سے انصاف کرے گا۔

میرے نزدیک حفیظ ہوشیارپوری ایک ہمہ رنگ شخصیت تھے۔ مجلّاتی صحافت سے زندگی کا آغاز کیا۔ ریڈیائی نشریات کے میدان میں داخل ہوئے تو اس میں بڑا نام پایا۔ سخن فہم اور سخن ور تو پہلے ہی تھے۔ فنِ موسیقی کی باریکیوں سے بھی آگہی حاصل کی۔ ڈرامے کے فن میں درک حاصل کیا۔ لیکن موسیقار بننے یا ڈرامہ نگار بننے کے لئے نہیں بلکہ طربیہ فیچر اور ڈرامے پروڈیوس کرنے کی خاطر۔ براڈکاسٹنگ کی دنیا میں جو شخصیات نمایاں ہوئیں، حفیظ اُن کی صف میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی غزل گوئی تو ایک مسلّمہ امر ہے۔ لیکن ایک بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کے تاریخ نگار بھی تھے۔ یعنی کسی کی وفات پر مرثیہ یا قطعہ لکھتے تو آخری مصرعے کے تاریخی اعداد تاریخِ وفات کے مطابق ہوتے۔ اور یہ مصرعہ اس شخصیت کے کردار کے کسی اہم ترین نقش کی خوب ترجمانی کرتا۔ ویسے تاریخ نگاری کا اصل جوہر ان کے بھائی راحیل ہوشیارپوری میں موجود تھا۔ جنہوں نے اس میں تخصص حاصل کر رکھا تھا۔ حفیظ نے اس کی تربیت بھائی ہی سے پائی تھی۔

حمید احمد خاں کی دیو قامت علمی شخصیت ۲۲، مارچ ۷۴ء کو موت سے ہمکنار ہو گئی۔ اُن کی زندگی مسلسل ریاض اور جہاد سے عبارت تھی۔ ایک نتھری سُتھری پاکیزہ زندگی، بے داغ بلکہ چمکتا دمکتا اور جگمگاتا کردار، ہزارہا شاگردوں کے لئے روشنی کا مینار، علم کی نت نئی راہوں کی دریافت میں عشق و جنون کے جملہ

لوازم کا مظہر، خلوص اور دیانت اور وفا کا پتلا، یہی وہ خوبیاں ہیں جو استاذی گرامی قدر پروفیسر حمید احمد خان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی

میرے نزدیک حمید احمد خان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کے قول اور فعل میں کبھی تضاد نہ اُبھرا۔ علمی، ادبی اور تعلیمی مسائل پر اُن کی آرا نہایت جچی تلی ہوتی تھیں۔ وہ اصول کے معاملے میں کسی مصالحت اور کسی مصلحت بینی کے قائل نہیں تھے۔ اُس کی خاطر اُنھوں نے بہت نقصان اٹھایا بعض افراد کے سب وشتم کے شکار ہوئے۔ عافیت کوش احباب نے رائے میں لچک کے مشورے دیئے لیکن وہ ہمیشہ اپنے مسلک اور موقف پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ لاریب، آج کے معاشرے میں ایسی شخصیات چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہیں پائیں گے۔

حمید احمد خان ایک مثالی استاد تھے۔ میں اسلامیہ کالج میں ان کا شاگرد تھا۔ اور سچ پوچھیئے تو اُنتالیس سال تک شرفِ تلمذّ سے فیض یاب ہوتا رہا اور خوبیٔ تقدیر ملاحظہ ہو کہ اُن کی جان لیوا بے ہوشی سے صرف دو گھنٹے پہلے ٹیلیفون پر اُن سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر لیا۔ انہیں اپنے ہزار ہا شاگردوں سے پیار تھا اور شاگرد بھی ان پر جان دیتے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسلامیہ کالج سے وابستہ رہے، پہلے استاد کی حیثیت سے، پھر پرنسپل کی حیثیت سے۔ اُنھوں نے طلبہ پر شفقت کی دولت نچھاور کی۔ بہت سے طلبہ کو مالی امداد دی۔ جسے سردیوں میں ناکافی لباس میں دیکھا، اُسے چپ چاپ اس قابل کر دیا کہ مناسب لباس پہن سکے۔ طلبہ کی شکایت پر کان دھرتے تھے۔ ازالہ کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو اس دانش گاہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہفتے میں تین دن دو دو گھنٹے صرف طلبہ کے لئے مخصوص کر دیئے۔ انتظامیہ یا

غیر عادل اساتذہ کے خلاف شکایات توجہ سے سنتے رہے اور اُن پر فوری اور موثر کارروائی کرتے رہے۔ لیکن وہ ایک چیز ناپسند کرتے تھے اور وہ تھی، طلبہ میں ٹریڈ یونین اِزم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ درس گاہوں میں نظم و ضبط کے سلسلے میں "خاندانی تصور" کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر درس گاہ ایک خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ طلبہ اور اساتذہ اس خاندان کے افراد ہیں۔ درس گاہ کے سربراہ کا فرض ہے کہ تمام افراد کے حقوق کا خیال رکھے اور سب سے پیار کرے۔ بچّے ضد کر سکتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ان کی ضد مانی بھی جا سکتی ہے لیکن جس طرح ایک خاندان میں ہڑتال نہیں ہوتی۔ اسی طرح درس گاہ میں بھی ہڑتال ایک غلط حربہ ہے اور نہ درس گاہ میں اجتماعی سودے بازی کا سوال پیدا ہوتا ہے

دورِ ایوبی کے آخری مرحلے میں بحالی جمہوریت کی تحریک اٹھی تو طلبہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ سارے پاکستان میں طلبہ ہڑتالیں کرنے لگے پنجاب یونیورسٹی متاثر ہوئی تو حمید احمد خان نے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنا چاہا۔ وہ اس میں ناکام رہے۔ اس لئے کہ ہڑتال کا سبب یہ نہیں تھا کہ طلبہ کو وائس چانسلر کے ساتھ کوئی کد تھی یا اُن کے کوئی ایسے مطالبات تھے جو وائس چانسلر کے بس میں تھے اور پورے نہ ہو سکے۔ ہڑتال کا واحد سبب یہ تھا کہ طلبہ سیاسی نظام کو بدلنے کے عوامی مطالبے میں شریک تھے۔ نوکر شاہی کے بنجر دماغ نے یہ سوچا کہ حمید احمد خان کو برطرف کر دیا جائے تو طلبہ کی توجہ اصل مطلب سے ہٹ جائے گی اور ایجی ٹیشن ختم ہو جائے گی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ برطرفی کس بنا پر ہو؟ چنانچہ بڑے بڑے افسروں نے طلبہ کے رہنماؤں کو بلا کر کہا کہ وہ وائس چانسلر کی برطرفی کا مطالبہ کریں۔ کچھ مانے اور کچھ نہ مانے۔ لیکن دوسرے دن صوبائی حکومت کی تعلقاتِ عامہ کی مشینری حرکت میں آئی اور اُس

نے بڑے اہتمام کے ساتھ برطرفی کے مطالبے کی خبر اخبارات میں چھپوائی۔ طلبہ کے بعض گروہوں نے تردید کرنی چاہی لیکن تردید نہ چھاپی گئی اور ان خبروں کی آڑ لے کر چانسلر نے حمید احمد خان سے جبراً استعفےٰ لے لیا۔ طرہ یہ کہ اُن کے خلاف انکوائری کا بازار بھی گرم کیا گیا۔ لیکن کوئی بے قاعدگی، کوئی بدعنوانی ہوتی تو سامنے آتی۔ چنانچہ انکوائری ٹھپ ہو گئی۔ رہی نوکر شاہی کے بنجر دماغوں کی یہ سوچ کہ حمید احمد خان کے استعفے کے بعد ایجی ٹیشن ختم ہو جائے گی۔ تو اس میں عبرتناک نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ توڑ پھوڑ اور ہڑتالوں کا سلسلہ اس طرح دراز ہوا کہ پھر پیچھا نہ چھڑایا جا سکا۔

حمید احمد خان درس گاہوں میں اخلاقی قدروں کے بہت بڑے نگہبان تھے۔ ایک دفعہ مجھے صبح سویرے بلاوا آیا۔ میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے آج میں کیمپس میں آیا تو ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے شوخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لپ سٹک لگا رکھی تھی اور بال کھُلے چھوڑ رکھے تھے۔ میں نے پوچھا تم کس شعبے کی طالبہ ہو۔ کہنے لگی شعبہ صحافت کی۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا آپ طلبہ اور طالبات کو ایسی تربیت دیتے ہیں؟ میں پریشان ہوا اور اُن سے کہا کہ آئندہ سے ایسا نہیں ہوگا۔ شعبہ میں جا کر تین لڑکیوں کو بُلایا جو فیشن کی زیادہ قائل تھیں۔ اگلے دن تینوں کی اصلاح ہو گئی۔ لڑکیاں کیوں مان گئیں اس لئے کہ یونیورسٹی میں اخلاقی قدروں کے بارے میں نظم و ضبط کا ایک معیار قائم تھا۔ ان کے جانشین کے عہد میمنت لزوم میں طالبات نے نیا رنگ لے لیا اور حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ایک لڑکی کو عُریاں کُن چولی پہننے سے روکا تو ایک ہنگامہ ہو گیا اور نئے وائس چانسلر نے مجھے مجبور کیا کہ جرمانے کا حکم واپس لے لوں۔ اب طالبات کے لباس پر کوئی پابندی نہیں اس لئے یونیورسٹیاں

فیشن پریڈ کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

حمید احمد خان مجھ سے بہت پیار کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ اس ناراضگی میں بھی پیار مضمر ہوتا تھا۔ جن دنوں شعبۂ صحافت میں ایک شخص کی موجودگی سب کے لئے عذاب کا باعث بنی ہوئی تھی تو بعض طلبہ کے خلاف اُس کی ایک حرکت پر احتجاج کرتے ہوئے میں نے حمید احمد خان صاحب کو فون پر کہا کہ میں اپنے شاگردوں کے کیریر کی بربادی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں اس پر وہ سخت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے۔ خورشید صاحب! آپ مجھے سُنا رہے ہیں کہ شاگردوں کے کیریر کی بربادی برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا میں برداشت کر سکتا ہوں۔ میری تو ساری زندگی شاگردوں کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔ رہی استعفے کی بات۔ تو اگر آپ نے یہ بات ایک پروفیسر کی حیثیت سے ایک وائس چانسلر سے کہی ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ مستعفی ہو جایئے اور اگر خورشید کی حیثیت سے حمید احمد خان کو کہی ہے تو میں کہوں گا کہ میرے اور آپ کے تیس سال پرانے تعلقات ہیں۔ ایسے میں یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی۔ اور اس کے بعد انہوں نے ٹیلی فون کھٹ سے بند کر دیا۔

اُسی شام چودھری نذیر احمد خان کے ہاں ایک مجلسی تقریب تھی۔ میں وہاں قدرے تاخیر سے پہنچا۔ لان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خان صاحب تیس فٹ دور اپنی نشست سے اُٹھ کر میری طرف بڑھ رہے ہیں اُنہوں نے نہایت تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور اپنے پاس بٹھایا اور بڑے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ چائے کا وقت آگیا تو میرے بازو میں بازو ڈال کر اِدھر اُدھر گھماتے رہے اور اپنے ایسے دوستوں سے متعارف کراتے رہے

جو مجھے نہیں جانتے تھے۔ اُس شام اُنھوں نے محبت کا جو مظاہرہ کیا، اس کی یاد میرے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہو گی۔

حمید احمد خان انگریزی ادب کے اُستاد تھے لیکن اُردو زبان کو فروغ دینے میں اُنھوں نے پوری عمر صرف کر دی۔ بی۔ اے اور بی۔ ایس سی میں اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی میں اساتذہ کو اُردو میں لیکچر دینے کا حق حاصل ہوا تو انہی کی بدولت۔ ایم۔ اے اور ایم ایس سی میں طلبہ کو امتحانات کے پرچے اُردو میں حل کرنے کا حق ملا تو انہی کی کوشش سے۔ اگر حکمران طبقہ مداخلت نہ کرتا تو اُن کے عہد میں اُردو زبان مکمل طور پر اعلیٰ تعلیم میں تدریس کا ذریعہ بن جاتی۔ اُردو کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے تعلیمی دائرے میں جتنے بڑے قدم اٹھائے گئے اُن کا سہرا حمید احمد خان ہی کے سر ہے۔ انہی کے زمانے میں یونیورسٹی کی انتظامیہ میں فائلوں پر اُردو میں نوٹ لکھنے کی رسم کا آغاز ہوا۔ ایک بات اور یاد آگئی۔ پہلے یہ دستور تھا کہ جو لوگ نجی طور پر ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُنہیں پہلے علومِ شرقیہ کے امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے اور پھر ڈگری کے لئے صرف انگریزی کا۔ خان صاحب نے ایسا بندوبست کر دیا کہ لوگ تمام غیر پیشہ ورانہ امتحانات پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے پاس کرنے لگے۔ اس سے ان لوگوں پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھُل گئے جو کسی درس گاہ میں داخلہ لینے اور اس کے مالی لوازم پورے کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اُردو زبان سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ زیادہ تر نجی گفت گو بھی اُردو میں کرتے۔ اور بچوں کو بھی ایسی تربیت دے رکھی تھی کہ جب کوئی ٹیلی فون کرتا اور کوئی بچہ رسیور اٹھاتا تو فوراً آواز آتی۔ چھ، پانچ، پانچ، سات سات۔ یہ رسم میں نے اور کسی کے ہاں نہیں دیکھی۔

علمی تحقیق میں حس کُرید اور جذب وجنون کی ضرورت ہوتی ہے وہ حمید احمد خان میں بدرجہ وافر موجود تھے۔ چنانچہ غالبؔ پر تحقیق ہو یا اقبالؔ پر۔ اُنہوں نے معلومات کی جستجو میں انتہا کر دی۔ غالبؔ پر تحقیق تو اس وقت سے جاری تھی۔ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصے کے بعد وہ اس پوزیشن میں تھے کہ تحقیق کے نتائج کو کتابی صورت میں پیش کریں لیکن شاید قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ پنجاب یونیورسٹی ہر سال کسی ممتاز شخصیت سے اقبالؔ پر لیکچر کراتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہ لیکچر پروفیسر حمید احمد خان کو دینے تھے اُنہوں نے مسلسل محنتِ شاقہ سے یہ لیکچر تیار کر لئے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا

حمید احمد خان ایک ہمہ جہتی شخصیت کے مالک تھے۔ ادب کی مختلف اصناف اور علم کی مختلف شاخوں میں انہیں اتنا ادراک حاصل تھا کہ ہر موضوع پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ جس مجلسی تقریب کی صدارت فرماتے۔ ایک مختصر سے صدارتی خطبے میں جو باتیں کہہ دیتے وہ بھاری بھرکم مقالات سے زیادہ وزنی ہوتی تھیں۔ یہ خوبی میں نے صرف دو بزرگوں میں دیکھی ہے۔ ایک سر شیخ عبدالقادر دوسرے مسٹر جسٹس ایس اے رحمٰن۔

حمید نظامی میرے دوست تھے۔ عنفوانِ شباب میں تعلقات شروع ہوئے اور تا دمِ مرگ جاری رہے۔ اس دوران نشیب وفراز بھی آئے۔ چشمکیں بھی ہوئیں۔ ناراضگی نے انقطاعِ تعلق کا رُوپ بھی لیا لیکن پُرانی دوستیاں سخت جان ہوتی ہیں اس لئے محبت پھر عود کر آتی ہے اور تعلقات بحال ہوتے ہیں۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کبھی لڑائی ہوئی ہی نہیں اور حمید نظامی کی زندگی

کے آخری تین سالوں کے دوران میں تو خوب گاڑی چھنتی رہی۔ آج کی نسل حمید نظامی
کو صرف ایک بے لاگ صحافی اور نظریہ پاکستان کے ایک زبردست داعی کی
حیثیت سے جانتی ہے لیکن میرے ذہن میں اس کی زندگی کا پورا نقشہ سلامت
ہے۔ ابتدا سے انتہا تک۔ کالج میں وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھے لیکن عمر میں
غالباً تین چار سال زیادہ۔ وہ ایک ذہین اور طباع اور قابل طالب علم تھے۔
پڑھائی میں اتنے اچھے کہ انعام پر انعام پاتے تھے اور تقریر میں اتنے مشاق،
کہ مناظروں میں بڑے بڑے سینئر طلبا کو ہرا دیتے تھے۔ لیکن کالجی سیاست میں
جمہوریت کے قائل نہیں تھے۔ کالج یونین کے سیکرٹری نامزد ہوتے تو حریفوں
نے بڑی کوشش کی کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر انتخاب لڑیں لیکن وہ
نہ مانے اور اپنے فرائض بدستور ادا کرتے رہے۔ تعلیم ختم ہوئی تو سیکرٹری شپ
پر مجھے فائز کرا گئے۔ لیکن میں اُن کا صحیح جانشین ثابت نہ ہوا کیونکہ میں نے
جمہوریت کے مطالبے کے سامنے سر جھکا دیا اور اس کا خمیازہ بھی بھگت
لیا۔ انہیں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے کالج میگزین "کریسنٹ" میں
مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ پھر مشہور ادبی رسالے "ہمایوں" کا آسرا لیا۔ لی کاک
کے مزاحیہ مضامین اُردو میں منتقل کئے۔ چیخوف اور ٹالسٹائی کے افسانوں
کا ترجمہ کیا۔ صحافت کا بہت شوق تھا۔ ایک صاحب نے "ساربان" کے نام
سے ایک سیاسی ماہ نامہ نکال رکھا تھا۔ حمید نظامی اس کے مدیر معاون بن گئے لیکن
بلا معاوضہ اور محض شوق کی خاطر۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تشکیل اور تنظیم
میں ہم دونوں برابر کے شریک تھے۔ دونوں مسلم لیگی تھے لیکن یہ حقیقت ہے
کہ اچانک لیگ کے حامی نہ بنے۔ کالج کی بالکل ابتدائی زندگی میں دونوں کو
سوشلزم سے دلچسپی تھی۔ میں پنڈت جواہر لال نہرو سے متاثر تھا، وہ جے پرکاش نرائن

اور یوسف مہر علی کی کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے قائل تھے بلکہ ایک دن گاندھی ٹوپی پہن کر کالج میں آ گئے۔ کانگرسی سیاست میں جب ہندو فرقہ پرستی بہت نمایاں ہو گئی تو ہم دونوں کے خیالات میں انقلاب آ گیا اور اسی انقلاب کے بطن سے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جنم لیا۔

اسلامیہ کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد حمید نظامی نے ایف سی کالج میں ایم۔اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ یہ زمانہ سیاست سے قدرے علیحدگی کا تھا اس لئے وہ اجتماعی سرگرمیوں سے کچھ دُور دُور رہے۔ بہر حال مجھے اتنا یاد ہے کہ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا لاہور سیشن ہوا تو وہ میرے ساتھ مندوبین کی صف میں تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر مبشّر حسن کے بڑے بھائی ڈاکٹر شبّر حسن بھی وہیں موجود تھے۔ جن سے حمید نظامی کی گہری دوستی تھی۔ حمید نظامی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اُنہیں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ ڈاکٹر سیتہ پال کے روزنامہ "نیشنل کانگرس" میں محض قوت لایموت کی خاطر نوکری کرنی پڑی لیکن جب اختلاف رائے نے شدید نوعیت اختیار کر لی تو مستعفی ہو گئے اور اس پر مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ "شیرازہ" میں ایک مزاحیہ مضمون بھی لکھ دیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پندرہ روزہ "نوائے وقت" جاری کیا۔ وہ اس کے پورے مالک نہیں تھے۔ چند دوستوں کی معیت میں یہ ننّھا منا اخبار نکالا۔ اس کے کل اخراجات کوئی چالیس پچاس روپے ماہانہ تھے جو احباب اپنی جیب سے دیتے تھے اور ادارت کے فرائض حمید نظامی کے سپرد تھے۔ ابتدائی دور میں یہ اخبار سیاسی کم تھا اور ادبی زیادہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ اُن نوجوانوں کی ترجمانی کرنے لگا جو لیگ کے حامی تو تھے لیکن اسے خطاب یافتگان سے

نجات دلانا چاہتے تھے۔ اسی دوران میں مسلمانوں نے ایک خبر رساں ادارہ اورینٹ پریس آف انڈیا کے نام سے قائم کیا۔ میاں مشتاق احمد گورمانی سے خصوصی رابطہ تھا۔ اُنہی کے مشورے سے حمید نظامی اس کے دفتر لاہور کے مینجنگ ایڈیٹر بن گئے اور اس کے ساتھ ہی "نوائے وقت" کو بھی ہفت روزہ کا رُوپ دے دیا اور اس کی تقطیع روزانہ اخبارات کے برابر ہو گئی اور "نوائے وقت" مسلم لیگ کا غیر سرکاری اور آزاد ترجمان بن گیا۔ اسی دوران میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں ایک دفعہ پھر آئے۔ صدر بنے اور قائداعظم کے ساتھ رابطہ پیدا کیا اور اس کے بعد ایک آدھ مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں دھڑلے دار تقریریں بھی کیں لیکن جب جولائی ۱۹۴۴ء میں حامد محمود کی رفاقت میں "نوائے وقت" کو روزنامہ بنایا تو تقریریں چھوڑ دیں۔ اور صرف صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

"نوائے وقت" بہت ہر دلعزیز اخبار تھا۔ کیونکہ وہ ایسے وقت پر روزنامے کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ جب پنجاب کے باقی مسلمان جرائد پاکستان کی حمایت کے باوجود مسلم لیگ کی صوبائی قیادت کی مکمل حمایت نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے ایک آزاد مسلک اختیار کر رکھا تھا۔ "نوائے وقت" واحد اخبار تھا جو مسلم لیگ کے آفیشل نقطۂ نگاہ کی حرف بہ حرف تائید کرتا تھا۔ لیگ نے وزارتی مشن کی تجاویز قبول کر لیں تو "نوائے وقت" نے اُس کی تائید میں آواز بلند کی۔ لیکن باقی مسلمان اخباروں نے اسے مطالبۂ پاکستان کی نفی سے تعبیر کیا۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات آئے تو "نوائے وقت" نے بڑے دھڑلے کے ساتھ لیگی امیدواروں کے حق میں کام کیا اور وہ پنجاب کا سب سے بڑا عوام پسند مسلمان اخبار بن گیا اور یہ حقیقت ہے کہ "ڈان" اور "نوائے وقت"

اُس زمانے کے محبوب ترین روزنامے تھے۔

پاکستان بنا تو اشاعت کے اعتبار سے "زمیندار" سب سے بڑا اخبار تھا لیکن سیاسی اثر کے اعتبار سے "نوائے وقت" ایک بہت بڑی طاقت کہا جاتا تھا۔ یہ طاقت صحیح استعمال ہوئی یا غلط؟ یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس دور میں حمید نظامی آزادیٔ صحافت کے قائل نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے بعض اخبارات کے خلاف کارروائی کا خیر مقدم کیا۔ اور بعض سیاسی جماعتوں، بالخصوص جماعت اسلامی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا اور پریس مشاورتی کمیٹی میں بھی ان کا کردار چنداں قابلِ رشک نہیں تھا۔ اس طرزِ عمل کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ استحکام پاکستان کی خاطر وہ فکر و خیال کی انار کی کے مخالف تھے اور دوسری یہ، کہ حکمران طبقے سے گہرے تعلق کی بنا پر وہ اقتدار کے نشے میں تھے۔ بہر حال ایک بات واضح ہے کہ پنجاب میں جتنے روزنامے موجود تھے اور بر سبیلِ تذکرہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، وہ سب حمید نظامی اور "نوائے وقت" پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے بلکہ اُنہوں نے ایک متوازی پریس مشاورتی کمیٹی بھی بنا لی جسے روزناموں کی اکثریت کی تائید و حمایت حاصل تھی۔

۱۹۴۹ء میں ممدوٹ وزارت اپنی بدعنوانیوں کی بنا پر برطرف ہو گئی تو حالات بدل گئے اور ان بدلے ہوئے حالات میں حمید نظامی کی پالیسی بھی بدل گئی۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ کسی مؤثر اپوزیشن کی عدم موجودگی میں صحافت کا فریضہ ہے کہ وہ ایک اپوزیشن کی حیثیت سے حکمران طبقے کا کڑا احتساب کرے۔ اس میں حمید نظامی کو طرح طرح کے مصائب بھی جھیلنے پڑے۔ ان میں میاں ممتاز دولتانہ کے ساتھ کشمکش خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے

"نوائے وقت" سے ایک ضمانت طلب ہوئی۔ از روئے قانون اس کی رقم دس دن کے اندر اندر سرکاری خزانے میں جمع کرانی ضروری تھی۔ کسی تکنیکی غلط فہمی کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا اور جب گیارھویں دن ضمانت کی رقم پیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ از روئے قانون ڈیکلریشن ساقط ہو چکا ہے۔ یہاں تک بات رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیونکہ تازہ ڈیکلریشن داخل کیا جا سکتا تھا اور اسی کی منظوری رسمی نوعیت کی حامل تھی لیکن وزارت نے ڈیکلریشن منظور کرنے میں تساہل سے کام لیا بلکہ یہ دھاندلی بھی کی کہ ایک صحافی مظفر احسانی کو اسی نام کا ڈیکلریشن دلا دیا۔ اب ایک طرف "نوائے وقت" کچھ دیر کی جبری بندش کے بعد "جہاد" کے نام سے نکلنے لگا اور دوسری طرف یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں مظفر احسانی "نوائے وقت" نہ جاری کر دیں "جہاد" جس پریس سے چھپتا تھا، اُس پر حکومت نے دباؤ ڈالا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اخبار چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر "نوائے وقت" نے ایک مقامی روزنامے "نوائے پاکستان" کو اپنا لیا۔ آخر بعد از خرابی بسیار "نوائے وقت" اپنی اصل شکل میں نکلنے لگا لیکن اس رگڑے جھگڑے میں بہت خاصا مالی ضیاع ہوا اور دنیا بھر میں پاکستان کی رسوائی ہوئی کیونکہ صحافت سے تعلق رکھنے والے بین الاقوامی مجلسوں میں اس جھگڑے کا تذکرہ ہوتا رہا۔

حمید نظامی ان صحافیوں میں شامل تھے جو محض عوام کی ترجمانی کے نہیں، بلکہ رہنمائی کے بھی قائل تھے چنانچہ بعض اوقات وہ رائے عامہ سے بھڑ بھی گئے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں اُنہوں نے غیر جانب داری کی روش اختیار کی۔ کیونکہ وہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ جب تحریک نے بہت سنگین روپ لے لیا تو اُس وقت

"نوائے وقت" نے صرف اتنا مطالبہ کیا کہ چودھری ظفر اللہ خان وزارت سے ازخود مستعفی ہو جائیں کیونکہ اُنہیں عوام کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ اس دوران میں "نوائے وقت" کی اشاعت میں خاصی کمی ہو گئی لیکن حمید نظامی نے اُصول کا سودا نہ کیا اور اپنی روش پر قائم رہے۔

حمید نظامی میں سیاسی بصیرت کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ جب ۱۹۵۸ء میں سیاست ایک مذاق بن گئی اور کرسیوں کی جنگ نے ایک مضحکہ خیز بلکہ المناک روپ لے لیا اور اس کے نتیجے میں نظم و نسق درہم برہم ہو گیا تو "نوائے وقت" کے اداراتی صفحے پر کئی دن تک اس مضمون کا چوکھٹا درج کرتے رہے کہ اگر یہ صورت جاری رہی تو جمہوری ادارے ختم ہو جائیں گے۔ اور فوجی آمریت مسلط ہو جائے گی۔ سیاست دانوں نے اس پر کان نہ دھرے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ مارشل لا کے دور میں حمید نظامی کے سامنے دو راستے تھے۔ اوّل: مخالفت اور اس کے نتیجے میں بندش۔ دوم: اعتدال پسندانہ پالیسی اور جمہوریت کی بحالی پر زور۔ اُنہوں نے دُوسرا راستہ اختیار کیا اور صدر ایوب کے بیانات سے اُن حصّوں پر زور دینا شروع کیا جن میں جمہوریت کی بحالی کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں حمید نظامی بہت گھٹن محسوس کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی رنگ میں جمہوریت کے حق میں کوئی تحریک چلے۔ انہی دنوں اُنہوں نے مجھ سے چھ اقساط میں مسلم طلبہ کی تحریک کی تاریخ پر ایک مفصل مقالہ لکھوایا جس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو محسوس کرایا جائے کہ وہ بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں اسی انداز کے اور بھی مضامین "نوائے وقت" میں چھپتے رہے۔ بہر حال یہ کام جاری نہ رہ سکا اور اُن پر مرضِ قلب کا ایک زبردست حملہ ہوا اور وہ

اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

یوں تو حمید نظامی مزاح نگار بھی تھے اور اُن کا کالم سر راہے خاصا مقبول تھا لیکن وہ بنیادی طور پر اداریہ نگار تھے اور اس صنف میں اُنہوں نے بہت کمال پیدا کیا۔ اُن سے پہلے کے اداریہ نگار طویل اداریے لکھتے تھے اُنہوں نے مختصر اداریہ نگاری کو رواج دیا۔ پھر اُن کے اداریوں میں جذباتیت کا عنصر کم تھا۔ استدلال غالب تھا۔ اونچے طبقات سے مسلسل رابطے کی وجہ سے اُنہیں جو معلومات حاصل تھیں، اُن کی بنا پر اُن کے اداریے خبریت کے حامل بھی ہوتے تھے۔ وہ صحافت میں سنجیدگی کے قائل تھے لیکن جب صحافت کا رنگ بدلا، فیچر نگاری چلی، زیادہ مستقل عنوانوں کا رواج ہوا، تصویری صحافت کا دور دورہ ہوا تو اخبار کی اشاعت برقرار رکھنے کی خاطر وہ بھی اس سے قدرے متاثر ہوئے لیکن اخبار کا سیاسی رنگ بدستور غالب رہا۔

حمید نظامی کے مزاج میں انا ہمیشہ غالب رہی۔ جوانی میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ممدوٹ وزارت کے دور میں بے پناہ سیاسی اقتدار نے انا کے عنصر کو زیادہ تیز کر دیا لیکن وزارت کی برطرفی کے بعد جب شدید مخالفت کا سامنا ہوا تو انا میں کمی واقع ہو گئی اور وفات سے تین چار سال پہلے تو طبیعت میں ایک ایسا گداز سا پیدا ہو گیا کہ برسوں سے جن لوگوں کے ساتھ تعلقات کٹے ہوئے تھے اُن سے بھی دوستی کا احیا کر لیا اور جب اللہ کو پیارے ہوئے تو اُس وقت دشمنوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

حمید نظامی میں انا کے علاوہ کچھ اور بھی کمزوریاں تھیں۔ مخالفوں کو معاف نہیں کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک میاں محمد شفیع (م۔ش)، مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولوی ابراہیم علی

چشتی کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی لیکن جب ان سے جھگڑا ہوا تو انقطاع نے ایسی شکل لے لی کہ کم و بیش دس سال تک ان میں سے کسی کا نام "نوائے وقت" میں نہ آسکا۔ وہ نظریہ پاکستان کے سلسلے میں کسی مفاہمت کے قائل نہیں تھے۔ یہ ایک اچھی بات تھی لیکن اس میں بھی بعض اوقات تجاوزات ہوتے رہے۔

حمید نظامی کے کردار کا ایک خوبصورت پہلو یہ تھا کہ وہ غریبوں کی امداد اس خاموشی سے کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ بہت سے طلبہ کو کتابیں خرید کر دے دیتے۔ اُن کی مالی امداد بھی کرتے۔ مجھے اس حقیقت کا علم اُس وقت ہوا جب "نوائے وقت" میں کسی غریب طالب علم کی اپیل پر میں نے ایک چھوٹی سی رقم کا چیک نظامی صاحب کو بھیجا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس منظم انداز میں یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اُن کے کردار کا یہ پہلو بھی حسین تھا کہ اپنے اساتذہ اور بڑے اپنے ہم عصروں اور ہم جماعتوں سے ہمدردی میں پیش پیش رہے۔ لیکن یہ تو ایک طویل داستان ہے اور اس کتاب کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں۔

حمید ہاشمی "امروز" کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ سانحہ قاہرہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دہلی کے ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کی زبان اُردو تھی لیکن پنجابی زبان میں اتنا درک حاصل تھا کہ گفتگو کے دوران میں کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پنجابی ان کی مادری زبان نہیں ہے۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے سیکرٹری تھے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ کارکن صحافیوں کی یونین کے سب سے زیادہ سرگرم اور بے لوث رُکن تھے۔ صحافیوں پر جب کوئی بپتا پڑی وہ سینہ سپر ہو گئے اور ایک لڑاکا ٹریڈ یونینسٹ ہونے کے باوجود آجروں سے گفت و شنید

میں شیریں زبانی سے اس حد تک کام لیتے تھے کہ اکثر اوقات جدوجہد کے بغیر ہی مطالبہ منظور ہو جاتا تھا۔ اُن کے کردار کا عظیم ترین پہلو یہ تھا کہ انتہائی ضرورت مند ہونے کے باوجود صحافت کے سوا کسی اور چیز کو ذریعۂ آمدن نہ بنایا۔ نہ الاٹمنٹ کرائی۔ نہ کوئی کاروبار چلایا۔ صحافت ہی اُن کا اُوڑھنا بچھونا تھی۔ فنی اعتبار سے اُنہوں نے اُردو صحافت کو بہت کچھ دیا۔ خبروں کی ترتیب و تزئین میں ایک ایسے نئے انداز کی بنیاد رکھی جس نے ہم عصر اخباروں کو بہت متاثر کیا۔ ان کے بعد میک اپ کے میدان میں اور بھی بہت سی خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں لیکن اوّلیت کا سہرا اُنہی کے سر ہے۔ حمید ہاشمی سے میرے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے۔ انہی کی بدولت میں اس قابل ہوا کہ پاکستان میں صحافتی ٹریڈ یونین ازم کی تاریخ پر انگریزی زبان میں ایک کتابچہ لکھ ڈالا جو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور کے موقع پر تقسیم کیا گیا۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالدؔ بیگم سلمیٰ تصدق کے شوہر تھے اور ڈاکٹر محمد صادق اور رفیق خاور کے بھائی۔ ادب اس خاندان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر خالد نے ۱۹۴۸ء میں "سرودِ نو" چھاپنے کے بعد عملاً شعر گوئی ترک کر دی اور وکالت کے ہو رہے اور بیگم سلمیٰ تصدق نے "قلوپطرہ" کے نام سے ایک خوبصورت ناول لکھنے کے بعد سیاست میں بھرپور حصہ لیا اور جب طبیعت اکتائی تو غیر سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر خالد کی شاعری کا آغاز تک بندی سے ہوا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ وہ اُردو کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے قافیے اور ردیف کی پابندیوں سے نجات پا کر شعرِ آزاد یا بلینک ورس کی بنیاد رکھی۔ اس صدی کے چوتھے عشرے

کے وسط میں وہ اُردو شاعری کی ہئیت میں نئے تجربات کے سلسلے میں بہت نام پا چکے تھے۔ میں نے اسی زمانے میں اُنہیں اسلامیہ کالج لاہور کی ایک ادبی محفل میں دیکھا اور اُن کا کلام سُنا۔ اس زمانے میں لوگ ایسی شاعری پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے بد کتے تھے اور ادیبوں میں یہ خیال عام تھا کہ بلینک وَرس نہیں چلے گا۔ ڈاکٹر خالد کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ اُن کا مجموعۂ کلام بہت دیر کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ اس لئے بلینک وَرس کی ابتدا کا سہرا دوسروں کے سر بندھ چکا ہے۔ بہرحال یہ محققین کا فرض ہے کہ وہ اصل حقیقت کا پتہ چلائیں کیونکہ اُن کا کلام رسائل میں تو آتا رہا تھا۔

بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو زاویہ نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ تنہائی کی وجہ سے شعر گوئی کے لئے بھی خاصا وقت مل گیا۔ جدید شعرائ، مصنفین اور نقادانِ فن سے رابطہ پیدا ہوا۔ ادبی محفلوں میں شرکت سے ذوق نے جلا پائی اور زیادہ تر کلام اس دور میں لکھا گیا۔ وہ اپنی شعری ٹیکنیک کے بارے میں "سرودِ نو" میں رقمطراز ہیں: "یہ فرانسیسی اور انگریزی آزاد شعر اور اس پر انگریزی ناقدانِ فن کی تنقید کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ میں نے خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرْ پر عمل کرتے ہوئے فرانسیسی اور انگریزی آزاد شعر کے صرف اُن پہلوؤں کو اپنایا ہے جو اُردو شاعری کی روایات کے متناقض نہیں اور جو ہمارے فنِ عروض سے بآسانی ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اُردو شاعری کے مروّجہ اوزان و بحور کو استعمال کیا ہے لیکن اُن کے ارکان کی یکسانیت کو ترک کرتے ہوئے اُنہیں شعر کے تحت کر دیا ہے اور شعر کو ان کے استبداد سے آزاد کر دیا ہے۔ اس جدّت کے خلاف عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک نظم میں کوئی مصرع بہت لمبا ہوتا ہے اور کوئی بہت

چھوٹا۔ یہ اعتراض درخورِ اعتنا نہیں۔ کیونکہ شعر کا تعلق کان سے ہوتا ہے نہ کہ آنکھ سے۔ اسی طرح ایک ہی نظم میں ایک سے زیادہ بحور کے استعمال کو جائز سمجھتا ہوں۔ قارئین اس کے نمونے میری بعض نظموں میں پائیں گے۔ اسے میری عروض سے عدم واقفیت پر محمول نہ فرمایا جائے۔ میں اس بات کی پُرزور تردید کرتا ہوں کہ ہم قوافی اور ردیف کی بندشوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ غالباً ان الزام لگانے والوں کو علم نہیں کہ شعرِ آزاد میں اچھی نظم کہنا بہت مشکل ہے اور روائتی طرز میں جہاں قوافی اور ردیف کا سہارا مل جاتا ہے، بہت آسان۔ میں مغرب کی ایمائی اور تشبیہی شاعری سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ شاید بعض احباب کا خیال ہو کہ یہ مغرب زدگی یا مغرب کی دریوزہ گری اور ایک مرعوب، ہزیمت خوردہ یا غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ جن احباب نے دنیا کی ادبیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک ملک کے ادب کا دوسرے ملک کے ادب پر اثر ناگزیر ہے۔"

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے INSPIRATION کے لئے اپنی رفیقۂ حیات کو چنا۔ "سرودِ نو" کا انتساب بھی سلمیٰ تصدق کے نام ہے۔ بیشتر نظموں میں سلمیٰ ہی سے خطاب کیا ہے اور وہ خود لکھتے ہیں: "میری یہ منظومات بیشتر میرے قلبی جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہیں۔ اُن میں سے اکثر میں میرا مخاطب میری رفیقۂ حیات سلمیٰ محمودہ سے ہے۔ اس کی محبت میری زندگی کے ہر قدم میں میرے لئے مشعلِ راہ رہی ہے۔ اپنی مسلسل علالت کے باوجود اس نے علم و ادب کے مطالعہ، شعر و شاعری، مضمون نگاری، موسیقی، قومی اور سماجی اداروں کی

خدمت اور بالآخر عملی سیاسیات، غرض زندگی کے ہر شعبے میں پوری دسترس حاصل کی۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ میری مسرت کی تکمیل ہو سکے اور ہم زندگی سے پوری طرح شاد کام ہوں۔"

ڈاکٹر مس خدیجہ فیروز الدین ساری عمر پردہ نشین رہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ کسی نے اُن کا پلّو تک نہ دیکھا اور سردی ہو یا گرمی۔ ہاتھ ہمیشہ دستانوں میں چھپے رہے۔ پردے کی حالت میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ متحدہ پنجاب میں ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ تعلیم کے عہدے تک پہنچیں اور ڈائرکٹر صرف اس لئے نہ بن سکیں کہ بُرقع پوش تھیں۔ کیونکہ حکام بالا کا خیال تھا کہ بُرقع فرائض منصبی میں حائل ہوگا۔ موصوفہ سیاست سے الگ رہیں لیکن معاشرتی بہبود کے لئے عورتوں کی جو انجمنیں بنیں اُن میں اعلیٰ عہدوں پر رہ کر خدمتِ خلق کا فرض سرانجام دیا یوں بھی مجلسی سرگرمیوں میں پیش پیش تھیں۔ عمر کے آخری حصّے میں دنیائے اسلام کے اتحاد کی داعی جماعت "الاحباء" سے وابستہ رہیں۔ اُن سے میرا رابطہ تو پہلے بھی تھا لیکن زیادہ رابطہ "الاحباء" ہی کی وساطت سے رہا۔

ابتدا میں مختلف درس گاہوں سے وابستہ رہیں۔ ملازمت کے باوجود مسلمانوں کی خصوصی نسوانی درس گاہوں کے لئے مشیر کے فرائض ادا کرتی رہیں اور ان میں اساتذہ اور طالبات سے وقتاً فوقتاً خطاب بھی کرتی رہیں۔ دین سے بید لگاؤ تھا۔ پابندِ صوم وصلواۃ تھیں۔ اسلامی قدروں کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھیں۔ یوں سمجھیے کہ زندگی کا مشن یہی تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دوسروں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جائے اور جس طرح کی باعفّت اور پاکیزہ زندگی خود گزاری اُس قسم کی زندگی بسر کرنے کی تلقین دوسروں کو کی جائے۔ اُنہوں نے عمر بھر

شادی نہ کی۔ خدا جانے کیوں؟

خضر تمیمی لاہور کے نامور وکیل تھے۔ لیکن وہ اپنی مزاحیہ شاعری کی بنا پر ادبی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ شاعری کی ابتدا کالج سے ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی یہ شغل جاری رہا اور کسی زمانے میں مشاعروں میں ان کی مانگ اتنی ہی زیادہ تھی جتنی بعد میں حاجی لق لق۔ ضمیر جعفری اور سید محمد جعفری کو نصیب ہوئی۔ وکالت کے پیشے نے شعر و شاعری کو ٹھپ کر دیا اور اس کے بعد نجی محفلوں میں تو اپنا کلام سُنا دیتے تھے لیکن مشاعروں میں نہیں جاتے تھے۔ خضر تمیمی کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ ملتانیوں سے بات کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ ساری عمر سرائیکی ہی میں گفت گو فرماتے رہے ہیں اور پوٹھوہار جاتے تو پوٹھوہاری بولی بولتے۔ یہاں تک کہ ہریانہ پرانت (انبالہ ڈویژن) کی بولی پر بھی حاوی تھے۔ پنجابی ادب کی کلاسیکی کتابوں کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ نجی محفلوں میں سناتے اور سب کو لوٹ پوٹ کر دیتے تھے۔ اُنہیں میں جانتا تو دیر سے تھا لیکن قریب اُس وقت آیا جب "پنچایت" کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اُن دنوں موصوف ڈویژنل انسپکٹر پنچایت (ایجوکیشن) کے عہدے پر فائز تھے۔ مجھے دو تین مرتبہ ان کے ساتھ ملتان ڈویژن کے دورے کا اتفاق ہوا اور خوب مزہ رہا۔ محکمہ پنچایت میں بھی جب فارغ ہوتے تو اپنی صحبت سے فیض یاب فرماتے۔ اصل نام مولا بخش تھا۔ لیکن "خضر تمیمی" اتنا مقبول تھا کہ "مولا بخش" پسپا ہو گیا۔ رہن سہن سادہ رہا۔ مدتوں افلاس میں زندگی گزاری۔ پاکستان بننے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ تو مالی حالات کسی قدر سُدھر گئے۔ بہرحال پریشانیوں کے عالم میں بھی اُن

کی شگفتگی برقرار رہی۔

ملک خضر حیات ٹوانہ ایک سرو قد، بانکے سجیلے، خوش لباس اور رنگین مزاج سیاست دان تھے۔ پنجاب کے سب سے بڑے جاگیردار تھے اور مزارعین سے حُسنِ سلوک کی بنا پر کالڑا اسٹیٹ میں خاصے مقبول تھے۔ ایچیسن کالج سے تعلیم پائی۔ جاگیر کے انصرام میں مصروف تھے کہ سیاست کی طرف سے بُلاوا آگیا۔ ۳۷ء کے عام انتخابات میں یونینیسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن چنے گئے۔ سر سکندر حیات نے وزارت بنائی تو اس میں اُنہیں بھی لے لیا۔ اور جب مختلف وزرا کے سوانحی خاکے اخبارات میں شائع ہوئے تو وزارت کے لئے اُن کی واحد کوالیفکیشن یہ بتائی گئی کہ اُنہیں اپنی جاگیر کے نظم و نسق کا تجربہ ہے۔ اس پر بعض ہونٹ متبسّم ہوئے اور نجی محفلوں میں کچھ طنزیہ فقرے بھی کسے گئے۔ جب تک سر سکندر حیات وزارتِ اعلیٰ پر فائز رہے ملک خضر حیات اسمبلی میں بھی خاموش رہے۔ اس سے لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ اُن کے منہ میں زبان نہیں ہے لیکن سر سکندر کی وفات پر اُنہیں وزارت اعلیٰ کی گدی ملی تو یہ انکشاف ہوا کہ زبان موجود ہے اور خاصی دراز بھی ہے۔

سر سکندر کی شخصیت قدآور تھی۔ ان کے اثر و رسوخ کی طنابیں بھی وسیع تھیں اس لئے سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو قائدِ اعظمؒ ان سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ سر سکندر نے پیکٹ کے باوجود دیر تک اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی نہ بنائی اور جب بنائی تو نیم دلانہ انداز میں اور اُس کا کوئی آئین بھی نہ بنایا۔ ملک خضر حیات ٹوانہ نے اپنے عہد میں ایک باقاعدہ لیگ پارٹی قائم کی۔ اُس کا آئین بھی بنایا۔ اس لئے وہ ابتدائی دور میں

قائداعظم کو پسند تھے لیکن رفتہ رفتہ شکوک و شبہات کی دیواریں کھڑی ہونے لگیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب افتخار حسین آف ممدوٹ، سردار شوکت حیات میاں ممتاز دولتانہ، میاں افتخار الدین اور راجہ غضنفر علی خاں جیسے ارکان اُن کے حریف تھے، ملک خضر حیات سے بعض ایسے مطالبات کئے گئے جو وہ پورے نہ کر سکے۔ وزارت سے شوکت حیات کی برطرفی نے جلتی پر تیل کا کام دیا اور حالات نے ایسی سنگین کروٹ لی کہ قائداعظم نے اُنہیں لیگ سے نکال باہر کیا۔ تیس ارکان پر مشتمل مسلم لیگ پارٹی اپوزیشن بنچوں پر جا بیٹھی لیکن ملک خضر حیات بدستور اقتدار میں رہے کیونکہ دو تہائی مسلمان ارکان اور غیر مسلم ارکان کی ایک خاصی تعداد کی تائید برقرار رہی۔

ملک خضر حیات کو مدیرانِ "انقلاب" نے مشورہ دیا کہ وہ اپنی تقریروں میں یہی کہیں کہ مسلم لیگ نے مجھے نکال دیا ہے لیکن میں بدستور مسلم لیگی ہوں اور پاکستان کا حامی ہوں لیکن یہ مشورہ قبول نہ کیا گیا اور اُن پر ایسے مشیر غالب آ گئے جو اُن کے اور قائداعظم کے درمیان محاذ آرائی چاہتے تھے۔ انہی کے مشورے سے زمیندارہ لیگ منظّم کی گئی۔ طرّہ یہ کہ یونینسٹ پارٹی کے سرکاری ترجمان روزنامہ "شہباز" کی ادارت ایک کانگرسی مسلمان صحافی عبدالباقی کے ہاتھ آ گئی اور اُنہوں نے اخبار کو ایسا رنگ دے دیا جو مسلمان عوام کو ناپسند تھا تحریکِ پاکستان بڑی گھن گرج کے ساتھ جاری تھی۔ انتظامیہ کے مسلمان افسر اور ملازم بھی اس سے متاثر تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کا بازار گرم ہوا تو زمیندارہ لیگ بُری طرح پٹ گئی اور نوّے مسلمان نشستوں میں سے صرف سات اُس کے ہاتھ آئیں۔ ایسے میں اگر ملک خضر حیات سیاست سے ریٹائر ہو جاتے تو اچھا تھا لیکن اُنہوں نے یہ غلطی کی کہ کانگرس پارٹی اور دوسرے

غیر مسلم عناصر کے ساتھ مل کر وزارت بنالی۔ اس پر مسلم رائے عامہ بھڑ گئی کیونکہ برسرِ اقتدار کولیشن وزارت میں صرف سات مسلمان شامل تھے اور مسلمان ارکان کی غالب اکثریت بے دست و پا ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی عوامی تحریک چلائی جس نے خضر حیات کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ اُنہی دنوں جب حکومتِ برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ وہ بہت جلد اقتدار منتقل کر دے گی تو خضر حیات نے یہ کہہ کر استعفےٰ دے دیا کہ اقتدار کا انتقال مسلم اکثریتی پارٹی کو ہونا چاہیئے۔ اس پر مسلمانوں نے خوشیاں منائیں، وہ خضر حیات کی غلطی کو بھول گئے اور پنجاب کے در و دیوار اس نعرے سے گونج اُٹھے کہ "تازہ خبر آئی ہے، خضر ہمارا بھائی ہے"۔

اس کے بعد خضر حیات سیاست سے مکمل طور پر ریٹائر ہو گئے اور ایسے خاموش ہوئے کہ کسی مسئلے پر کوئی بیان نہ دیا۔ کوئی تقریر نہ کی۔ پاکستان بننے کے بعد جو حکومتیں برسرِ اقتدار رہیں، اُن کے بیشتر سربراہوں نے اُنہیں عہدوں کی پیش کش کی لیکن وہ نہ مانے اور تادمِ مرگ ایک پُر وقار خاموشی اور علیحدگی اختیار کیے رکھی۔ ملک خضر حیات سے میری کوئی راہ و رسم نہیں تھی۔ ایک دفعہ میرے دوست نواب زادہ خورشید علی خان مرحوم نے گپ بازی کے دوران میں کہا۔ چلو تمہیں ملک صاحب سے ملائیں۔ میں نے کہا بسر و چشم چنانچہ ہم دونوں لاہور چھاؤنی میں اُن کے دولت کدے پر پہنچے۔ پہلے کچھ دیر اُن کی خوبصورت بیوی زینب سے باتیں ہوتی رہیں۔ خضر حیات کے چچا اللہ بخش ٹوانے سے شاکی تھیں۔ کہتی تھیں یہ شخص بدتمیز ہے۔ کمرے میں بلا اطلاع دھڑا دھڑ گھس آتا ہے۔ اتنے میں ملک خضر حیات آئے تو گفت گو کا موضوع بدل گیا اُنہوں نے نواب زادہ خورشید علی خان سے اُن کا حال پوچھا تو وہ اپنے عوارض

کی تفصیل میں جانے لگے۔ اس پر خضر حیات بولے۔ خورشید! میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا کہ ہسپتال کھول دو۔ بیماریوں کا ذکر کیا لے بیٹھے ہو۔ کوئی اچھی سی بات کرو۔ اس کے بعد ہلکی پھلکی باتیں ہونے لگیں۔ سیاست کا کوئی ذکر نہ آیا البتہ نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کا تذکرہ ضرور چھڑا۔ کیونکہ اُن سے خضر حیات کے خاصے تعلقات تھے۔ کہتے تھے کہ نواب آف کالا باغ سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے اور کوئی مشورہ طلب کریں۔ تو دے دیتا ہوں۔

ملک خضر حیات سے دو تین سوشل تقریبات میں بھی ملاقات ہوئی ایک دفعہ اُن سے میں نے پوچھا۔ کہ آپ نے سیاسی زندگی کے بارے میں اپنی یادداشتیں مرتب کی ہیں یا نہیں۔ اُنہوں نے اثبات میں جواب دیا اس پر میں نے پوچھا کہ آپ انہیں شائع کیوں نہیں کرتے۔ کہنے لگے کہ اشاعت کے لئے ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ اُن کی وفات کے بعد میں نے اپنے ایک شاگرد کی وساطت سے اُن کی آخری بیوی سے دریافت کیا کہ مسودہ کہاں ہے؟ لیکن وہ اس سے بے خبر نکلیں۔ برسبیلِ تذکرہ یہ بھی عرض کردوں کہ وہ شادیاں کرنے اور اُنہیں توڑنے میں خاصے تیز تھے۔ ابھی ابھی ایک بات یاد آئی کہ والد کے انتقال کے چند روز بعد وہ میرے پاس مسلم ٹاؤن آئے اور برآمدے ہی میں بیٹھ کر فاتحہ خوانی کی۔ اور چلے گئے۔

چودھری **خلیق الزمان** ہمارے اُن قومی رہنماؤں میں شامل تھے جنہوں نے ساری عمر سیاست میں بسر کردی۔ تحریکِ خلافت میں قید و بند کے مصائب جھیلے۔ مسلم لیگ کی تنظیم میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تحریکِ پاکستان کو اوڑھنا بچھونا بنایا اور عوام سے گہرا رابطہ ہمیشہ قائم رکھا۔ وہ جاگیردار نہیں تھے۔

سرمایہ دار نہیں تھے اس لئے اُن کا عوامی رنگ قائم رہا اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ ہندوستان کے صوبہ یو پی میں مسلم لیگ کو جو ہر دلعزیزی نصیب ہوئی وہ تمام تر اُنہی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔

پاکستان بنا تو چودھری صاحب یہاں آگئے۔ اس پر کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں اور اُن کا جواز یقیناً موجود تھا۔ کیونکہ اُن جیسی قدآور شخصیت ترکِ وطن نہ کرتی تو ہندوستانی مسلمانوں میں قیادت کا وہ خلاء پیدا نہ ہوتا جو مدتوں پُر نہ ہو سکا۔ بہرحال پاکستان کے لوگوں نے اُنہیں آنکھوں پہ بٹھایا اور پاکستان مسلم لیگ کا صدر چُن لیا۔ اگر وہ اس جماعت میں جان نہ ڈال سکے تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ اُنہوں نے تساہل سے کام لیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ بہت سے کارکن الاٹمنٹ کے چکر میں پڑ گئے اور دولت کے حصول میں مصروف ہو گئے۔ پھر مسلم لیگ اقتدار میں تھی اور ہر وزارت نے مسلم لیگ کی قیادت قبول کرنے کی جگہ اسے اپنی کنیز بنانا چاہا۔ ایسے میں چودھری صاحب کرتے تو کیا کرتے پھر ہمارے ملک میں بدذوقی بھی بدرجۂ وافر موجود ہے۔ اُنہوں نے دنیائے اسلام کے اتحاد کی خاطر "اسلامستان" کی تحریک کا آغاز کیا تو اُن پر نکتہ چینی ہونے لگی جس نے تضحیک کا رُوپ بھی لے لیا حالانکہ برِعظیم کے تمام مسلمان رہنما تحریکِ اتحادِ اسلامی کے داعی رہے اور پاکستان بنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دنیائے اسلام کے اتحاد کو آگے بڑھایا جائے۔ ایسے میں اگر چودھری صاحب نے "اسلامستان" کا نعرہ بلند کیا تو اس میں حیرت کا چنداں کوئی مقام نہیں تھا۔

چودھری صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ "پاتھ وے ٹو پاکستان" کے نام سے خودنوشت سوانح قلمبند کر دیئے، جو حقیقت میں ہماری جدوجہد

آزادی کی داستان ہے چونکہ اس میں جدوجہد کے بعض ایسے پہلو بھی بے نقاب کر دیئے جس سے بعض شخصیات متاثر ہوتی تھیں اس لئے بدذوق حضرات نے اس کتاب پر بھی یلغار فرمائی اور بہت سوں نے بغیر پڑھے ہی کتاب پر اُلٹی سیدھی تنقید کر ڈالی۔ یہ بھی کہا کہ کتاب "در مدح خود میگوید" کی حامل ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چونکہ یہ خود نوشت سوانح پر مشتمل تھی اس لئے مرکزی کردار چودھری صاحب ہی تھے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ میں نے چودھری صاحب کی کتاب پڑھی اور اُن کے حق میں بعض مضامین لکھے۔ جب وہ لاہور آئے تو مجھے بلا بھیجا۔ راجہ غضنفر علی خان کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی اُنہوں نے کتاب کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر پیش کیا اور مہر و سالک کی قومی خدمات کا دیر تک تذکرہ کرتے رہے۔ چودھری صاحب نے خود تو پاکستان میں کوئی وزارتی منصب قبول نہ کیا البتہ بیگم زاہدہ خلیق الزمان وحدتِ مغربی پاکستان کی وزارت میں شامل رہیں۔

خلیق قریشی لائل پور کے جانے پہچانے صحافی تھے۔ زندگی کا آغاز "لائل پور اخبار" کی ادارت سے کیا جو ڈسٹرکٹ بورڈ کا ترجمان تھا اور اس کے بعد روزنامہ "عوام" جاری کر لیا۔ جو اُن کی وفات کے بعد بیٹوں نے جاری رکھا لیکن وہ صرف صحافی نہیں تھے۔ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ غزل کہتے تھے لیکن کم زیادہ تر قومی نظمیں کہیں اور اُن سے لوگوں کے دلوں کو گرمایا اور تڑپایا۔ وہ تحریک پاکستان کے اُن پُرجوش کارکنوں میں شامل تھے جنہوں نے اس کے حق میں خون پسینہ ایک کر دیا اور نظریۂ پاکستان پر اُن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ اس بارے میں کسی مفاہمت کے قائل نہیں تھے اور ساری عمر اس کے حق میں لکھتے رہے

اور لڑتے رہے۔ ان سے میری یاد اللہ پاکستان بننے سے سالہا سال پہلے شروع ہوئی اور پیار کا بندھن آخیر دم تک قائم رہا۔ میں لائل پور جاتا۔ تو سر پر اٹھا لیتے۔ لاہور میں شامِ ہمدرد کی تقریبات میں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ جب ملتے پہلے بغل گیر ہوتے۔ پھر مصافحہ کرتے۔ ایک دفعہ دور سے پہچاننے میں دقت ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اُنہوں نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ میں نے پوچھا اس تازہ چیز کی شانِ نزول؟ بولے۔ وہ نہیں ہے، جو تم سوچتے ہو۔ میں نے کہا تمہیں میری سوچ کا علم کیسے ہوا ہے؟ بولے۔ میں جانتا ہوں۔ تم شرارتی ہو۔ میں نے کہا سچ کہتے ہو مجھے وہ کہاوت یاد آرہی تھی کہ "بھٹیارا ہے نمازی تو ضرور ہے دغا بازی"، کہنے لگے۔ یار! خدا سے کہاں دغا بازی ہو سکتی ہے؟

اپنی دوسری بیگم کو ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ پنڈی جاتے یا لاہور آتے بھابی ساتھ ہوتی تھی۔ وہ نہایت شگفتہ مزاج خاتون ہیں اور غالباً خلیق قریشی کو یہی ادا پسند آئی تھی۔ وہ ہر محفل میں بیگم سے ملاتے اور یوں کچھ باتیں ہو جاتی تھیں خلیق قریشی اور میر عبدالقیوم کے انتقال کے بعد میرے لئے لائل پور سُونا ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ علی محمد خادم اور شاہ محمد عزیز سے میرے برادرانہ مراسم ہیں اور اُن کی بھی بڑی رونق ہے۔

سیّد خلیل الرحمٰن تحریک پاکستان کے اُن کارکنوں کی صف میں شامل تھے جنہوں نے کام تو بہت کیا لیکن نام نہیں پایا۔ شاید اس لئے، کہ وہ خاموش طبع تھے اور نشر و اشاعت سے حجاب ان کی گھٹی میں تھا۔ قرار داد لاہور کی منظوری سے ایک آدھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ اُن سے رابطہ پیدا ہوا۔ اس میں پیر علی محمد راشدی وسیلہ بنے جن کے حلقۂ احباب میں خلیل الرحمٰن کے علاوہ محبوب احمد، ظہیر الاسلام

قریشی۔ نسیم انصاری اور بندۂ عاجز شامل تھے۔ ہم لوگ مسلم لیگ کی نرم و نازک سیاست کے قائل نہیں تھے۔ جی چاہتا تھا، کچھ کر گزریں اور کاروانِ ملت کی رفتار میں تیزی پیدا کریں۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ بنا لی۔ اتنے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا لاہور سیشن قریب آگیا۔ راشدی صاحب نے نواب شاہنواز خان آف ممدوٹ کے دولت کدے کی انکیسی میں ڈیرے ڈال دیئے اور ہماری منڈلی بھی وہیں بیٹھنے لگی۔

سید خلیل الرحمٰن پر وہی بیتی جو درمیانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنوں کے نصیب میں تھی۔ یہ لوگ محنت اور ریاض سے کام لے کر زمین ہموار کرتے۔ خون پسینہ ایک کر دیتے اور جب کامیابی قریب ہوتی تو اُمرا قیادت سنبھال لیتے اور اصل کام کرنے والے آہستہ آہستہ پسِ پشت چلے جاتے، کیونکہ سیاست تو پیسے کا کھیل تھا۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو کارکنوں کے نام نہیں ملیں گے۔ یہی کیفیت سید خلیل الرحمٰن کی ہے۔

میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ پاکستان بننے سے چند سال بعد اربابِ حکومت کو اُن کا خیال کیونکر آگیا کہ اُنہیں رنگون میں پاکستانی سفیر مقرر کر دیا۔ بہر حال وہاں سے فارغ ہونے کے بعد غالباً لائل پور کے ایک بڑے صنعتی ادارے میں ملازم رہے اور جب اللہ کو پیارے ہوئے تو کسی اخبار نویس کو ایک شذرہ بھی قلمبند کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔

محمد خلیل الرحمٰن لاہور کے جانے پہچانے جواں سال شاعر تھے اور تہذیبی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ اُنہوں نے ایک مجلسِ فکر و نظر بنا

رکھی تھی جس کے اہتمام میں بی ۔ این ۔ آر آڈی ٹوریم میں وقتاً فوقتاً علمی، ادبی اور ثقافتی مجالس برپا کرتے تھے ۔ ان میں لاہور کے نمایاں دانش ور بڑے ذوق و شوق سے حصّہ لیتے تھے ۔ اب ایسی سرگرمیاں زیادہ تر "قومی ملکیت میں آچکی ہیں ۔ کیونکہ پاکستان نیشنل سنٹر نے اُن کا اجارہ لے رکھا ہے خلیل الرحمٰن علین جوانی کے عالم میں انتقال کر گئے اور مجلسِ فکر و نظر کو بھی ساتھ لے گئے ۔ موت سے چند سال پیشتر اُنہوں نے "لمحے" کے نام سے ایک مجموعۂ کلام شائع کیا تھا جس کی آخری نظم "لمحے" سے اُن کی شاعرانہ صلاحیت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے :

مرے لمحے ماضی کے رنگین شگوفوں پہ شبنم کی مانند بکھرے ہوئے ہیں
مرے لمحے ماضی کی بے برگ سنسان اُلجھی ہوئی ٹہنیوں کی خموشی سے
لپٹے ہوئے ہیں
مرے لمحے ماضی کی خلوت میں اک پیکرِ سیم گوں کی حریری حرارت
میں ڈوبے ہوئے ہیں
کہیں شاخِ گل کے لچکتے فسوں میں سمائے ہوئے ہیں
کہیں زلف و رخسار کے مست ماحول کی مے میں بھیگے ہوئے ہیں
کہیں آرزو کے طرب ناک تند اور وحشی شراروں میں اُلجھے
ہوئے ہیں
کہیں آنسوؤں کے دھندلکے کی گہری خموشی کے مرکز میں سمٹے
ہوئے ہیں
کبھی حُسن کی کوئی نازک کرن میری آنکھوں میں آتی ہے ایسی
کہ گزرے ہوئے سارے لمحوں کے پرتو

شعاعوں کی مانند بھر تھرتھراتے گزرتے ہیں دل سے
میں گزرے ہوئے سارے لمحوں کی رنگینیاں دیکھ کر سوچتا ہوں
یہ حسن و حقیقت کی راہوں میں منزل بہ منزل درخشاں رہے ہیں
درخشاں رہیں گے!

شیخ خورشید احمد عین جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ زندہ رہتے تو بہت نام پاتے۔ اس لیئے، کہ بلا کے ذہین تھے۔ طبّاع تھے۔ محفل آرائی میں کمال رکھتے تھے۔ سیاسی اور قانونی موضوعات پر جو گفت گو فرماتے اس میں گہرائی بھی ہوتی اور شوخی بھی۔ اُن سے میری راہ و رسم اس وقت شروع ہوئی جب طالب علم تھے۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ کافی ہاؤس میں محفلیں آباد کیں۔ انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ (زیورخ) نے لاہور میں ایشیائی اخبار نویسوں کا ایک مذاکرہ منعقد کیا تو اس میں ہم دونوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ میں نے مغربی پاکستان کے اخباروں میں مشرقی پاکستان کی کوریج COVERAGE پر لیکچر دیا اور شیخ خورشید احمد نے صحافتی قوانین پر۔ لیکچر کے آغاز کے وقت قدرے نروس تھے لیکن جب سلسلۂ کلام چل نکلا تو وہ نکتہ آفرینیاں کیں کہ سب عش عش کر اُٹھے۔ دورِ ایوبی میں مسٹر جسٹس محمد منیر کی سفارش پر اُنہیں وزیرِ قانون کے عہدے پر فائز کیا گیا اور اُنہوں نے نیشنل اسمبلی میں خطابت کے جوہر دکھا کر ثابت کر دیا کہ وہ اعلیٰ درجے کے پارلیمانی مقرر بھی ہیں۔ کچھ عرصہ وزارت چلی اس کے بعد سبکدوش ہو گئے۔ کہتے ہیں زیرِ عتاب تھے۔ بہر حال وہ پھر وکالت کے پیشے میں مگن ہو گئے کہ اچانک بیماریٔ دل نے موت سے ہمکنار کر دیا۔

شیخ خورشید احمد اُن نوجوانوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے

جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے آخری دور میں بڑے جذب وجنوں کے ساتھ کام کیا مسلم لیگ کے بعض "انڈر گراؤنڈ" اخبار بھی انہی کی وساطت سے تقسیم ہوئے تھے۔

نواب زادہ خورشید علی خان پاکستان بننے سے پہلے غیر منقسم ہندوستان کے ایوانِ بالا (کونسل آف سٹیٹ) کے رکن اور یونینسٹ پارٹی کے ریذیڈنٹ سیکرٹری تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خان کے فرزند تھے۔ والدِ مرحوم کے اُن دوستوں میں شامل تھے جو ہمیشہ میری خیر خواہی میں پیش پیش رہے۔ مرحوم میرے ہاں کئی مرتبہ آئے۔ پاکستان بننے کے بعد سیاست سے عملاً لاتعلق تھے لیکن اس موضوع پر گفتگو کا چسکا بہت تھا۔ چنانچہ جب ملتے۔ سیاست ہی پر گفتگو ہوتی۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ مجھے والد کا جانشین سمجھتے اور جن تقریبات میں محض بزرگ مدعو ہوتے تھے وہاں بھی مجھے بالالتزام بلاتے تھے اور جس طرح والد مرحوم سے بعض نجی امور میں مشورہ لیتے، اُسی طرح میرے مشوروں پر بھی انحصار فرماتے تھے۔ میں اُن کے گھر جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ کیونکہ ان کی بیگم صاحبہ بھی شفقت فرماتی تھیں اور بیٹے بھی احترام کرتے تھے۔ نواب زادہ خورشید علی خان اُن پرانے رؤسا میں شامل تھے جن میں رؤسا کی روائتی خوبیاں تو موجود تھیں لیکن خرابی نام کو بھی نہیں تھی آزادی سے چند سال پہلے مجھے شملہ جانے کا اتفاق ہوا تو انہی کی کوٹھی میں قیام کیا۔ میں نے ناشتے کی میز پر دیکھا کہ اُن کے سامنے جو پیالی رکھی تھی۔ وہ صورت شکل اور رنگ روپ میں دوسری پیالیوں سے مختلف تھی۔ میں نے اسے رئیسانہ ٹھاٹھ اور انفرادیت سے تعبیر کیا۔ بعد میں والد صاحب سے تذکرہ

کیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صفائی کے بارے میں کسی وہم کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ وہ جب شعبہ صحافت میں یا میرے گھر آتے، چائے نہیں پیتے تھے لیکن ڈبّے کے بسکٹ کھا لیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ مشین کے ذریعے سے تیار ہوتے تھے نواب زادہ صاحب کی یہی خواہش تھی کہ میں اُن سے مواد اور دستاویزات لے کر اور مزید تحقیق کر کے نواب سر ذوالفقار علی خان کے سوانح مرتب کر دوں لیکن میرا تساہل حائل رہا

دانیال لطیفی لاہور کے کمشنر الما لطیفی کے فرزندِ ارجمند تھے۔ ساری عمر نازو نعم میں کٹی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جوانی دیوانی گھٹا باندھ کر آئی تو کمیونزم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس کے ہو رہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے رُکن بنے۔ دوسری عالمی جنگ چھڑی تو موصوف نے ایک تقریر فرمائی جس میں لوگوں کو تلقین کی کہ اس جنگ میں انگریز کا ساتھ نہ دیں کیونکہ یہ جنگ سامراجی مقاصد کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ انگریز ایسی بے تکلفی کے روادار نہیں تھے چنانچہ انہیں دھر لیا۔ لیکن باقاعدہ مقدمہ چلایا۔ میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں رپورٹنگ کی تربیت لے رہا تھا۔ اسی سلسلے میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا۔ دانیال کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ بڑا دُکھ ہوا کہ ایسے ذہین اور قابل نوجوانوں سے یہ سلوک ہو رہا ہے۔ اُنہوں نے جو طویل تحریری بیان داخل کیا اُس کی ورق گردانی عدالت کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کی۔ اور دل ہی دل میں اُنہیں داد دی کہ کس شدّت اور کس جذبے کے ساتھ اُنہوں نے اپنے موقف پر اصرار کیا ہے۔ اُنہیں دو سال قید کا حکم سنایا گیا تو مسکرا دیئے کہ یہی اہلِ وفا کا شیوہ ہوتا ہے۔

اس واقعے کا ایک مضحک پہلو بھی ہے وہ یہ کہ جنگ چھڑی تو نازی جرمنی اور سوویٹ یونین کے درمیان دس سالہ معاہدہ عدم جارحیت کے بعد، اور "کمیونسٹ انٹرنیشنل" نے اسی رائے کا اظہار کیا کہ یہ جنگ جمہوریت کے لئے نہیں، فاشزم اور نازی ازم کو ختم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض سامراجی مقاصد کے لئے لڑی جارہی ہے لیکن جب نازی جرمنی نے سوویٹ یونین پر حملہ بول دیا اور سوویٹ یونین کو برطانیہ اور امریکہ کا اتحادی بننا پڑا۔ تو کمیونسٹ انٹرنیشنل نے کانٹا بدل لیا اور یہ نئی لائن دی کہ یہ جنگ ایک عوامی جنگ ہے جو دنیا بھر کے جمہوری عناصر آمریت کے خلاف لڑ رہے ہیں چنانچہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی اپنا موقف بدل لیا اور جواب میں حکومتِ ہند نے کمیونسٹ قیدی رہا کر دیئے۔ دانیال لطیفی بھی انھی میں شامل تھے۔ گویا قید کاٹی۔ تو بے سود۔

خواجہ دل محمد کی شخصیت میں تین مشاغل مرتکز تھے۔ تدریس، سیاست اور شاعری۔ تدریس ریاضی کی، سیاست بلدیاتی اور شاعری رباعیات کی ساری عمر اسلامیہ کالج میں پروفیسر رہے۔ وائس پرنسپل بھی بنے اور تدریس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کچھ دیر ریاضی کے علاوہ صرف فرسٹ ائیر کے طلبا کو انگلش کمپوزیشن بھی پڑھاتے تھے مجھے اس مضمون میں ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ اُن کی سیاست شہر لاہور میں محدود تھی۔ پروفیسری کے ساتھ ساتھ میونسپل کمیٹی کی رکنیت کے لئے الیکشن لڑتے رہے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے۔ اس رعایت سے لاہور کی ایک سڑک خواجہ دل محمد روڈ کہلاتی ہے شعر و شاعری کا آغاز جوانی میں ہوا۔ اقبال سے متاثر ہو کر قومی نظمیں لکھنے لگے

اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجتماعات میں پڑھ کر دلوں کو گرماتے اور تڑپاتے رہے۔ ان نظموں کا مجموعہ "دردِ دل" کے نام سے چھپا۔ اخلاقی نظموں کا مجموعہ "آئینہ اخلاق" کے نام سے شائع ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے کیونکہ اُس زمانے میں اخلاق کو معاشرے میں بڑی اہمیت حاصل تھی پھر "بھگوت گیتا" کا منظوم اُردو ترجمہ کیا لیکن اُن کی شاہکار کتاب "صد پارۂ دل" تھی۔ جس میں پانچ سو رباعیات شامل ہیں اور جس کا دیباچہ سر شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا۔ اس دیباچے سے یہ اقتباس پیشِ خدمت ہے: "خواجہ صاحب کے روبرو ایک شخص نے ریاضی اور نظم کے تضاد کا ذکر کیا تو اُنہوں نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ ان دونوں فنون کو ایک دوسرے سے مختلف سمجھتے ہیں کیونکہ اپنی انتہائی منازل میں ریاضی اور شاعری، دونوں کا مطمحِ نظر ایک ہی ہے۔ ریاضی نیرنگِ تصاویر سے وہی لطف اٹھاتی ہے جو شاعری نیرنگِ خیال سے۔ ریاضی کو ایک ذرۂ ہیچ مقدار میں وہی قوتِ عظیم اور گردشِ لامتناہی نظر آتی ہے جو نظامِ شمسی میں کارفرما ہے اور فضا کی لاانتہائیوں میں اجرامِ سماوی کی بے پایاں حرکات اُسے محوِ حیرت بنا دیتی ہیں اسی طرح شاعری چشمِ بصیرت سے عالمِ شہود کی اُنھی بے پایانیوں اور لاانتہائیوں سے لطف اندوز ہوتی ہے جو انسان کو عالمِ ہست و بود سے عالمِ کیف و تخیل میں لے جا کر مست و بے خود کر دیتی ہے"۔

جسٹس شیخ دین محمد دنیاوی اعزازات کے اعتبار سے بہت خوش نصیب تھے۔ عہدِ شباب میں گوجرانوالہ کے صدر بلدیہ بنے۔ متحدہ پنجاب کی مجلس قانون ساز میں پارلیمانی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اُن دنوں ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہوئے

جب مسلمانوں کو یہ اعزاز بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ پنجاب باؤنڈری کمشن کے پاکستانی رکن نامزد ہوئے اور ہندوستان اور پاکستان، دونوں کے نمائندوں نے اُنہیں نائب صدر چُن لیا۔ سندھ کے گورنر بنے اور پھر وزارتِ امورِ کشمیر پر فائز ہوئے۔ گویا کوئی ایسا دنیاوی اعزاز نہیں تھا، جو اُنہیں نہ ملا لیکن اُن کی کامیابی کا راز کردار کے اس روشن پہلو میں مضمر تھا کہ ان کی نگاہ دوربین تھی وہ تاریک پردوں کو چیر کر صداقت پا لیتے تھے اور ہر قسم کے دنیاوی خوف سے بالا رہتے ہوئے صداقت کا اعلان کر دیتے تھے۔ پس دوربین نگاہ اور اعلائے کلمۃ الحق اُن کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

اُن کی دُوربین نگاہ کا یہ کیا کم ثبوت ہے کہ اُنہوں نے باؤنڈری کمشن کی رکنیت کے دوران ہی یہ حقیقت پالی کہ کمیشن کا بظاہر غیر جانبدار صدر ریڈکلف اصل میں ہندوستان کا گماشتہ ہے اور وہ نہایت چالاکی اور پُرکاری سے کام لیتے ہوئے ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ وادیٔ کشمیر ہندوستان کی آغوش میں جا گرے۔ جب ریڈکلف نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ امرتسر اور گورداسپور کے اضلاع پر پرواز کرنا چاہتا ہے تو مسٹر جسٹس دین محمد اور مسٹر جسٹس مُنیر نے بھانپ لیا کہ اس کے جی میں کچھ اور آئی ہے اور وہ گورداسپور کے مسلم اکثریتی ضلعے کی چیر پھاڑ کر کے اور پٹھانکوٹ ہندوستان کو دے کر ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے چنانچہ اُنہوں نے قائداعظم سے ملاقات کی اور اُن سے کہا کہ ریڈکلف کی ذہنی کیفیت ایک غیر جانبدار اور بے لاگ جج کی سی نہیں ہے۔ اس لئے میں اور مسٹر جسٹس منیر اس کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے عہدوں سے مستعفی ہونے کو تیار ہیں۔ جب قائداعظم نے اس رائے کا اظہار

کیا۔ کہ محض اس علاقے پر پرواز کے ارادے کی بنیاد پر ریڈکلف ، کے خلاف جانب داری کا الزام لگانا درست نہ ہوگا۔ تو دونوں ججوں نے اس رائے کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس کے چند دن بعد کمشن کے سامنے مسلم لیگ کا میمورنڈم آیا تو دونوں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس پٹھان کوٹ تحصیل کو بچانے کے لئے وہ استعفے پر اُتر آئے تھے۔ مسلم لیگ کی صوبائی قیادت نے اُسے خود ہی چاندی کی طشتری میں رکھ کر ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا۔ مسلم لیگ نے یہ موقف پیش کیا کہ مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی حدود کا تعین کرنے کے لئے ضلع کو نہیں تحصیل کو یونٹ قرار دینا چاہیئے۔ نہ صرف یہ، بلکہ واضح الفاظ میں لکھ دیا کہ پٹھان کوٹ کی تحصیل ہندوستان کو دے دی جائے اور فیروزپور اور جالندھر کی دو دو تحصیلیں پاکستان میں شامل کر دی جائیں گویا جہاں تک پٹھان کوٹ کا تعلق تھا وہ ایک متنازعہ علاقہ نہ رہا اور فریقین اُسے ہندوستان میں شامل کرنے پر متفق ہو گئے۔ مسٹر دین محمد کی رائے یہ تھی کہ جس قیمت پر پٹھان کوٹ کی تحصیل حوالے کی جا رہی ہے وہ مل بھی جائے تو یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا۔ چنانچہ اُنھوں نے پہلے قائد اعظمؒ سے ملنے کی کوشش فرمائی۔ اس میں ناکام رہے۔ تو لیاقت علی خان سے ملے۔ لیکن موصوف نے اس بات کو چنداں اہمیّت نہ دی اور کہا کہ پٹھان کوٹ کے بدلے ہمیں کچھ معاوضہ مل بھی رہا ہے جسٹس دین محمد نے کہا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ معاوضہ بھی نہیں ملے گا چنانچہ وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا۔ موصوف مدّت تک بعض نجی محفلوں میں اس دل خراش صورتِ حالات کی تفاصیل بیان کرتے رہے اور اُنھیں منظرِ عام پر اس لئے نہ لائے کہ اس سے بعض قومی مصالح کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

جب ہم مسٹر جسٹس دین محمد کی شخصیت پر کچھ لکھتے ہیں تو اُن کا وہ

عظیم کارنامہ فراموش کر جاتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۳۸ء میں مسجد شہید گنج کے مقدمے کے سلسلے میں سر انجام دیا اور جس نے انہیں برِ عظیم کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا اور منبر و محراب اور گلی کوچوں اور میدانوں اور بازاروں میں دین محمد زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ مسجد شہید گنج ریلوے سٹیشن (لاہور) کے قریب لنڈے بازار کے سرے پر واقع آج کے گوردوارہ شہید گنج سے متصل واقع تھی اور سکھوں کی حکومت کے وقت سے انہی کے تصرف میں تھی۔ جب سکھوں نے اس مسجد کو مسمار کر دیا تو مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ اٹھی۔ انہوں نے جلوس نکالا اور مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ فوج اور پولیس نے دہلی دروازہ کے باہر راستہ روک لیا۔ مسلمان آگے بڑھنے پر مُصر ہوئے تو بے تحاشا گولی چلائی گئی اور تیس مسلمان نوجوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ مسلمانوں نے سول نافرمانی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جو مدّتوں جاری رہی۔ اس دوران میں مسلمانوں نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں یہ دعویٰ دائر کر دیا کہ شریعتِ اسلامی کی رُو سے مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اس لئے ہمیں وہاں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ڈسٹرکٹ جج نے یہ دعویٰ خارج کر دیا اور اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کی کہ مسجد عام جائیدادِ غیر منقولہ سے مختلف حیثیت کی حامل نہیں ہوتی۔ اس لئے سکھوں کا قبضہ جائز ہے۔ اس فیصلے کے خلاف مسلمانوں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ فُل بنچ میں تین جج شامل تھے۔ چیف جسٹس مسٹر ڈگلس ینگ مسٹر جسٹس بھڈّے اور مسٹر جسٹس دین محمد۔ ینگ اور بھڈے نے کثرتِ رائے سے یہ فیصلہ دیا کہ مسجد غیر منقولہ جائداد ہے۔ ہر دعویٰ قانونِ میعاد کے تحت آتا ہے اور قانون کا اطلاق کسی استثنا کے بغیر تمام دعوؤں پر ہوتا ہے خواہ

یہ دعوے مقدس جائدادوں کے متعلق ہوں۔ یا غیر مقدس جائداد کے بارے میں۔ اور نہ اس بارے میں اس وجہ سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ ایسے دعوؤں میں مدعی کوئی "خدائی ملکیت" ہے یا کوئی انسان۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بارہ سال تک سکھوں کے قبضۂ مخالفانہ کے بعد مسجد اور مسلمان اس زمین اور عمارت کے متعلق اپنے تمام حقوق کھو چکے ہیں۔ اس لئے اکثریت کی رائے کے مطابق اپیل مسترد کی جاتی ہے۔

مسٹر جسٹس دین محمد نے اس فیصلے سے اختلاف کیا۔ اور اپنا فیصلہ الگ لکھا جو ایک سو چوالیس صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں موصوف نے لکھا کہ خالص شریعتِ اسلامی کے مطابق مسجد عبادت کی جگہ ہے اور اسلامی اصولوں کے مطابق بلاشرکتِ غیرے خدا کی عبادت کے لئے وقف ہے اور ابد تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہتی ہے اور جس وقت مسجد عبادت کے لئے وقف ہو جاتی ہے تو اس کی ملکیت کے متعلق انسانوں کے تمام حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی یہ حیثیت کبھی تبدیل یا ختم نہیں ہو سکتی خواہ اُس کی عمارت کو کچھ ہو جائے یا اس پر کوئی قابض ہو جائے۔ چونکہ مسجد نہ خریدی جا سکتی ہے اور نہ فروخت ہو سکتی ہے اور اس کی نوعیت کے پیش نظر کوئی انسانی ہستی اس کی مالک نہیں ہو سکتی اور اسے ملکیت کے حق کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لئے یہ دلیل پیش کرنا ممکن ہے کہ مسجد قانونِ میعاد کی شر انگیزی سے محفوظ ہے۔ سکھوں نے اس عمارت پر جو قبضہ کیا۔ وہ قبضہ نہیں صرف ایک مینجر یا انچارج کے فرائض سنبھالے۔ اور اگر قانونِ میعاد کا اطلاق ہی کرنا ہے تو وہ ۸ جولائی ۱۹۳۵ء سے شروع ہوتا ہے جب مسجد مسمار کی گئی نئی میعاد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اگر بارہ سال تک اس حالت کو برقرار

رکھا جائے تو ملکی قانون کے مطابق قبضہ مخالفانہ مکمل ہو سکتا ہے لیکن مسجد کے بہی خواہوں نے اس میعاد کے ختم ہونے سے پہلے دعویٰ کر دیا ہے اس لئے یہ دعویٰ میعاد کے اندر ہے اور بنائے دعویٰ موجود ہے۔ پس ان تمام نکات پر میں اپیل کنندگان کے حق میں فیصلہ دیتا ہوں۔

اس اختلافی فیصلے کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امور پیش رکھنے ضروری ہیں۔ اوّل: اجنبی حکومت کے ارباب بست وکشاد کا رویہ مسلمانوں کے حق میں معاندانہ تھا۔ دوم: سکھ اسے ایک خالص فرقہ وار مسئلہ بنا چکے تھے، حالانکہ یہ ایک قانونی مسئلہ تھا۔ سوم: مسٹر جسٹس دین محمد پر یہ الزام لگایا جا سکتا تھا کہ جج ہونے کے باوجود انہوں نے اس مسئلے کو ملکی قانون کے پہلو بہ پہلو شریعتِ اسلامی کے احکام کی روشنی میں پرکھا۔ بہر حال چونکہ موصوف اعلائے کلمۃ الحق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے تمام دنیاوی مصالح سے بالاتر رہنا پسند کیا۔

یہ اس فیصلے کی برکت تھی کہ مسلمانوں نے مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لئے پریوی کونسل میں اپیل دائر کی اور پنجاب اسمبلی میں ایک ایسا مسودۂ قانون پیش کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام مساجد واپس لی جائیں جن پر غیر مسلموں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ دونوں اقدام ناکام رہے اور پاکستان بننے کے بعد بھی یہ مسجد ہمیں واپس نہ ملی لیکن اس سے مسٹر جسٹس دین محمد کے اختلافی فیصلے کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی۔

دیوداس گاندھی مہاتما گاندھی کے قابل ترین فرزند تھے لیکن اُنہیں عملی سیاست میں اتنا درک حاصل نہیں تھا جتنا صحافت میں تھا، چنانچہ مشہور اخبار

"ہندوستان ٹائمز" (دہلی) کے نامور ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ زیورخ (سوئٹزرلینڈ) میں ملاقات ہوئی جہاں انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ اُن کی بیگم بھی ہمراہ تھیں اور لڑکا بھی۔ کانفرنس میں مَیں نے یہ قرارداد پیش کی تھی کہ سائنس سے تعلق رکھنے والی خبروں کے سلسلہ میں ایک خصوصی خبر رساں ادارہ قائم کیا جائے۔ یہ قرارداد منظور ہو گئی تو اُنہوں نے میرے پاس آکر خراجِ تحسین ادا کیا۔ اس سے تعلق کی ایک صورت پیدا ہو گئی اور جب مدیرانِ جرائد سوئٹزرلینڈ کی چار روزہ سیاحت پر گئے تو ہم دونوں کا خاصا ساتھ رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں لحمِ خنزیر سے اجتناب کا قائل تھا۔ وہ ہر قسم کے گوشت سے متنفّر تھے۔ چنانچہ ہر کھانے پر کانفرنس والوں کو ہم دونوں اپنی ضرورت سے آگاہ کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شراب نوشی ناپسند فرماتے تھے اور میرے نزدیک شراب حرام تھی۔ اس لئے مشروبات کے سلسلے میں دونوں احتیاط کرتے تھے۔ سیاحت کے دوران میں جب ویلائے کے علاقے میں پہنچے، تو وہاں سب کو ایک "مقدس شراب" پیش کی گئی۔ ہم نے انکار کیا تو لوگوں نے کہا۔ یہ وہ شراب نہیں ہے اور اس سے ہلکا سا سرور ہی آتا ہے۔ ہم نے کہا تھوڑا سرور آئے یا زیادہ نشہ آئے یا نہ آئے۔ ہم شراب نوشی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں اور اُن کی بیگم اور لڑکے کے لئے خاص طور پر سیب کا رس منگوایا گیا۔ افسوس، اس کے کچھ عرصہ بعد جناب دیوداس گاندھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دیوبندر ستیارتھی ایک دراز ریش پنجابی نوجوان تھے۔ لاہور کی تہذیبی زندگی میں بہت نمایاں تھے۔ اُن کا واحد مشغلہ یہ تھا کہ گاؤں گاؤں جا کر لوک گیت

جمع کریں۔ چنانچہ اس موضوع پر انگریزی، اردو اور پنجابی میں کتابیں بھی لکھیں افسانہ نگار بھی تھے۔ لیکن اس صنف میں زیادہ نام نہ پایا اور لوک گیتوں ہی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس ضمن میں رام سرن پنڈت نے بہت محنت کی تھی۔ اور "پنجابی گیت" کے نام سے ایک سو اکتیس پنجابی گیتوں کا ایک مجموعہ چھاپا تھا لیکن دیویندر ستیارتھی نے اس صنف میں تخصّص پیدا کیا اور وہ بھی اتنا کہ لوگ رام سرن پنڈت کو بھول گئے۔ جن دنوں میں "پنچایت" کا مدیر تھا میں نے اُن سے لوک گیتوں پر کچھ مضامین لکھوائے اور چھاپے۔ وہ دفتر میں بھی آیا کرتے تھے۔ اور ویسے بھی اُن سے ملاقات تھی۔ پھر اُنہوں نے اپنا دائرہ کار وسیع کیا۔ اور پورے برعظیم میں پھرتے رہے۔ چنانچہ اُنہیں برعظیم کے عوامی ادب میں ایک اتھارٹی مانا جاتا تھا۔

ویسے اُن میں ایک خرابی تھی۔ جس کا انکشاف بہت بعد ہوا۔ اُنہیں انگریزی کم آتی تھی۔ کم از کم اتنی نہیں آتی تھی کہ لوک گیتوں کو بامحاورہ اور شاعرانہ انگریزی زبان میں منتقل کر سکیں۔ اس لئے میں حیران تھا کہ وہ ترجمہ کیسے آسانی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔ جب مجھے اس موضوع سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور میں نے اس پر پنجاب پبلک لائبریری میں جا کر انگریزی زبان کے نصف صدی پُرانے رسالوں کا مطالعہ شروع کیا جن میں بعض انگریزوں نے پنجابی لوک گیتوں پر مضامین لکھے تھے تو معلوم ہوا کہ تراجم والے صفحات غائب ہیں۔ دریافت کیا کہ مجھ سے پہلے کس نے ان فائلوں سے استفادہ کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ کارستانی دیویندر ستیارتھی کی ہے۔ گویا اُنہوں نے کئے کرائے ترجمے نقل کر لئے اور ثبوت بھی غائب کر دیا۔

ذوالفقار احمد بخاری کو دنیا زیڈ اے بخاری کے نام سے جانتی تھی۔ وہ سید احمد شاہ بخاری (پطرس) کے ~~بڑے~~ چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی نے تدریس علم و فضل اور ڈپلومیسی میں نام پایا اور "پطرس کے مضامین" کی بدولت اُردو کے مزاحیہ ادب میں مستقل مقام حاصل کر لیا اور چھوٹے بھائی نے ریڈیائی نشریات اور موسیقی میں شہرت حاصل کی۔ پاکستان بننے سے پہلے دونوں بھائی آل انڈیا ریڈیو میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ بڑے بھائی کا بڑا عہدہ چھوٹے بھائی کا چھوٹا عہدہ۔ اسی بنا پر لوگ آل انڈیا ریڈیو کو "بی بی سی" کا نام دیتے تھے یعنی بخاری برادرز کارپوریشن۔ لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ آگاہ تھے کہ "کارپوریشن" اندر سے کھوکھلی تھی کیونکہ چھوٹا بھائی انگریز افسر فیلڈن سے گٹھ جوڑ کر کے بڑے بھائی کے خلاف "چکر" چلاتا رہا۔ چنانچہ آخرِ کار بڑے بھائی نے حجاب محسوس کیا اور محکمہ تعلیم میں واپس آ کر گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بن گئے اور میدان چھوٹے بھائی کے لئے کُھلا چھوڑ دیا۔

والد مرحوم کی دوستی بڑے بھائی سے تھی۔ ذوالفقار بخاری سے بھی تعلقات تھے لیکن کم۔ وہ بخاری صاحب کے الفاظ احمد شاہ بخاری کے لئے استعمال کرتے تھے اور چھوٹے بھائی کو ذوالفقار ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ بھئی احمد شاہ بخاری "صحیح بخاری" ہیں۔ اس لئے اُنہیں بخاری کہتا ہوں۔

ابھی ابھی ذوالفقار بخاری کی شادی کا واقعہ یاد آ گیا۔ کیونکہ کچھ عجیب سا تھا۔ اس زمانے میں میں چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتا ہوں گا کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی۔ بخاری برادران دن کے بارہ بجے ہمارے گھر آئے اور

والد صاحب سے کہا کہ ذوالفقار کی شادی ہے۔ اور براتیوں کی شدید ضرورت ہے۔ وہ پوچھنے لگے۔ کب؟ معلوم ہوا کہ برات کی روانگی آدھ گھنٹے میں ہونے والی ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ براتی کہاں سے لائے جائیں۔ چار براتی ہمارے گھر سے نکل آئے۔ والد صاحب۔ میرے بڑے بھائی، میرے خالو اور میں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر تقریباً تین کاریں آئیں اور دس بارہ افراد پر مشتمل برات روانہ ہو گئی۔ شہر کے اندر کہیں جانا تھا۔ وہاں پہنچے تو انتظام بہت زیادہ لوگوں کا تھا اور برات مختصر تھی۔ چنانچہ ہر باراتی کے سامنے دو دو روسٹ مرغ رکھے تھے اور میں حیران تھا کہ ان سے کیا سلوک کروں؟

جب پاکستان بنا تو ہمارے حصّے میں صرف دو ریڈیو سٹیشن آئے ایک لاہور میں، ایک پشاور میں۔ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ سٹیشن موجود تھا۔ لیکن یہ سب چھوٹے سٹیشن تھے اور ان سے بیک وقت نہ خبریں نشر ہو سکتی تھیں۔ نہ کوئی اور پروگرام۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں ریڈیو پاکستان کی زمامِ قیادت ذوالفقار بخاری کے ہاتھ میں تھی۔ اُنہوں نے دن رات محنت کی اور ان چھوٹے سٹیشنوں کے ذریعے سے جتنی خدمت ہو سکتی تھی وہ بڑے والہانہ جذبے کے ساتھ کی اور آہستہ آہستہ ریڈیو پاکستان کو وہ مقام دلایا جو آج اُسے حاصل ہے۔

ذوالفقار بخاری شاعر بھی تھے لیکن اصل مہارت اُنہیں براڈ کاسٹنگ میں حاصل تھی۔ اُن کی آواز بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ پھر اُنہیں فن موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا اور پاکستان میں موسیقی کو جو مقام حاصل ہوا۔ اُس میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا اور پھر وہ محفل آرا بھی تھے۔ دوستوں کے دوست تھے اس لئے اپنی موت سے بہت سوں کو سوگوار کر گئے۔

رام سرن پنڈت کو اس جہان سے گزرے چالیس برس گزر چکے ہیں۔ میرے ذہن کے پردے پر اُن کی تصویر موجود تو ہے لیکن بڑی مدھم۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ روٹی کمانے کے لئے وکالت کی چکی پیستے رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بڑے جذب و جنوں کے ساتھ پنجاب کے لوک گیت اکٹھے کرتے رہے اور "پنجابی گیت" کے نام سے اُن کا ایک مجموعہ مرتب کر کے چھاپ دیا۔ اُنہوں نے دیباچے کے آخر میں لکھا:

"یہ گیت میں نے کس طرح اکٹھے کئے اور کہاں سے اکٹھے کئے یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ دس گیارہ سال گیت جمع کرتا رہا۔ صرف گیت لکھنے کے لئے کئی دیہات بھی گیا۔ بیاہ شادی کی تقریبات میں شامل ہوا۔ بہت سی عورتوں کی منت سماجت کرنی پڑی اور بڑی محنت اور مشکل سے ڈیڑھ ہزار کے قریب گیتوں کا ذخیرہ جمع کر لیا۔ گیت اکٹھے کرنے میں جو مشکل پیش آتی ہے اُس کا اندازہ آپ کو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ کبھی دس بارہ گیت اکٹھے کرنے کی کوشش کریں۔ پڑھی لکھی بہنوں کو تو گیت آتے ہی نہیں اور ان پڑھ بہنیں شرم کے مارے آپ کے سامنے بولیں گی ہی نہیں اور اگر بولنا شروع کر دیں تو جھٹ بھول جائیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ گیت صرف اُس صورت میں یاد آتے ہیں جب دو چار عورتیں اکٹھی ہوں اور سُر کے ساتھ گانا شروع کریں اور جب وہ گا رہی ہوتی ہیں تو اُس وقت لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر بہنوں اور بھائیوں نے اس محنت کی قدر فرمائی۔ تو میں اس سلسلے میں دو چار اور کتابیں بھی پیش کروں گا۔" بہر حال قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ زیادہ کتابیں چھاپیں۔ اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ جو ڈیڑھ ہزار گیت اُنہوں نے جمع کئے۔ وہ کہاں گئے۔ کیونکہ پہلی کتاب "پنجابی گیت" میں تو

صرف ایک سو اکتیس گیت موجود ہیں۔ ہمیں یہ کتاب ردّی میں بکتی ہوئی کتابوں میں ملی۔ چونکہ اس موضوع سے دلچسپی تھی اس لئے فوراً خرید لی اور جلد کرا کے محفوظ کر لی۔ اور اب ایک حالیہ لطیفہ ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۹۶۵ء میں نیاز محمد خان صاحب کی نیشنل کونسل آف میوزک (پاکستان) نے یہی کتاب "پنجابی لوک گیت" کے نام سے بڑی شان و شوکت اور خصوصی اہتمام کے ساتھ چھاپ دی اور اس میں استاد اللہ بخش کی چند تصاویر بھی شامل کر دیں اور جناب نیاز محمد خان نے اپنے دیباچے میں لکھا کہ یہ ایک قلمی مسودہ تھا جو جناب زیڈ اے بخاری نے کونسل کو دے دیا۔ مرتب کا نام لالہ رام سرن داس بتایا گیا۔ حالانکہ موصوف نہ "لالہ" تھے، نہ "داس" اور وہ اپنا نام رام سرن پنڈت لکھتے تھے، دوسرا ظلم یہ کیا کہ رام سرن پنڈت کا دیباچہ تو درج کر دیا لیکن اس کے نیچے اُن کے نام کی جگہ صرف مؤلف لکھ دیا اور کتاب کے اندرونی یا بیرونی سرِورق پر مؤلف کا نام نہ دیا گویا یہ بھی ایک قسم کی متروکہ املاک تھی۔ جو اپنے نام الاٹ کر لی گئی۔ بہرحال یہ کیا کم کارنامہ ہے کہ اس کتاب کو نابود ہونے سے بچا لیا۔

رام سرن پنڈت کو میں نے بچپن میں اپنے ماموں عبداللطیف مشتاق کے ہاں دیکھا تھا اور صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بہت خوش مزاج، بلکہ ہنسوڑ آدمی تھے۔ اور یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اُنہوں نے ایک دو ادبی رسالوں میں پنجاب کے لوک گیتوں پر مضامین بھی لکھے تھے۔

چودھری رحمت علی تحریک پاکستان کے اوّلین بانی تھے۔ اُن کے ساتھ میرا کوئی براہِ راست رابطہ نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں "پاکستان" کے تصور

سے اُس وقت آشنا ہوا، جب چودھری رحمت علی نے لاہور کے اخباروں میں سرونٹس آف اسلام لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے میرا نام اور پتہ دیکھ کر ۱۹۳۵ء میں اپنا وہ پہلا پمفلٹ بھیجا جو دو سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اُس پر اُن کے نام کے ساتھ بانی "پاکستان نیشنل مومنٹ" لکھا ہوا تھا۔ تحریک کے اس اوّلین منشور میں کہا گیا تھا کہ برِعظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی ایک وفاقی حکومت قبول نہ کریں، کیونکہ اس سے مسلمان مستقل طور پر ایک غیر مسلم اکثریت کے غلام بن جائیں گے۔ اس کی جگہ یہ تجویز پیش کی گئی کہ پنجاب، سرحد، سندھ، کشمیر اور بلوچستان پر مشتمل ایک الگ اور آزاد مملکت بنائی جائے اور اس مملکت کا نام پاکستان رکھا جائے۔ محرک نے وجہِ تسمیہ یہ بیان کی کہ اس نام میں مجوزہ مملکت کے تمام اجزا کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ "پ" پنجاب کے لئے، "الف" افغانیہ کے لئے (جو صوبہ سرحد کے لئے استعمال کیا گیا) "ک" کشمیر کے لئے، "س" سندھ کے لئے اور "تان" بلوچستان کے لئے۔ منشور کا عنوان تھا NOW OR NEVER "ابھی ورنہ کبھی نہیں"۔ اس میں مسلم لیگ کے زعما کے خلاف بہت لے دے کی گئی کہ اُنہوں نے گول میز کانفرنس میں فیڈریشن کا اصول قبول کر کے مسلمانوں کے لئے مستقل غلامی خرید لی ہے۔ یہ منشور فل سکیپ سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھا اور صفحۂ اوّل کے بالائی گوشے میں "پاکستان" کا نقشہ سبز رنگ میں بنا ہوا تھا۔ اس منشور کی سینکڑوں کاپیاں چودھری رحمت علی وقتاً فوقتاً کیمبرج سے یہاں کے نوجوان مسلمان کارکنوں کو بھیجتے رہے۔ اس سے ایک تو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن متاثر ہوئی، دوسرے چودھری رحمت علی کے حامیوں نے لاہور میں مجلسِ کبیر پاکستان قائم کر دی اور مختلف شہروں میں اس کی شاخیں بھی کھل گئیں۔

جب آل انڈیا مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی تو چودھری رحمت علی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور ایک کتابچہ لکھا جس کا نام تھا "ملتِ اسلامیہ اور ہندوستانیت کا خطرہ" اسے انہوں نے "پاک پلین" کا دوسرا حصّہ قرار دیا۔ اس میں تجویز پیش کی کہ برعظیم میں تین اسلامی مملکتیں قائم کی جائیں۔ اوّل: پاکستان، جس میں پنجاب، سرحد، سندھ، کشمیر اور بلوچستان شامل ہوں۔ دوم: بنگستان، جس میں بنگال اور آسام کے مسلم اکثریتی علاقے شامل ہوں۔ سوم: عثمانستان جس کا مقصد یہ تھا کہ نظام حیدر آباد دکن (عثمان علی خان) کو آزاد اور خود مختار حکمران مان لیا جائے اور آبادیوں کا ایک ایسا تبادلہ ہو کہ حیدر آباد دکن کے تمام ہندو وہاں سے نکل کر آس پاس کے علاقوں میں آباد ہو جائیں اور ان علاقوں کے مسلمان حیدر آباد دکن میں بسا لئے جائیں اور اس طرح حیدر آباد دکن ایک مسلم اکثریتی مملکت بن جائے۔ ۱۹۴۲ء میں پاک پلین کا تیسرا حصّہ منظرِ عام پر آیا۔ اس کتابچے کا نام "ملّت اور اس کا مشن" تھا۔ اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اقلیتی اندازِ فکر ترک کر دیا جائے۔ اقلیتی اندازِ فکر کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان، بنگستان اور عثمانستان میں غیر مسلم اقلیتوں کو برداشت کر لیا جائے اور باقی ہندوستان میں جو ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں، وہ مستقل اقلیت کی صورت اختیار کر لیں۔ چودھری رحمت علی کا موقف یہ تھا:

اوّل: برعظیم کے ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کو ہندو اکثریتی صوبوں میں رہنے دینا پاگل پن ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قومی اور ملّی حیثیت سے محروم ہو جائیں گے اور ان کا نام ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گا۔

دوم: مسلمان مملکتوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو برداشت کرنا ملّت سے

غدّاری کے مترادف ہے۔ کیونکہ وہ کبھی ہماری وفادار نہیں رہ سکتیں اور ہمارے لئے ہمیشہ خطرے کا موجب بنی رہیں گی۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے چودھری رحمت علی کی تجویز یہ تھی کہ پاکستان، بنگستان اور عثمانستان کے علاوہ ہندوستان میں بشمول سری لنکا سات چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستیں بنا دی جائیں مثلاً یوپی کے مسلمان کل آبادی کا پندرہ فی صد ہیں۔ ان کے لئے پندرہ فی صد علاقے پر مشتمل "حیدرستان" کے نام سے ایک مسلمان ریاست بنا دی جائے۔ اسی طرح باقی ہندوستان میں صدیقستان، فاروقستان، معینستان ، ماپلستان، صافیستان اور ناصرستان کے نام سے ریاستیں بن جائیں اور اس کے بدلے میں مسلمانوں کی تین بڑی مملکتوں۔ پاکستان، بنگستان اور عثمانستان میں تین چھوٹی ہندو ریاستیں بنا دی جائیں۔ چودھری رحمت علی چاہتے تھے کہ تین بڑی مسلمان مملکتوں اور سات چھوٹی مسلمان ریاستوں پر مشتمل مسلمان قوموں کی ایک پاک دولتِ مشترکہ بنا دی جائے

"ریاست در ریاست" کا تصور بہ ظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے اور اس کی قباحتوں سے بھی انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ تجویز ۱۹۲۵ء میں ہندوؤں کے قومی رہنما لالہ لاجپت رائے بھی پیش کر چکے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کا جو منصوبہ تجویز کیا۔ اس میں کہا کہ "مسلمانوں کی ایک مملکت مغربی پنجاب سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ہو ۔ دوسری مملکت مشرقی بنگال ہو۔ اور اگر مسلمان چاہیں تو ہندوستان کے باقی حصوں کے اندر جہاں جہاں وہ اکٹھے بستے ہوں۔ وہاں وہاں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا لیں۔ چودھری رحمت علی نے "ریاست در ریاست" کا تصور شاید اسی منصوبے سے لیا ہو۔

۱۹۴۶ء میں چودھری رحمت علی نے ایک کتاب "پاکستان" کے

نام سے لکھی۔ اس میں پاکستان کی وجہ تسمیہ کو قدرے نیا رنگ دے دیا۔ اُنہوں نے لکھا: "پاکستان فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کا لفظ ہے۔ یہ ہمارے اصلی ایشیائی اور ہندوستانی اوطان کے اسماء کے حروف پر مشتمل ہے۔ یعنی پنجاب، افغانیہ (صوبہ سرحد)، کشمیر، ایران، سندھ (بشمول کچھ اور کاٹھیاواڑ)، توخارستان، افغانستان اور بلوچستان۔ اس کا مطلب ہے پاک لوگوں کی سرزمین، یعنی جو لوگ روحانی طور پر پاک اور صاف ہیں۔" (صفحہ ۲۲۵)

چودھری رحمت علی کا منصوبہ قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ لیکن مرحوم کے کردار کی اہمیت سے انکار کرنا تاریخ کو جھٹلانے کے برابر ہے۔ کیونکہ وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے وطن سے دور یہ تحریک باقاعدہ انداز میں چلائی۔ پاکستان کو اس کا نام دیا۔ اس خیال کا اظہار کیا کہ آبادیوں کا تبادلہ کرنا پڑے گا۔ اور یہ، کہ اقلیتیں اوّل تو وفادار ثابت نہیں ہوں گی اور اُنہیں رکھا بھی گیا تو اُن کا نام مٹ جائے گا۔ افسوس، جب چودھری رحمت علی نے اُس وطنِ عزیز میں قدم رکھا جس کی تشکیل میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا اور جو اُن کی جوانی کے بہترین ایام کی آرزوؤں کا مرکز تھا تو اُن کا شایانِ شان استقبال نہ کیا گیا اور اُنہیں چھ ماہ کے اندر اندر وطنِ عزیز کو خیر باد کہنا پڑا۔ اور اُنہوں نے دیارِ غیر میں جان ہار دی۔ اور ہمارے لئے یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ اُن کی نعش کے تابوت کو پاکستان لاسکیں۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ بیشتر مورخین تاریخِ پاکستان کی تاریخ میں خواہ ان کا تذکرہ نہ کریں۔ یا تذکرے کو چند سطروں میں محدود کر دیں۔ آخرِ کار تاریخ میں اُنہیں اپنا مقام حاصل ہو کر رہے گا۔

رئیس احمد جعفری نے یوں تو ناول بھی لکھے اور تاریخ کے موضوع پر بھی نامہ فرسائی کی اور بھاری بھرکم کتابیں مرتب کر ڈالیں۔ لیکن اُن کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ علی برادران پر بہت سا تاریخی مواد یکجا کر دیا، اور اس طرح تحقیق کے لئے آسانی پیدا کر دی کہ وہ ان دو بڑے رہنماؤں کے سیاسی مقام کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکیں۔ یہ بیان سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ موصوف کو رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم سے کوئی قرب رہا۔ کیونکہ جب محمد علی نے انتقال کیا تو رئیس احمد جعفری کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُنہوں نے عنفوانِ شباب ہی میں محمد علی کو اپنا آئیڈیل بنا لیا اور "سیرت محمد علی" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) نے چھاپ دی۔ اس کے بعد جب مولانا محمد سرور جامعی نے دو جلدوں میں "مضامین محمد علی" کے نام سے ایک کتاب چھاپی تو "ہمدرد" کے جو اداریے وہ شامل نہ کر سکے اُنہیں رئیس احمد جعفری نے "مقالات محمد علی" کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر دیا۔ اور اس طرح محمد علی کی تمام قابل ذکر اُردو تحریریں محفوظ ہو گئیں۔ یہی نہیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں رئیس احمد جعفری نے محمد علی اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ "کامریڈ" میں شائع شدہ مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ چھاپ دیا۔ اور اُن کے بھائی مولانا شوکت علی کے سوانح بھی مرتب کر دیئے۔ شوکت علی کے ساتھ اُنہیں یقیناً کسی قدر قرب حاصل رہا۔ رہے رئیس احمد جعفری کے ناول یا تاریخ کے موضوع پر کتابیں۔ تو وہ "فنی" اعتبار سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں کیونکہ یہ تو محض قوتِ لایموت کے حصول کی غرض سے لکھی گئی تھیں۔

مولانا عبدالمجید سالک ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے ایک مدت بیت گئی لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ کوئی ساعت ایسی نہیں گزری جب باپ کی یاد دل سے محو ہوئی ہو۔ ہر تیسرے چوتھے دن خواب میں دیکھنا تو میری فطرت میں داخل ہے۔ ایک عادت بن چکا ہے لیکن دن کے وقت بھی، لکھتے لکھتے، پڑھتے پڑھتے، کاروبارِ زندگی کی ہمہ ہمی میں اُن کی تصویر لپک لپک کر سامنے آتی ہے اور جب موسم بدلتا ہے، ستمبر کا مہینہ آتا ہے تو یادیں مچل مچل کر سامنے آتی ہیں، کہ جب اُن کی زندگی کا آخری ستمبر آیا۔ تو کچھ مسرور تھے، کہتے تھے شکر ہے۔ اب موسمِ گرما کی تپش کم ہے اور ستمبر ٹھنڈے موسم کی نوید لا رہا ہے۔ اب طبیعت میں انشراح پیدا ہوگا۔ اور سچ پوچھیئے تو طویل بیماری کے بعد انشراح کا آغاز ہو گیا۔ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے لیکن کم کم۔ بورڈ آف فلم سنسر کے اجلاسوں میں جانے لگے۔ کہ اچانک معبودِ حقیقی کا بُلاوا آگیا۔ اور اُن کی یہ آرزو بھی پوری ہو گئی کہ موت آئے۔ تو بیماری کے بستر پہ نہ آئے۔ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جائے۔

اُنہیں موت سے کوئی خوف نہ تھا۔ وفات سے ایک آدھ مہینہ پہلے کی بات ہے۔ کانپور کے روزنامہ "سیاست" کے مدیر عیادت کو آئے اور کہنے لگے بعض لوگ موت سے گھبراتے ہیں۔ والد نے کہا بھائی! ہم نے تو بوریا بستر باندھ رکھا ہے اور پا بہ رکاب بیٹھے ہیں۔ یوں بھی دو تین سال پہلے ایک دوست سے کہہ رہے تھے کہ ساٹھ سال نارمل زندگی کے ہیں اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ زندگی کو طول دیتا ہے تو یہ محض رعایت ہوتی ہے گویا ہمیں YEARS OF GRACE مل رہے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صُورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صُورت

جو کوٹھی اُنہوں نے ۱۹۳۲ئ میں بنائی تھی اور جس کے لئے بڑی محنتِ شاقہ سے کام لیا تھا۔ اب اُس میں دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں اور سچ پوچھیئے تو بزرگوں کا سایہ جب تک رہے، ہر طرف برکت کا بسیرا ہوتا ہے لیکن سایہ اُٹھے۔ تو برکت بھی اُٹھ جاتی ہے اور دیواریں بھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اپنوں کے ساتھ فاصلے بڑھ جاتے ہیں اور زندگی ایک نیا رُوپ لے لیتی ہے سالوں کے گزرنے کے ساتھ معًا اپنی بزرگی کا احساس ہوتا ہے اور غالبؔ کا یہ شعر زیادہ یاد آتا ہے کہ

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیئے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور بزرگی کے احساس کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی یاد تازہ آتی ہے کیونکہ ڈرامے کا آنے والا سین گزشتہ سین کی یاد دلاتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ ہمارے بعد حالات کون سی کروٹ، کون سا رنگ لیں گے؟

میرے باپ کی زندگی ایک کامیاب زندگی تھی۔ وہ اُنچاس سال کی عمر میں بیٹوں، بیٹیوں کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے۔ شہرت بھی خوب پائی۔ ایسی شہرت، جو کوئی مرنجاں مرنج، شگفتہ مزاج، نامور ادیب شاعر اور صحافی پا سکتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں "فانوسِ خیال" کے نام سے ایک ماہانہ ادبی مجلّہ نکالا۔ پھر مولوی سید ممتاز علی کے نامی گرامی ہفت روزوں "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" کی ادارت کرتے رہے۔ امتیاز علی تاجؔ سے دوستی کی بنا پر اُن کے ماہانہ ادبی مجلّے "کہکشاں" کی ادارت میں مدد دیتے

رہے۔ مولانا ظفر علی خان "زمیندار" میں لے گئے۔ تو اداریہ نگاری اور کسی قدر وقائع نگاری کا سلسلہ چلا۔ اور وہ بھی تحریکِ خلافت کے طوفانی سیاسی دور میں جب سامراجی عتاب کی بجلیاں آوارہ تھیں اور حریت پسندوں کا یہ عالم تھا کہ ؎

شوقِ زنجیر کسے فصلِ بہاراں میں نہیں
ان دنوں کون سا وحشی ہے جو زنداں میں نہیں

ایک باغیانہ اداریے کی پاداش میں ایک سال کے لئے پسِ دیوارِ زنداں چلے گئے۔ لوٹے تو پھر وہی کنج قفس، پھر وہی صیاد کا گھر۔ وہی صحافت وہی سیاست ۱۹۲۷ء کے آغاز میں مولانا ظفر علی خان سے اختلاف ہوا۔ اپنے رفیقِ کار مولانا غلام رسُول مہر اور سارے عملہ ادارت اور عملہ کتابت کے ساتھ مستعفی ہوئے۔ احباب سے سو سو روپے "چندہ خریداری تاحینِ حیات" لے کر چار ہزار روپے جمع کئے اور "انقلاب" کا ڈول ڈال دیا یہ اخبار بائیس سال تک جاری رہا۔ مہر کی افتتاحیہ نگاری اور سالکؔ کی شذرہ نگاری اور افکار و حوادث نگاری اور حضرت علامہ اقبالؒ کی سرپرستی کی بدولت اخبار چل نکلا۔ "انقلاب" مسلمانوں کی علیحدہ سیاست کا سب سے بڑا نقیب تھا۔ خطبۂ الہ آباد کے حق میں سالکؔ نے دس بارہ اداریئے قلمبند کئے اور قرار دادِ لاہور سے کئی سال پہلے "پاکستان" کے حق میں سینکڑوں مضامین چھاپے اور اس طرح رائے عامہ کو ہموار کیا۔ ان کا مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" خاصے کی چیز تھی۔ اُردو صحافت میں مستقل مزاحیہ کالم کی ریت اسی سے پڑی۔ بقول رئیس احمد جعفری "بڑے بڑے ثقہ لوگ اُن کے افکار و حوادث مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ مولانا محمد علی تک اُن کی ظرافت نگاری کے قائل تھے اور چٹخارے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔"

۱۹۳۰ء میں سرزمین کشمیر میں شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس نے تحریکِ کشمیر کا آغاز کیا تو سالکؔ نے ڈٹ کر اس کی ترجمانی فرمائی۔ پہلے "انقلاب" سے پانچ ہزار روپے کی ضمانت طلب ہوئی۔ اس کے بعد کشمیر میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اس پر انہوں نے "کشمیری مسلمان" کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ اس کا داخلہ بند ہوا، تو "مظلوم کشمیر" کے نام سے اخبار نکال لیا۔ اور جب اس کا بھی داخلہ بند ہوگیا۔ تو "مکتوبِ کشمیر" کے نام سے ایک پوسٹر نما اخبار جاری کیا۔ اس کا بھی داخلہ بند کر دیا گیا لیکن مسلم کانفرنس کے کارکن اس کے پرچے کسی نہ کسی طرح حاصل کر کے راتوں رات مختلف شہروں کی دیواروں پر چسپاں کر دیتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد اگر کسی اخبار نے اربابِ اقتدار کے احتساب کا سلسلہ شروع کیا، تو وہ "انقلاب" ہی تھا لیکن اسے مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف ہندوستان نے داخلہ بند کر دیا۔ دوسری طرف قیوم وزارت نے صوبہ سرحد میں داخلہ ممنوع قرار دیا، حکومتِ پنجاب نے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا، حکومت نواز اخبارات نے اخبار فروشوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ "انقلاب" کی فروخت بند کر دیں۔ مالی حالت ویسے بھی ناقابلِ رشک تھی۔ اس لئے حکمران طبقے کی ان یورشوں کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا اور اخبار کو بند کرنا پڑا۔

سالکؔ کو "انقلاب" کی بندش کا قدرتی طور پر افسوس تھا۔ لیکن الحمدللہ کہ پیسے کی قلت کے باوجود اور ضرورت کی شدت کے باوجود انہوں نے پنجاب کے ایک مشہور سیاست دان کی یہ پیش کش ٹھکرا دی کہ پندرہ ہزار نقد لے لو "انقلاب" کی ملکیت مجھے منتقل کر دو اور پانچ پانچ سو روپے ماہانہ

پر دونوں (مہر و سالک) ملازم ہو جائے۔ یہ رقوم آج تھوڑی نظر آتی ہیں۔ اُس زمانے میں خاصی بڑی تھیں۔ کیونکہ سب سے متمول اُردو اخبار "امروز" کے مدیر مولانا چراغ حسن حسرت کی تنخواہ ساڑھے چار سو روپے ماہانہ تھی۔ والد بزرگوار نے غیرت کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ پیش کش مسترد کر دی اور اپنا مالی مستقبل بظاہر تاریک کر لیا۔ لیکن قدرت نے خوشحالی کا سامان فراہم کر دیا۔ خواجہ ناظم الدین نے دو ہزار روپے ماہانہ پر کراچی بُلا لیا۔ کام کیا تھا؟ گھر بیٹھے دو تین تعمیری موضوعات پر مختصر مقالہ نویسی۔ کراچی کی ثقافتی زندگی میں اُن کے دم قدم سے ایک نئی رونق پیدا ہو گئی اور جب چند سال بعد لاہور کو لوٹے تو ریلوے سٹیشن پر ادیبوں اور اخبار نویسوں نے شاندار استقبال کیا۔ اور پھر آخری دم تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اخبار نویس کا اخبار بند ہو جائے۔ تو وہ گوشۂ گمنامی میں چلا جاتا ہے۔ لیکن ان کا معاملہ مختلف تھا۔ اخبار بند ہوا تو اُن کی صحافتی زندگی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ جلسوں اور کانفرنسوں اور مشاعروں کی صدارت کے لئے پہلے سے زیادہ مدعو ہونے لگے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بار پھر شعر و شاعری کا دور چلا اور چلتے چلتے وہ اپنے مداحین کو فارسی اور اُردو میں بہت سی غزلوں اور نظموں سے محظوظ کر گئے۔

زندگی بھر نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اُنہیں آگے بڑھنے میں مدد دی۔ احمد ندیم قاسمی اس کی زندہ مثال ہیں۔ "امروز" کے مدیر ظہیر بابر کو بھی وہی میدانِ صحافت میں لائے۔ مجید لاہوری کے فن میں جو نکھار پیدا ہوا۔ اُس میں بھی اُن کی مدد شاملِ حال تھی۔ حمید نظامی کو بھی پہلی بار اُنہی نے "انقلاب" کے ذریعے سے متعارف کرایا۔ بے شمار

جواں سال شاعروں کے کلام میں اصلاح دی۔ بہت سے نوجوان انشاپردازوں کی تحریروں کی نوک پلک درست کی۔ اُن کی تصانیف اور تالیفات پر تعارفی مقدمے قلمبند کئے۔ وہ شعروشاعری میں کلاسیکی انداز کے حامی تھے، لیکن جدید شاعری کا بھی خیر مقدم کیا۔ پاکستان بننے کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی نہ صرف صدارت کی بلکہ جب اس انجمن پر کوئی مشکل وقت آیا اور بعض ادیب زیرِ عتاب آئے، وہ اُن کے حق میں سینہ سپر ہو گئے اور اربابِ حکومت کی غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے ہر ممکن سعی فرمائی۔ وہ بنیادی طور پر اُردو کے ادیب اور انشاپرداز تھے، لیکن اُردو کو قومی زبان قرار دینے کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کی نشرواشاعت کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد "پنجابی" کے نام سے جو سب سے پہلا ادبی رسالہ نکلا۔ اُس کی سرپرستی فرمائی۔ خود بھی پنجابی زبان میں لکھا۔ اور دوسرے اُردو ادیبوں کو بھی اس طرف مائل کیا۔

میں نے باپ سے وراثت میں جو مادی وسائل پائے۔ اُن سے قطع نظر مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تدریسِ صحافت اور کالم نویسی کے ذریعے سے صحافی باپ کا فرزند ہونے کا حق ادا کر رہا ہوں۔ اور تصنیف و تالیف بھی وراثت میں پائی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ بعض چیزیں وراثت میں نہیں پا سکا مثلاً" شاعری، جو کبھی میرے بس کا روگ نہیں رہا۔ مزاح نگاری، جس کی جرأت پیدا نہیں ہوئی، بے سہارا لوگوں کی سفارش، کیونکہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ سفارش ماننے کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔

والد مرحوم کے کردار کے بعض پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر

ہیں۔ محنت اور مسلسل محنت، رزقِ حلال اور قناعت۔ الحمدللہ کہ میں نے ان خصوصیات کو اپنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن میں باپ کا نعم البدل نہ بن سکا ہوں، نہ بن سکوں گا۔ اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ قانونِ فطرت کا یہی تقاضا ہے۔ اگر شخصیات کے فرزند نعم البدل بن سکتے تو آج قحط الرجال کا وہ عالم نہ ہوتا جس کا ہم رونا روتے ہیں۔ ویسے میں "قحط الرجال" کا اتنا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک ہر دور اپنے مزاج کے مطابق "رجال" پیدا کرتا ہے۔ آج کے رجال کا موازنہ پچھلے دور کے رجال سے کرنا درست نہیں۔ کیونکہ ہر دَور کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اپنے حالات ہوتے ہیں۔ اور انہی کے بطن سے رجال جنم لیتے ہیں۔

مولانا علم الدین سالک فارسی زبان وادب کے پروفیسر، تاریخ کے رسیا اور قومی کاموں میں پیش پیش تھے۔ وہ شعر کہتے تھے، یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن تخلّص کے گنہگار ضرور تھے۔ وہ کیوں؟ شاید بچپن میں شعر کہتے ہوں۔ ساری عمر اسلامیہ کالج لاہور سے وابستہ رہے۔ اور المیہ ملاحظہ ہو کہ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے طلبہ کو انگریزی زبان میں فارسی پڑھاتے تھے۔ اُس میں اُن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور تعلیمی نظام کا تھا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم تھی۔ نثر میں تو کام بن جاتا تھا لیکن یہ کم بخت شاعری ایسی ہے کہ اِسے انگریزی زبان میں پڑھانا کارے دارد ہے۔ آپ خود ہی تصوّر کر لیجئے کہ حافظ، سعدی اور عُرفی کی غزلوں کا حشر کیا ہوتا ہوگا! یہی وجہ ہے کہ بی۔ اے تک فارسی پڑھنے کے باوجود مجھے اس زبان پر دسترس حاصل نہ ہو سکی۔ ویسے جو لوگ اب اُردو ذریعۂ تعلیم کی بدولت فارسی کا ایم۔ اے کر

لیتے ہیں۔ اُن کا حال بھی کچھ ہم سے بہتر نہیں ہے۔

مولانا سالک تاریخ کے دلدادہ تھے۔ لیکن شوخیٔ قسمت ملاحظہ ہو۔ کہ وہ تاریخ کی تدریس پر کبھی مامور نہ ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ اُنہوں نے فارسی کا ایم۔ اے کر رکھا تھا۔ تاریخ کا ایم۔ اے نہیں کیا تھا۔ اور تاریخ کی تدریس کے لئے یہ ایک لازمی تعلیمی وصف ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اُنہوں نے تاریخ پر سینکڑوں مقالے لکھ ڈالے۔ وہ برّعظیم کی تاریخ میں خصوصی درک رکھتے تھے۔ مسلمان سلاطین کے خلاف ہندو مؤرخین نے جو افسانے تراش رکھے تھے۔ اُن کا تار و پود بڑی شرح و بسط کے ساتھ بکھیر دیا۔ انار کلی کے قصّے کو سب سے پہلے انہوں نے غلط اور بے بنیاد ثابت کیا۔ اور وہ بھی تاریخی شواہد کی بنا پر۔ یہ الگ بات ہے کہ کئی سال بعد یہ ایجاد ڈاکٹر باقر نے اپنے نام الاٹ کرا لی اور از بسکہ اُنہیں پبلسٹی میں کمال حاصل رہا ہے۔ اس لئے لوگ یہی سمجھنے لگے کہ یہ ڈاکٹر باقر کی ادرِجنل تحقیق کا نتیجہ ہے۔

مولانا علم الدین سالک کی سب سے بڑی خوبی وہ دلِ دردمند تھا جو اُن کے سینے میں تادمِ مرگ دھڑکتا رہا۔ وہ قوم کے خیر خواہ تھے۔ اسے آگے بڑھانے کی دُھن سمائی ہوئی تھی۔ کلاس میں بھی لبا اوقات تدریس سے انحراف کر کے قوم کی حالتِ زار پر اشک فشاں ہوتے۔ اس کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے۔ طلبا کو اسلامی سیاست کی طرف راغب کرتے۔ اخلاقی قدروں کے نشو و ارتقا کی تلقین فرماتے۔ اُن کے شاگردوں میں سے بہت سوں نے سیاست اور صحافت میں قدم رکھا اور اسی خلوص اور دردمندی کے ساتھ، جو اُستاد نے اُن میں پیدا کر دی۔ لاریب، اب

ایسے اساتذہ بہت کم ملتے ہیں۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے
اُن کے جلسوں میں جاتے۔ تقریریں کرتے۔ اور اُن کی پشت پناہی کرتے
اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے قومی تحریکوں میں جو نمایاں کردار ادا کیا اُس
کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی کہ انہیں ایک ایسے استاد کی سرپرستی حاصل تھی
جو تدریس کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی خصوصی اہمیت دیتا تھا۔

مولانا سالک کی شامیں نگینہ بیکری میں بسر ہوتی تھیں اور وہ بھی
عبداللہ قریشی کی رفاقت میں۔ عبداللہ قریشی اُن سے اس حد تک منسلک
تھے کہ اُن کے بغیر مولانا سالک کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک علمی
دوستی تھی جس نے ذاتی تعلق کا بھی رُوپ لے لیا۔ مولانا جہاں جاتے عبداللہ قریشی
ہم رکاب ہوتے۔ طُرّہ یہ کہ مُدّتوں مقالہ نگاری بھی اکٹھے ہی کی۔ ہر مضمون پر دونوں
کے اسمائے گرامی درج ہوتے تھے۔ دونوں کی سوچ ایک تھی نقطۂ نگاہ
ایک تھا۔ دلچسپی کے موضوعات مشترک تھے۔ یک جان و دو قالب کا محاورہ
شاید انہی کے لیئے بنا تھا۔ بس ایک فرق تھا کہ مولانا خطیب بھی تھے۔ اور
عبداللہ قریشی میری طرح محض مقالہ نگار!

مولانا کا چہرہ پُرسکون تھا لیکن اُن کے سینے میں بہت سے طوفان
بھی اُٹھتے رہے۔ ایک بیٹے کی علالت ناقابلِ علاج تھی۔ ایک بیٹے پر
ابتلا آئی اور ایک عرصے کے بعد اس سے نجات ملی۔ اسلامیہ کالج کی خدمت
ساری عمر کی۔ لیکن بڑھاپا آیا۔ تو اگرچہ تدریسی صلاحیتوں کی بنا پر نوجوانوں پر
بھاری تھے لیکن سبکدوش کر دیئے گئے اور کوئی پنشن بھی نہ ملی۔ آخری عمر میں
اُن سے جب ملاقات ہوئی۔ انہیں ماحول سے نالاں پایا۔ اُن سے بہت سے
کام لئے جا سکتے تھے لیکن زمانے کا انداز ایسا بدل چکا تھا کہ کام لینے اور کام

کرنے کے لئے بھی سیاست درکار تھی۔ اور وہ اس قسم کی سیاست سے عاری تھے۔ اُنہوں نے دو چار کتابیں کسی زمانے میں لکھی تھیں۔ اس کے بعد تصنیف و تالیف کے مواقع ہی نصیب نہ ہوئے۔ اگر کوئی ناشر یا نیم سرکاری ادارہ توجہ دیتا تو اُن کے قلم سے چند اچھی کتابیں نکل آتیں! آخری عمر میں کہتے تھے کہ میں اپنے شاگردوں کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ خدا جانے لکھنی شروع کی یا نہ کی۔ ویسے اُن کے ہزاروں شاگرد زندگی کے مختلف دوائر میں موجود ہیں۔

سردار سجان سنگھ کو ہمارے ہم عصروں میں سے کون فراموش کر سکتا ہے۔ لحیم و شحیم، مائل بہ فربہی، گورا رنگ، سفید، دراز اور نورانی داڑھی، سوٹڈ بوٹڈ، ہر لحظہ متبسّم، مرفع الحال، لیکن اس حد تک متلوّن مزاج کہ بیٹوں سے روٹھ کر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہوسٹل میں آ بسے۔ آل انڈیا پریم سبھا کے صدر۔ لیکن اس میں "آل انڈیا" والی کوئی بات نہیں تھی، کیونکہ نہ کوئی شاخ تھی۔ نہ ارکان کی فہرست۔ نہ صدر کے سوا کوئی اور عہدے دار گویا لفظی اور معنوی اعتبار سے ؎

وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

پریم سبھا کا مطلب یہ نہ سمجھ لیجئے کہ دلوں سے پریم کی پینگیں بڑھائی جاتی تھیں۔ پریم سبھا کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں پریم اتنا بڑھایا جائے۔ کہ من تو شدم، تو من شدی کا عالم طاری ہو جائے سردار صاحب کہتے تھے۔ کہ سارے سیاسی مسائل کا واحد حل یہی ہے چنانچہ میں نے اُن سے پریم کیا۔ اُنہوں نے مجھ سے۔ میرے دوستوں نے

اُن سے پریم کیا۔ اور اُنہوں نے میرے دوستوں سے پریم فرمایا۔ اور پریم کا طریقہ کیا تھا؟ چائے، کیک اور پیسٹری۔ اور وہ بھی اُن کے پلّے سے۔ بڑے بھولے بھالے، بڑے معصوم بزرگ تھے۔ مہینے کے آخر میں جب ہماری جیبیں خالی ہو جاتی تھیں۔ تو پریم سبھا کی تحریک سے خود بخود ہمدردی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم سردار صاحب سے کہتے۔ پریس کانفرنس کیجیئے۔ وہ چائے کی محفل برپا کرتے، ہم اس سے لُطف اندوز ہوتے اور دوسرے دن کسی اخبار میں اُن کے نام سے دو سطریں شائع کر دیتے تھے اور سردار صاحب اس پر پھُولے نہ سماتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی اخبارات کے دفاتر کا چکر کاٹتے۔ ہر جگہ ان کا خیر مقدم ہوتا سب اکٹھے ہو جاتے۔ کہ اُن کی باتیں نقلِ محفل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد اُن کی یاد مدّتوں ستاتی رہی۔ کاش! وہ یہیں رہ جاتے!

خان سعادت علی خان موچی دروازے کے بالکل سامنے پیلے رنگ کی ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ ان کا شمار لاہور کے روسا میں ہوتا تھا۔ ان کے دادا ڈپٹی برکت علی سر سید احمد خان کے ساتھی تھے۔ اور اُنہوں نے پنجاب میں سرسیّد کی تحریک کو مقبول بنانے میں بہت مدد دی تھی۔ برکت علی اسلامیہ ہال کے نام سے کون واقف نہیں۔ یہ ہال ڈپٹی برکت علی ہی نے بنایا تھا۔ اس لئے اُن کے نام سے منسوب ہے۔ خان سعادت علی خان انجمن اسلامیہ کے سیکرٹری تھے، وہی انجمنِ اسلامیہ، جو بادشاہی مسجد کے انصرام کی بھی ذمہ دار تھی اور برکت علی اسلامیہ ہال کی بھی۔ ان کی خدمت میں مَیں ایک ہی بار حاضر ہوا۔ وہ بھی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے

سلسلے میں۔ اُنہوں نے مالی امداد تو فراہم نہ کی۔ البتہ یہ بات مان لی کہ جب ہمیں جلسوں کے لئے حبیبیہ ہال نہ مل سکے تو برکت علی اسلامیہ ہال استعمال کر لیا کریں۔ چنانچہ علامہ اقبال رح کی وفات پر تعزیتی جلسہ وہیں کیا۔ ملک برکت علی کے شہید گنج بل کے حق میں اجتماع بھی وہیں ہوا اور ایک بار حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کی صدارت میں ایک جلسے کے لئے بھی یہی ہال حاصل کر لیا۔ ہال اور اس کے ریڈنگ روم کا اہتمام ایک ریٹائرڈ بزرگ خان البشیر حسین خان کرتے تھے۔ اُنہوں نے بے روزگار مسلمانوں کو روزگار دلانے کے لئے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی۔ اُس کا دفتر بھی وہیں تھا اور پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے میں اُن سے اس معاملے میں بھی تعاون کرتا رہا۔ پاکستان بننے سے چند سال پہلے خان سعادت علی خان انتقال کر گئے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ خدا جانے اب اس گھر میں کون رہتا ہے۔

قاضی سعید الدین احمد پی۔ ایچ۔ ڈی تھے۔ ماہر تعلیمات تھے پنجاب یونیورسٹی میں مدتوں شعبہ جغرافیہ کے صدر رہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ادب اور سیاست میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور تو اور اُنہوں نے دیوانِ غالب کی شرح لکھ ڈالی جو ہر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ اور سیاست میں دلچسپی کی یہ کیفیت تھی کہ جب پاکستان بننے کے چار سال بعد تک بھی آئین بننے کی کوئی صورت نہ نکلی تو اُنہوں نے ایک آئین خود بنا ڈالا اس سلسلے میں مَیں نے پنجاب یونیورسٹی جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے اہتمام میں اُن کا لیکچر کرایا۔ جس کی خوب پبلسٹی ہوئی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون

سُنتا تھا۔ اور سیاست دانوں کو کب یہ منظور تھا۔ کہ اُن کے دائرۂ اختیار میں کوئی پروفیسر مداخلت کرے۔

ڈاکٹر قاضی سینئر اساتذہ میں شامل تھے۔ یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط اور قوانین اور طریقِ کار میں فنی دسترس اُنہیں حاصل تھی۔ اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ اس لئے اکثر وہ یونیورسٹی کے مختلف اداروں کو اپنی رائے سے متاثر کرتے تھے۔ کئی سال تک اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ ایک دفعہ میں بھی رکنِ مجلسِ عاملہ منتخب ہوا۔ قاضی صاحب نے ریٹائرمنٹ کی عمر بڑھانے کے سلسلے میں ایک قرارداد پیش کی شاید ساٹھ سال تجویز کر رہے تھے۔ میں نے کہا ستّر سال کر دیجئے۔ وہ پہچان گئے کہ مذاق کرتا ہے۔ کہنے لگے۔ خورشید! تم اس وقت جوان ہو۔ ہماری عمر کو پہنچو گے تو اس انداز میں سوچو گے۔ میں نے کہا بالکل غلط۔ میں اس انداز میں کبھی نہیں سوچوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس عہد پر قائم ہوں۔ کیونکہ جب ۱۹۷۵ء کے آغاز میں حکومت نے ریٹائرمنٹ کی عمر گھٹا کر ساٹھ سے اٹھاون سال کر دی تو میں نے اس کے حق میں لکھا۔ کیونکہ میرے نزدیک نئے اور تازہ خون کے داخلے اور نئے پروفیسروں کی ترقی کے دروازے زیادہ سے زیادہ کھُلنے چاہئیں۔

اب تو یونیورسٹی میں حالات بہت بدل گئے ہیں لیکن جس زمانے میں ڈاکٹر قاضی جیسی شخصیتیں موجود تھیں۔ عہدوں کے انتخاب میں بڑے پروفیسر مقابلہ نہیں کرتے تھے بلکہ معاملات آپس میں خوش اسلوبی سے طے کر لیا کرتے تھے۔ پھر ڈاکٹر قاضی اور اُن کے ساتھیوں میں ایک وضعداری بھی تھی۔ جو اب ناپید ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب وہ رکھ رکھاؤ باقی ہے۔

نہ ادب اور لحاظ!

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ قاضی صاحب کو ریٹائرمنٹ کے بعد مشیرِ امورِ طلبہ کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ نارمل حالات میں یہ ایک اچھی خدمت تھی۔ لیکن جب نظم و ضبط کا شیرازہ بکھر گیا تو پھر یہی عہدہ جان جوکھوں کا کام بن گیا۔ چنانچہ قاضی صاحب کو یہ عہدہ چھوڑنا پڑا۔

سردار سکندر حیات خان پنجاب کے نامور سیاست دان اور متحدہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ چار سال بعد اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اچھے خاصے زمیندار ہونے کے باوجود مقروض ہیں چنانچہ یہ قرضہ اُن کے فرزند سردار شوکت حیات نے ایک عرصے کے بعد بیباق کیا۔ صرف یہی حقیقت یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ سردار سکندر حیات کا سیاسی کردار کتنا بلند تھا۔ وہ اقتدار کے اوج پر رہے۔ اشارہ کرتے، تو مالی مشکلات حل ہو جاتیں لیکن وہ دَور اور قسم کا تھا۔ نظم و نسق آلائشوں سے پاک تھا۔ وزیروں کے لئے آمدنی کے ناجائز وسائل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ بات بھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ سردار سکندر حیات کے عہد میں زرعی آبادی کی بہبود کے لئے جو قوانین نافذ ہوئے۔ ان میں زمینداروں، کسانوں اور کاشت کاروں کو بہت فائدہ پہنچا اور بڑے زمینداروں کو نقصان، ایک قانون کے ذریعے سے پُرانی رہن شدہ اراضی بغیر کسی معاوضے کے واگزار ہو گئیں۔ اس قانون کے نفاذ سے سردار صاحب کے خاندان کو تین لاکھ روپے کی اراضی سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے اور ملک خضر حیات خان کو پچاس ہزار روپے

کی اراضی سے۔

سردار سکندر حیات خان کسی زمانے میں حکومتِ پنجاب کے ریونیو ممبر تھے۔ اسی بنا پر وہ ایک بار چار مہینے کے لئے پنجاب کے گورنر بنے جب ۱۹۳۵ء کے قانونِ حکومتِ ہند کے تحت صوبوں میں دو عملی کا رواج ختم ہوا۔ اور مکمل طور پر ذمہ دار پارلیمانی حکومت قائم ہونے لگی تو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی قیادت میاں فضل حسین نے سنبھالی۔ اُنہوں نے ایسا بندوبست کیا کہ سردار سکندر حیات خان ریزرو بنک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر بن گئے اور ملک فیروز خان نون لندن میں ہندوستانی ہائی کمشنر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اس بندوبست کی شانِ نزول یہ تھی کہ میاں فضل حسین شخصیات کے تصادم کے بغیر پنجاب میں کام کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال وہ فوت ہو گئے اور سردار سکندر حیات خان یونینسٹ پارٹی کے لیڈر چن لئے گئے اُن کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ تین حلقوں سے کامیاب ہو گئے اور نوّے کے لگ بھگ مسلم نشستوں میں سے بیاسی نشستوں پر قابض ہو گئے مسلم لیگ سے اختلاف میاں فضل حسین کے وقت سے چلا آتا تھا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کا لکھنؤ سیشن ہوا تو سردار سکندر حیات اپنے تمام ساتھیوں سمیت اس میں شامل ہو گئے اور سکندر جناح مفاہمت کی روشنی میں ان سب نے لیگ سے وابستگی اختیار کر لی۔

سر سکندر اصول کے پکے تھے اور اس معاملے میں انگریز حاکموں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں مسلم لیگ کی پالیسی یہ تھی کہ من حیث القوم جنگی مساعی میں تعاون نہ کیا جائے۔ البتہ انفرادی طور پر مسلمان چاہیں تو ایسی سرگرمیوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔

اُس زمانے میں وائسرائے نے ایک نیشنل ڈیفنس کونسل بنائی جس میں سر سکندر مولوی فضل الحق (وزیرِ اعلیٰ بنگال) اور بیگم شاہ نواز کو بھی نامزد کر دیا اس پر قائداعظم نے ان تینوں سے باز پُرس کی۔ سر سکندر نے کہا کہ مجھے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صوبے کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے نامزد کیا گیا ہے۔ جب قائداعظم نے اس بات کا تحریری ثبوت فراہم کر دیا کہ اُنہیں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے نامزد کیا گیا ہے تو اُنہوں نے فوراً استعفےٰ دے دیا جس پر انگریز حاکم بہت پریشان ہوئے مولوی فضل الحق اور بیگم شاہ نواز اپنے مسلک پر اڑے رہے۔ چنانچہ دونوں کو مسلم لیگ سے نکلنا پڑا۔

سر سکندر حیات کے عہد میں خاکساروں کا وہ سانحہ ہوا جس میں بہت سے خاکسار شہید ہو گئے۔ اس سے اُن کی ہر دلعزیزی میں فرق آ گیا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ جب دورانِ جنگ میں نیم عسکری تنظیموں پر پابندی کا فیصلہ انگریزوں نے اعلیٰ سطح پر کر لیا۔ تو سر سکندر حیات نے علامہ مشرقی کو نجی طور پر بلایا۔ اور اُن سے پوچھا کہ وہ کس حد تک پابندی برداشت کر سکیں گے۔ دونوں کے درمیان یہ مفاہمت ہو گئی کہ وردی باقی رہے گی اور "اخوت" کا سُرخ نشان بھی لیکن پریڈ اور بیلچہ برداری اور مصنوعی جنگوں پر پابندی لگ جائے گی۔ چنانچہ سر سکندر نے خاطر جمع ہو کر احکام صادر کر دیئے جو ہندو اور مسلمان دونوں تنظیموں پر لاگو تھے۔ علامہ مشرقی نے عہد شکنی فرمائی اور لاہور میں محاذ آرائی شروع کر دی۔ اور خاکساروں نے تین سو تیرہ افراد کا جلوس نکالا اور وہ متشدد ہو گیا تو لامحالہ گولی چلانی پڑی۔ اس حادثے کے تین دن بعد مسلم لیگ کا وہ تاریخی لاہور

سیشن ہوا جس میں قرار داد لاہور منظور ہوئی۔ اس قرار داد کی ترتیب میں سر سکندر بھی شامل تھے۔ جتنی دیر سر سکندر زندہ رہے قائدِ اعظم کے ساتھ انہیں لڑانے کی ہر ترکیب ناکام ہوئی۔ لیکن جب وہ فوت ہو گئے۔ اور ملک خضر حیات ٹوانہ وزیرِ اعلیٰ بنے تو لیگ یونی نسٹ مناقشت کے دروازے کھل گئے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو سانحۂ جلیانوالہ باغ کے ہیرو تھے۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں برطانوی سامراج کے مخالف عوام کے اجتماع پر جنرل ڈائر نے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا نشانہ مسلمان ہیں یا ہندو یا سکھ۔ سب کے خون سے دھرتی لالہ رنگ ہو گئی۔ اس المیّے نے سارے برِعظیم کو ہلا کر رکھ دیا کیونکہ اس کی گونج دور دور تک سنائی دی۔ وہ دن اور آج کا دن سانحۂ جلیانوالہ باغ کو آزادی کی جدوجہد میں ایک اہم سنگِ میل قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی شخصیت زیادہ گھن گرج کے ساتھ اُبھری۔ تو اس سانحہ کے نتیجے میں۔ ڈاکٹر کچلو کی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ تحریکِ خلافت میں پسِ دیوارِ زنداں رہے۔ واپس آئے تو ہندو مسلم اتحاد کا بخار اُتر چکا تھا۔ ہندوؤں نے سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں شروع کر دیں۔ سنگھٹن کا مطلب ہے تنظیم۔ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو ایک سیاسی جماعت میں منظم کر کے ہندو راج کے نصب العین کی طرف پیش رفت کی جائے۔ شدھی کا مطلب ہے تطہیر یا پاکیزگی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برِعظیم کے مسلمانوں کو ہندو بنا لیا جائے تاکہ ہندوستان میں دو قومیں نہ رہیں بلکہ صرف ایک ہندو قوم باقی رہے۔ ان تحریکوں کے مقابلے میں بعض مسلمان رہنماؤں نے تنظیم

اور تبلیغ کی تحریکوں کا آغاز کیا۔ ان دونوں میں سیف الدین کچلو پیش پیش تھے۔ بلکہ اُنہوں نے امرتسر سے "تنظیم" کے نام سے ایک اُردو روزنامہ بھی جاری کیا تھا۔ اُس زمانے میں مسلمان لیڈر بیک وقت کانگرس اور مسلم لیگ کے رُکن ہوتے تھے۔ یہی کیفیت ڈاکٹر کچلو کی بھی۔ ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ دو متوازی دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک کو جناح لیگ کہتے تھے۔ دوسری کو شفیع لیگ۔ جناح لیگ کے صدر قائد اعظم تھے اور سیکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ شفیع لیگ کے صدر سر محمد شفیع تھے اور سیکرٹری حضرتِ علامہ اقبال۔ ۱۹۳۰ء میں یہ دونوں لیگیں متحد ہو گئیں اور "جناح کے چودہ نکات" قومی مطالبات قرار دیئے گئے۔ ڈاکٹر کچلو نے لیگ چھوڑ دی اور نمک کے مسئلے پر گاندھی جی نے سول نافرمانی کی جو تحریک چلائی تھی اُس میں شامل ہوئے اور جیل بھی گئے اور تادمِ آخر کانگرس سے وابستہ رہے۔

۱۹۷۵ء میں امرتسر ٹیلی ویژن سے سانحہ جلیانوالہ باغ پر ایک پروگرام دکھایا گیا۔ اور جہاں بوڑھے شہریوں نے اپنے تاثرات بیان کئے۔ وہاں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو بھی خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ اس پر زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکلا ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کیوں؟ اس لئے، کہ کانگرس کا نمایاں رہنما ہونے کے باوجود محض مسلمان ہونے کے جرم میں ۱۹۴۷ء میں امرتسر کے غیر مسلموں نے اُن کی املاک پر قبضہ جما لیا۔ اُنہیں بال بچوں سمیت جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اور وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں یہ آرزو سینے میں لے کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، کہ اُنہیں اپنے

شہر امرتسر میں رہنے کا حق مل جائے۔ کانگریس کے اس عظیم رہنما پر کیا بیتی؟ اس کی داستان بیگم انیس قدوائی کی زبانی دہلی کے ہفت روزہ "سب ساتھ" میں پڑھی۔ تو دل بھر آیا۔ کہ مجھے کسی زمانے میں اُن سے شرفِ نیازمندی حاصل تھا اور سیاسی عقیدہ مختلف ہونے کے باوجود کبھی کبھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا وہ لاہور میں ٹمپل روڈ پر ایک پُرانی کوٹھی کے نصف حصّے میں رہتے تھے۔ گفتگو کے بہت دھیمے تھے۔ دل نوازیٔ سخن اُن کا طرّہ امتیاز تھا۔ لیکن خطابت میں غضب کے بلند آہنگ اور شعلہ بار تھے۔ اور اُن میں ایک ایسی مقناطیسی کشش موجود تھی۔ جو بہت سوں کو قرب پر مجبور کر دیتی تھی۔

بیگم انیس قدوائی بتاتی ہیں کہ ڈاکٹر کچلو دو سال تک دہلی کے ایک کمرے میں سکونت پذیر رہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا گھر الاٹ ہوا جس میں آپ، بیگم کچلو اور سات جوان لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کچلو بیرسٹر تھے لیکن عمر اور حالات، دونوں وکالت کے پیشے میں حائل تھے۔ اُنہوں نے سیاست میں کچھ حصّہ لیا۔ لیکن مسلسل مایوسیوں نے بے بس کر دیا۔ موت سے پہلے اُن کی یہ کیفیت بیگم انیس قدوائی کی زبانی ملاحظہ ہو:۔ "مرض الموت میں بھی اُن کے اطمینان وسکون میں فرق نہ آیا۔ ایک بار میں نے پوچھا کہ آپ امرتسر جائیں تو کون منع کر سکتا ہے؟ جواب دیا۔ نہیں۔ میں نہیں جا سکتا۔ وہ لوگ نہیں چاہتے۔ شاید کوئی اس راز سے پردہ اٹھا دے۔ کہ وہ کیوں پھر اُس سرزمین پر قدم نہ رکھ سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود طے کر لیا تھا کہ وہ ماضی کو بھلا دیں گے۔ اس طرح، کہ پھر تذکرہ بھی گوارا نہیں ہوگا۔ شاید چوٹ گہری تھی۔ زخم کا منہ بند نہ ہُوا۔ مگر اُن کی زبان بند ہوگئی۔ اُولاد کمیونزم کی طرف چلی گئی۔ آپا (بیگم کچلو) کی دبی ہوئی مذہبیت

اُبھر آئی۔ اور ڈاکٹر صاحب بالکل انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ عجیب بے گانہ پن تھا۔ زندگی کی کشتی بے پتوار بہہ رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے اطمینان سے پڑھ رہے تھے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے بہتیرے لوگوں کا یہی حال ہوا۔ کسی کو غم و غصّہ نے پاگل کر دیا۔ کوئی رجائیت و قنوطیت کے مارے دم بخود ہو گیا۔ کسی نے آستانِ حکومت پر جُبّہ سائی شروع کر دی۔ کوئی صرف داغ ہائے سینہ کا شمار کرتا رہ گیا۔ تھوڑے ہی سے تھے جو سینہ سپر رہ سکے۔ آخر کو ہارے ہوئے لوگ تھے نا؟ اپنوں سے بھی، غیروں سے بھی"!

نواب سر شاہ نواز خان آف ممدوٹ سر سکندر کے ساتھی اور یونینسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ لیکن انہیں مسلم لیگ سے لگاؤ تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علامہ اقبال کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ اُن سے پہلی ملاقات تب ہوئی جب علامہ اقبال کے ارشاد پر حمید نظامی کی رفاقت میں مَیں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ابتدائی اخراجات کے لئے ایک سو روپے کا چیک دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک طویل وعظ ارشاد فرمایا۔ کہ ہم عام سیاسی کارکنوں سے الگ رہیں کیونکہ وہ پیسے کے معاملے میں خوش معاملت سے عاری ہیں۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا۔ کہ ایک بار میرے ہاں تحریکِ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں گنے چُنے سیاسی راہنماؤں کا اجلاس ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ کارروائی خفیہ رکھی جائے گی لیکن اُسی شام کو ساری کارروائی سی آئی ڈی والوں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے بعد دو ایک اور ملاقاتیں ہوئیں لیکن گہرا رابطہ اس وقت استوار ہوا جب پیر علی محمد راشدی کچھ عرصہ ممدوٹ ولا کی انیکسی

میں مقیم ہوئے۔ میرا راشدی صاحب کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ اور اس بہانے نواب صاحب سے بھی ملاقات رہتی تھی۔ دو چار مرتبہ کھانا بھی وہیں کھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ممدوٹ سکیم کا بہت چرچا تھا۔ اس سکیم کے خالق "ایک پنجابی" (میاں کفایت علی) تھے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کے لئے ایک کتاب "کنفیڈریسی آف انڈیا" کے نام سے لکھی۔ نواب صاحب نے اسے اپنے اخراجات سے چھپوا دیا۔ چونکہ مصنّف کا صرف قلمی نام درج تھا اور ناشر کی حیثیت سے نواب صاحب کا نام کتاب پر لکھا ہوا تھا اس لئے یار لوگوں نے اِسے ممدوٹ سکیم کا نام دے دیا۔ نواب صاحب پاکستان کے حامی تھے۔ اور "کنفیڈریسی آف انڈیا" کا منصوبہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی ہند اور شمال مشرقی ہند کے صوبوں سے ہندوؤں کے غالب اکثریتی علاقے نکال کر دو خود مختار مملکتیں بنائی جائیں اور ہندوستان کے باقی صوبوں کے ساتھ مل کر ایک کنفیڈریشن بنالی جائے جس کے اختیارات اتنے محدود ہوں کہ اگر گزارہ نہ ہو سکے۔ تو علیحدگی ممکن ہو۔ انہی دنوں سر سکندر کی ریجنل سکیم بھی منظرِ عام پر آئی۔ لیکن ہم لوگ اس کے خلاف تھے۔ کیونکہ اس میں شمال مغربی ہند کے علاقے میں راجستھان اور بیکانیر بھی شامل کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ اور اس سے مسلم اکثریت تھوڑی رہ جاتی تھی۔ چنانچہ اس سکیم کی مخالفت میں جو پروپیگنڈا ہوا۔ اُس کا ایک سرچشمہ ممدوٹ وِلاّ بھی تھا۔

نواب صاحب میں سیاسی سمجھ بوجھ زیادہ نہیں تھی۔ لیکن نیکی اور خلوص کی بنا پر مسلم لیگ کے سیاسی حلقوں میں محبوب تھے۔ پھر وہ مختلف جماعتوں اور تنظیموں کی مالی امداد بھی فرماتے تھے۔ اس سے بھی اُن کے احترام میں

اضافہ ہوا۔ جن دنوں سر سکندر پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ یہ بات سُننے میں آئی کہ مسلم لیگ سے نواب صاحب کے لگاؤ کی ایک وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے ایک بار موصوف کو نہایت سنجیدگی سے بتایا کہ مجھے آپ کے چہرے پر یہ بات لکھی نظر آتی ہے کہ آپ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ پر فائز ہوں گے۔ واللہ اعلم یہ بات کہاں تک درست ہے۔ بہر حال نقلِ کفر کفر نہ باشد۔

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین لاہور کے نامور بیرسٹر تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے نامی گرامی رہنماؤں میں شامل تھے۔ مسلم لیگ میں ایک اہم حیثیت کے مالک تھے۔ مسلمانوں نے پنجاب میں تعلیمی دائرے میں جو ترقی کی اُس میں خلیفہ شجاع الدین کا بہت حصّہ تھا۔ شمالی ہند کی واحد اسلامی درس گاہ اسلامیہ کالج کی مجلسِ منتظمہ کے صدر تھے۔ اس درس گاہ نے جتنی ترقی کی اُس کا سہرا انہی کے سر تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ہندو غالب تھے۔ خلیفہ صاحب سنڈیکیٹ اور سینیٹ کے رکن رہے۔ اور ہمیشہ بڑی دلیری کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتے رہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کی زیادہ تر سرگرمیاں تعلیمی ترقی پر مرتکز تھیں۔ خلیفہ صاحب اس انجمن میں بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے اور اُن کی ذاتِ بابرکات سے بہت سوں کو فائدہ پہنچا۔

پاکستان بننے سے پہلے اُنھوں نے الیکشن لڑے لیکن ناکام رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی بڑی طرح مسلّط تھی۔ لیگ بے اثر جماعت تھی۔ اور اُنھوں نے لیگ کا دامن نہ چھوڑا۔ اگر وہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتے تو وزارت پر بھی فائز ہو سکتے تھے۔ کیونکہ پارٹی کو شہری

مسلمانوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ اصول کے معاملے میں کسی سمجھوتے کے قائل نہیں تھے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ پنجاب اسمبلی کے سپیکر چُنے گئے۔ اُن سے پہلے سپیکر کے عہدے پر چوہدری شہاب الدین جیسی دبنگ شخصیت فائز رہی اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا۔ کہ ایسی دبنگ شخصیت دوبارہ نہیں اُبھرے گی لیکن ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین اُن سے بھی بہتر سپیکر ثابت ہوئے۔

شجاع الدین تاریخ کے مشہور پروفیسر کالج میں ہم جماعت تھے۔ ذہین لیکن خاموش، قابل لیکن گوشہ نشین۔ میں ہیڈر قسم کا آدمی تھا۔ اس لئے وہ میرے ڈھب کے آدمی نہیں تھے۔ بہر حال صاحب سلامت رہی۔ وہ تاریخ میں ایم۔ اے کر کے دیال سنگھ کالج میں پروفیسری پر فائز ہو گئے اور کردار وہی رہا جو پہلے تھا کہ زندگی میں ہنگامہ خیزی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ البتہ کام کا بڑا ذوق تھا۔ پروفیسر سید عبدالقادر کی رفاقت میں کتابیں بھی لکھیں اور مقالے بھی۔ سید صاحب اللہ کو پیارے ہوئے تو شجاع الدین اکیلے رہ گئے۔ اتنے میں زندگی کے ایک غیر متوقع دائرے میں کسی قدر مستقل رابطے کی صورت پیدا ہوئی۔ یتیم خانہ دارالفرقان سے اُنہیں بھی دلچسپی تھی۔ مجھے بھی۔ مجلسِ منتظمہ میں وہ بھی شامل تھے، میں بھی۔ میں "دارالفرقان" نامی ماہانہ دینی اور علمی مجلّے کی ادارت اعزازی طور پر کرتا تھا اور اس کام میں شجاع الدین یوں شریک ہوتے کہ ہر شمارے کے لئے ایک تحقیقی مقالہ فراہم کر دیتے تھے۔ "دارالفرقان" کے ناظم چودھری فخرالدین احمد راجوری کے وہ بھی مدّاح تھے اور میں بھی اور کوئی ان کی مخالفت کرتا تھا تو ہم دونوں

سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ شجاع الدین کی سب سے بڑی ادا یہ تھی کہ تحقیقی کام جذب و جنون کے ساتھ کرتے چلے جاتے تھے۔ لیکن ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صِلے کی پروا

کبھی اپنے آپ کو اُبھارنے کی کوشش نہ کی۔ اُنہیں کھانسی بہت آتی تھی۔ اور دو ایک بار تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ زیادہ کھانسی سے اُن کا منہ سُرخ ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گلے کا سرطان تھا۔ مجھے اس کا خیال تک نہیں تھا اس لئے جب سُنا کہ ہسپتال میں داخل ہیں۔ تو سوچا "چیک اپ" مقصود ہو گا یہی وجہ ہے کہ وہ ملے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کی بہن محمودہ سوز شام ہمدرد میں نظر آتی ہیں تو شجاع کا چہرہ بھی سامنے آجاتا ہے۔

دیوان آتم آنند شرر اُن دنوں والدِ مرحوم کے گہرے دوستوں میں شامل تھے۔ جب میں سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ پنجاب کے ایک نامور ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زندگی کا آغاز اُردو شاعری سے کیا۔ شررؔ کا تخلّص اختیار کیا اور والد سے کلام میں اصلاح لیتے رہے۔ شاعری سے جی اُچاٹ ہوا۔ تو تھیٹر اور فلم کی دنیا میں قدم رکھا۔ ہندوستانی تھیٹر کے احیا کی غرض سے ایک کمپنی بنائی۔ بیس کے قریب کھیل لکھے اور سٹیج کئے اور برِ عظیم کا دورہ بھی کیا۔ اُردو زبان میں ایک فلمی ماہ نامہ نکالا جس کا نام "شبستان" تھا۔ بہت خوبصورت رنگین تصاویر سے مرصّع۔ اعلیٰ درجے کے علمی مضامین پر مشتمل۔ عمدہ کاغذ، عمدہ کتابت اور عمدہ طباعت کا حامل۔ یہ رسالہ زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ لیکن میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایسا اچھا فلمی ماہنامہ آج تک نہیں نکلا کیونکہ اس کا مزاج متین اور سنجیدہ تھا۔ فلم کے فنّی پہلوؤں پر خاص توجہ دیتا تھا

اور سکینڈل سے پاک تھا۔

بولتی فلموں کے آغاز میں دیوان شرر کا کردار نمایاں تھا۔ سب سے پہلی فلم کا نام "کرما" تھا۔ یہ انگریزی زبان میں بنائی گئی اور اس کی کہانی شرر نے لکھی تھی۔ اس کے بعد دیوان شرر ہی نے اسے اُردو زبان میں پیش کیا۔ موصوف کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ بی بی سی نے جو پہلا اُردو ڈرامہ نشر کیا۔ وہ انہی نے لکھا تھا۔ اس کا نام تھا "راجپوت کا عہد"۔ غالباً ۱۹۳۱ء میں دیوانِ شرر برطانیہ چلے گئے۔ وہاں انگریزی زبان میں افسانہ نگاری شروع کر دی اور اتنے کامیاب ہوئے کہ اُن کی کاوشیں "ڈیلی میل"، "ڈیلی ایکسپریس" اور "ڈیلی ہیرلڈ" جیسے وقیع اخباروں میں جگہ پانے لگیں۔ وہیں اپنی زندگی بھر کا پہلا اور آخری ناول GONG OF SHIVA لکھا۔ جو ایک بڑے ناشر نے چھاپ دیا اور لارڈ کرزن کے سوانح نگار مارکوئیس آف زیٹ لینڈ نے اس کی تقریظ لکھی۔ اس پر برعظیم کے اخبارات میں تبصرے والد مرحوم نے شائع کرائے۔ پاکستان بننے سے چند سال پہلے دیوان شرر ہندوستان کو لوٹے۔ بمبئی کو سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ فلمیں تیار کیں اور بڑا نام پایا۔

آغا شورش کاشمیری ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ کیا دبنگ قسم کے صحافی تھے۔ اپنے پرائے سب ڈرتے تھے کیونکہ وہ کسی کی مخالفت پہ آتے تو جملہ حدود پھلانگ جاتے تھے اور حمایت پہ آتے تو اس میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔ میں بھی دو چار مرتبہ اُن کی نکتہ چینی کا نشانہ بنا۔ حمید نظامی کی وفات سے کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے اُنہوں نے پہلی مرتبہ میرے خلاف مہم چلائی۔ میرا قصور یہ تھا کہ کسی تحریر میں مولانا ظفر علی خان

کے بارے میں کوئی ایسا فقرہ آگیا۔ جو میرے نزدیک تو بے ضرر تھا لیکن شورش کے نزدیک توہین آمیز تھا۔ چنانچہ وہ شروع ہو گئے۔ کوئی پانچ ہفتے یہ سلسلہ جاری رہا۔ تو حمید نظامی نے مجھے فون کیا۔ اور حال پوچھا۔ میں نے شورش کے بارے میں شکایت کی۔ تو کہنے لگے۔ شورش کو یہ مہم ختم کرنی پڑے گی۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے۔ آخر اُسے اخبار بھی تو چلانا ہے۔ اگر صرف تمہارا ہی تذکرہ رہا تو لوگ بور ہوں گے۔ دوسرے دن نظامی صاحب کا فون پھر آیا۔ کہنے لگے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ذرا "نوائے وقت" کے دفتر میں آنا۔ میں چلا گیا۔ حسبِ دستور چائے نوشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ شورش کاشمیری آگئے ہیں۔ میں نے اُٹھنا چاہا۔ نظامی صاحب نے روک لیا۔ تھوڑی سی گپ لگائی۔ اور صلح کرادی۔ اس کے چند دن بعد نظامی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۱۹۶۳ء میں میری کتاب "صحافت پاکستان و ہند میں" منظرِ عام پر آئی۔ پانچ ہزار روپے کا داؤد انعام ملا تو شورش نے ایک وسیع محاذ پر مخالفت شروع کر دی۔ ایک طرف مجید نظامی کا تعاون حاصل کیا۔ اور "نوائے وقت" میں ایک سلسلہ مقالات لکھا۔ دوسری طرف نسیم حجازی سے مدد لے کر "کوہستان" میں پورے پورے صفحے کے دو مضامین لکھے۔ تیسری طرف "چٹان" کے کالموں میں بھی ہنگامہ کھڑا کر دیا اور ایک ایسا تاثر پیدا کرنے کی سعی فرمائی کہ میں بزرگ صحافیوں کی توہین کرتا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آخر وہ خاموش ہو گئے۔ چند سال تعلقات منقطع رہے۔ اس کے بعد بورڈ آف فلم سنسر کے رکن بنے تو بڑے تپاک کے ساتھ سلام کیا۔ اور ہم یوں گھل مل گئے جیسے کبھی جھگڑا ہوا ہی نہیں تھا۔ بہ سبیل تذکرہ وفات سے کوئی ایک سال پہلے ایک بار شورش

نے فون کیا اور کہا کہ تمہاری کتاب "صحافت پاکستان و ہند میں" اعلیٰ پائے کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ ابوالکلام آزاد پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ صحافت کے پس منظر پر ایک باب لکھ رہا ہوں اور تمہاری کتاب سے مدد لے رہا ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اور دل میں کہا ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

صلح ہو گئی تو ایک بار شورش بال بچوں کے ساتھ میرے گھر آئے اور اس کے بعد میرے کُنبے کو ایک نہایت پُرتکلّف دعوت پر بُلایا اور اس کے بعد دوستی کا ایک ایسا سلسلہ چلا۔ جو اُن کی موت تک جاری رہا ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ فون پر بات چیت تو اکثر ہوتی تھی۔ اُن کی بیٹی صوفیہ شورش میری شاگرد رہی اور اُنہوں نے مجھ سے پوچھ کر اُسے شعبۂ صحافت میں داخل کرایا۔ یہ لڑکی مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔

شورش سے قریب قریب تیس سال تک رابطہ رہا۔ بیس بائیس سال پہلے کا ذکر ہے پہلی مرتبہ یورپ گئے۔ تو جاتے وقت ایک خط لکھ گئے کہ میرے پیچھے "چٹان" کے اداریے لکھتے رہنا۔ چنانچہ تقریباً تین ہفتے اداریے میں نے لکھے۔ اُنہوں نے جو خدمت میرے سپُرد کی۔ وہ بڑے اعتماد کی بات تھی۔ اس لئے میں نے بھی یہ خدمت بڑی ذمہ داری کے ساتھ نباہی۔ بہت مدّت ہوئی ایک دن میرے ہاں آئے تو خاصی دیر بیٹھے رہے۔ میں نے کہا: شورش صاحب! آپ میں مولانا ظفر علی خان کی جُملہ خصوصیات موجود ہیں۔ آپ ادیب ہیں۔ صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ صحافی ہیں۔ شاعر ہیں۔ سیاسی شاعری بھی کرتے ہیں۔ اور طرّہ یہ کہ مولانا ظفر علی خان سے ورثے میں مزاج کا تلوّن بھی پایا ہے کہ کسی کو

اچھالنے پر آئیں تو ثریا تک پہنچا دیں گے اور گرانے پر آئیں تو تحت الثریٰ تک پہنچا کر دم لیں گے لیکن ظفر علی خان اصلاً میدانِ سیاست کے کھلاڑی تھے۔ آپ اصلاً میدانِ صحافت کے کھلاڑی ہیں۔ صحافت میں مخالفین کو اس طرح رگڑتے رہے اور مخالفین کی تعداد میں اضافہ کرتے رہے تو ایک دن آئے گا کہ لوگ آپ کے سائے سے بھی ڈریں گے اور جب اس دُنیا سے کوچ کریں گے تو سوائے عبدالسلام خورشید کے کوئی آپ پر مقالہ نہیں لکھے گا۔ ویسے مجھے پتہ ہے کہ میں پہلے مرا تو آپ اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کریں گے۔" اس پر زور کا قہقہہ لگا اور شورش نے بتایا کہ میرے اخبار کا ایک مزاج بن چکا ہے۔ اب اس سے انحراف ممکن نہیں۔ چٹپٹا پن نہ رہا تو اخبار کون خریدے گا؟ میں نے کہا، یہاں تو ہم بھی قائل ہیں۔

شورش حکومت کے ساتھ بے تکلّفی فرماتے رہتے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی زیرِ عتاب آ جاتے۔ ایک بار پنجاب کے گرم و سرد چشیدہ ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ سید نور احمد نے "چٹان" کو بند کرنے کے لئے ایک چال چلی۔ اُنہوں نے ظہور الحسن ڈار کو اُکسایا۔ اُنہوں نے ایک نئے اخبار "ایشیا" میں شورش کے خلاف ناگفتنی باتوں کا چکر چلایا۔ شورش تو تھے ہی لڑاکا اخبار نویس۔ اُنہوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور ایک ہنگامہ شروع ہو گیا جس میں گفتنی باتیں کم تھیں۔ ناگفتنی زیادہ۔ اس پر سید نور احمد کی سفارش پر حکومت نے فحاشی کے الزام میں دونوں اخباروں کو چھ مہینے کے لئے بند کر دیا۔ اس میں نقصان "ایشیا" کا نہیں تھا کیونکہ اُسے تو نکلے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے۔ نقصان صرف شورش کا ہوا کہ بنا بنایا، چلا چلایا اخبار بند ہو گیا اور نور احمد کی چال کامیاب ہو گئی۔ یہ

الگ بات ہے کہ شورش کے پاس "عادل" کا ڈیکلریشن موجود تھا۔ اور اُنہوں نے "چٹان" کی جگہ "عادل" نکال لیا۔

ایوب راج کے دَور میں مولانا کوثر نیازی اور آغا شورش کے درمیان ٹھن گئی۔ ان دنوں کوثر "شہاب" کے مالک و مدیر تھے۔ جو ایک خالص دینی ہفت روزہ تھا۔ اس کے مقابلے پر "چٹان" کا مزاج سیاسی تھا۔ اب "چٹان" اور "شہاب" کے درمیان جنگ ہوئی۔ میری دونوں سے آشنائی تھی اور اس سے دونوں واقف تھے۔ چنانچہ روزانہ دونوں کے فون آتے۔ دونوں خائف تھے کہ میں کسی ایک کے حق میں قلم استعمال نہ کروں۔ سچ پوچھئے۔ تو میں نے اس جنگ میں ایک تعمیری کردار ادا کیا۔ یہ کہنا تو مشکل تھا کہ صلح کر لو کیونکہ اس معاملے میں دونوں پُٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے۔ اس لئے میری کوشش یہ رہی کہ تجاوزات کم از کم ہوں اور ناگفتنی باتوں میں کمی ہو۔ مولانا کوثر نیازی نے شورش کے پُرانے حریف ظہور الحسن ڈار کی خدمات حاصل کر لیں اور ڈار صاحب ناگفتنی کا چکر چلائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ مولانا کو سمجھایا کہ "شہاب" ایک دینی ہفت روزہ ہے اس کا مزاج بدل گیا۔ تو اُن کی اپنی امیج متاثر ہوگی۔ شورش نے ایک بار ناگفتنی میں تجاوز کیا تو اُنہیں بتایا کہ حکام "چٹان اور "الیشیا" کی بندش کی تاریخ دہرانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ اس لئے ذرا احتیاط سے کام لیں۔ انہوں نے پوچھا آپ کس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟ میں نے اُن کی تحریر کے ایک ناگفتنی پہلو کی طرف اشارہ کیا تو اُنہوں نے بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے مشورے دیتے رہیئے گا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ جنگ کیسے ختم ہوئی۔ بہر حال اس میں کوئی تُک نہیں تھا۔

شورش کاشمیری کے اُٹھ جانے سے اُردو صحافت کی تاریخ کا وہ دور ختم ہو گیا جس کا آغاز مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ سامراج کے خلاف جنگ، آزادیٔ صحافت کے لئے دار و رسن کی آزمائش کا خیر مقدم، صحافت اور ادب کا امتزاج، اداریہ نگاری میں خطیبانہ انداز کی جھلک، سیاسی اور صحافتی شاعری۔ یہ تھیں وہ خصوصیات، جن سے مولانا ظفر علی خان کی صحافت عبارت تھی۔ شورش نے انہی روایات کو آگے بڑھایا۔ سامراج کے خلاف جنگ میں جوانی کے بہترین ایام گزار دیئے۔ حریتِ خیال کی قندیلوں کو روشن رکھنے کی خاطر قید و بند کے مصائب جھیلے۔ صحافت میں ادبی رنگ کو برقرار رکھا۔ اداریہ نگاری میں خطیبانہ انداز سے ایک ایسی جذباتیت کو جنم دیا جس نے قدروں اور روائتوں کو زندہ رکھنے میں مدد دی۔ سیاسی اور صحافتی شاعری سے قارئین کے قلوب کو گرمایا اور تڑپایا۔ اور طنز کے تیروں سے اصولی اور نظریاتی مخالفین کو کھدیڑ ڈالا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ پاکستان میں صحافت ترقی کے نت نئے مراحل طے کر رہی ہے۔ ایسے دیوانے اور سرپھرے صحافی بھی موجود ہیں جو آزادیٔ صحافت کی خاطر قربانیاں دے رہے ہیں۔ ایسے اخبار اور رسائل بھی موجود ہیں۔ جو عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ ظفر علی خان کا رنگِ صحافت شورش کی موت کے ساتھ ختم ہو گیا۔

صحافت کی ایک صنف سولو جرنلزم یا تنہا نگار صحافت کے نام سے مشہور ہے۔ یوں تو ماضی میں بہت سے ایسے اخبار نکلے جن پر کسی ایک شخصیت کی چھاپ بہت گہری تھی۔ مثلاً "الہلال" پر ابوالکلام آزاد کی

"کامریڈ" اور "ہمدرد" پر محمد علی کی اور "زمیندار" پر ظفر علی خان کی لیکن تنہا نگار صحافت سے میری مُراد وہ اخبار ہیں جو تمام و کمال ایک ہی شخصیت ایڈٹ کرتی تھی اس کی پہلی مثال گاندھی جی کا ہفت روزہ "ہری جن" تھا۔ دوسری مثال خواجہ حسن نظامی کا ہفت روزہ "منادی" تھا۔ تیسری مثال کمیونسٹ رہنما ایم۔ این۔ رائے کا اخبار "انڈی پنڈنٹ انڈیا" تھا۔ چوتھی مثال مولانا عبدالماجد دریا بادی کا ہفت روزہ "صدقِ جدید" اور پانچویں مثال علامہ عنایت اللہ المشرقی کا ہفت روزہ "الاصلاح" تھا۔ شورش کاشمیری کا ہفت روزہ "چٹان" بھی تنہا نگار صحافت کی ایک مثال تھا۔ مرحوم اداریے بھی لکھتے، شذرات بھی قلمبند کرتے۔ نظمیں بھی دیتے۔ مختلف قلمی ناموں سے کالم نویسی بھی فرماتے ماضی کی یادوں پر مضامین بھی لکھتے اور گہرے مطالعہ کے دوران میں جو اقتباسات دلچسپ نظر آتے۔ وہ بھی درج کر دیتے تھے۔ یہ درست ہے کہ "چٹان" میں دوسرے لوگوں کی نگارشات بھی شامل ہوتی تھیں لیکن اس کا بیشتر حصہ شورش ہی لکھتے اور مرتب کرتے تھے۔

شورش نے بہت سی کتابیں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ اُن کا سب سے بڑا افادی پہلو یہ ہے کہ بیشتر تصانیف خود نوشت سوانح کی مختلف کڑیاں ہیں۔ کچھ پاکستان بننے سے پہلے کے واقعات پر مشتمل، کچھ بعد کے واقعات پر مشتمل۔ سچ پوچھیے تو یہ خود نوشت سوانح ہی نہیں، تاریخ کے شہپارے بھی ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے ہم عصر سیاست کے وسیع تناظر میں اپنی سرگرمیوں کا تذکرہ فرمایا حتیٰ کہ جو سوانح ظفر علی خان، حمید نظامی، حسین شہید سہروردی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لکھے، اُن میں بھی ہم عصر سیاست کے بہت سے مخفی باب منظرِ عام پر لے آئے۔ گویا ان کی تصانیف تاریخِ سیاست

خود نوشت سوانح اور عمومی سوانح نگاری کا امتزاج پیش کرتی ہیں شورش علمی اور ادبی نقادوں سے کچھ نشاکی تھے۔ اور بجا طور پر شاکی تھے۔ کہ سکہ بند نقادوں نے اُن سے اغماض برتا لیکن میں نے اُنہیں ہمیشہ یہی کہا کہ ادیب کو دوسروں کی تحریریں نہیں، اُس کی اپنی تخلیقات زندہ رکھتی ہیں۔ اس لئے کوئی نقاد نوٹس لے یا نہ لے۔ تمہاری تخلیقات تمہیں زندہ رکھیں گی۔

مولانا شوکت علی سے میری کیا راہ درسم ہو سکتی تھی۔ کہاں وہ اور کہاں میں بس ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ اور خدا جانے اسے ملاقات کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ موت سے چند مہینے پہلے، ۱۹۳۸ء کے اوائل میں لاہور آئے تو مسلم ٹاؤن بھی پہنچے۔ کوٹھی کی لان میں والد صاحب اور وہ بیٹھے تھے۔ میں آیا تو والد نے میرا تعارف کرایا۔ کہنے لگے "عبدالسلام خورشید جنرل سیکرٹری پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن"۔ مولانا نے "مسلم" کا لفظ نہ سنا سوچا۔ میں پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہوں۔ جس پر کمیونسٹوں کا غلبہ تھا۔ بولے۔ اچھا۔ کمیونسٹ ہیں۔ کمیونسٹ ہیں؟ والد صاحب نے بتایا۔ نہیں۔ یہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری ہے۔ مسلم لیگ کا حامی ہے۔ اس پر مولانا خوشی سے بولے۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔ اس کے بعد بزرگوں کے درمیان باتیں ہوتی رہیں اور میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

شوکت علی میدانِ سیاست میں تو مشہور تھے ہی۔ موٹاپے کے لئے بھی مشہور تھے۔ وہ اتنے موٹے تھے کہ ان کے سائز کی بنیان مشکل سے ملتی تھی۔ بڑے وجیہہ تھے۔ سر پر قراقلی کی ٹوپی۔ اس پر چاند تارے کا نشان کھدر کا کُرتا۔ کھدر کا کھلے پائینچوں کا پاجامہ۔ پاؤں میں چپل۔ رنگ گورا

تھا۔ جلدی جلدی باتیں کرتے تھے اور یہی ڈھنگ تقریر کا تھا۔ بہت بڑے آرگنائزر تھے۔ ان کے بھائی رئیس الاحرار محمد علی ذہانت میں بہت آگے تھے۔ لیکن تحریک چلانے اور چندہ جمع کرنے اور رضا کار بھرتی کرنے میں جملہ مہارت شوکت علی کو حاصل تھی۔ جہاں جاتے۔ لوگوں کو چشم زدن میں اکٹھا کر لیتے اور ان کے دلوں میں اُتر جاتے تھے۔

مولانا شوکت علی کو "ضیغمِ ملت" بھی کہا جاتا تھا اور خادمِ کعبہ بھی بمبئی کے روزنامہ "خلافت" کے بانی تھے۔ جب تک زندہ رہے "خلافت" جاری رہا۔ مدیر کے طور پر ان کا نام آتا تھا لیکن ادارت دوسرے کرتے تھے۔ اس اخبار نے بمبئی کے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ شوکت علی عربی نہیں جانتے تھے لیکن فلسطین، مصر اور سعودی عرب جاتے تو کچھ الفاظ اور کچھ قرآنی آیات سے کام نکال لیتے تھے۔ مثلاً" الاستعمار البریطانیہ۔ عذابٌ علیم۔ عذابٌ علیم کہتے ہیں۔ ایک بار جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ عرشے سے ایک کتاب نیچے گر گئی۔ فوراً جہاز کے ایک عرب ملازم سے کہنے لگے۔ یا شیخ۔ یا شیخ۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا شوکت علی پر مخالفین نے الزام لگائے کہ چندہ کھا گئے ہیں لیکن یہ محض جھوٹ تھا۔ سوال یہ ہے کہ چندہ کھایا تو کہاں لے گئے؟ کون سی املاک بنائی؟ کون سا عیش کیا؟ اصل بات یہ ہے کہ اُنہیں اور تحریکِ خلافت کے دوسرے لیڈروں کو غیر ملکی دورے کرنے پڑے۔ ان دوروں پر غیر متوقع اخراجات کرنے پڑتے تھے۔ انہی اخراجات کو لوگوں نے چندہ کھانے سے تعبیر کیا۔ سچ پوچھئے تو یہ لوگ درویش صفت تھے۔ چندہ

کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا!

خواجہ صلاح الدین امرتسر کے پال خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عظیم علمی روایات کا حامل ہے۔ ساری عمر پنجاب یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹکنالوجی میں گزار دی۔ آخری دور میں ڈائرکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ مجھے سائنس میں اُن کے درک سے تو کوئی خاص آگہی نہیں البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ عربی زبان میں خصوصی دسترس رکھتے تھے اور بہت بڑے اہل علم تھے ان کا کتب خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہزار ہا کتب موجود تھیں جن میں نوادر بھی شامل تھے۔ ہر کتاب مجلّد تھی اور وہ بھی اعلیٰ انداز میں۔ اُن کا کتب خانہ محکمہ اوقاف والوں نے لے لیا اور اس کا معاوضہ ایک لاکھ روپے اُن کے والد کے حوالے کر دیا لیکن یہ معاوضہ نہیں تھا محض ہدیہ تھا کیونکہ کتب خانہ بہت قیمتی تھا۔ خواجہ صلاح الدین ساری عمر کنوارے رہے۔ اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پروفیسر ہونے کے باوجود نہ کبھی سوٹ پہنا۔ نہ اچکن ہمیشہ قمیص اور شلوار میں ملبوس رہتے تھے۔ میں نے سخت سردیوں میں بھی اُنہیں کسی گرم لباس میں نہیں دیکھا۔ خدا جانے، سردی کس طرح برداشت کر لیتے تھے۔

خواجہ صلاح الدین دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ دھڑے بندی کے قائل تھے۔ سینٹ اور سنڈیکیٹ کے انتخابات لڑنا بائیں ہاتھ کا کرتب تھا خود بھی کامیاب ہوتے۔ دوستوں کو بھی کامیاب کرا دیتے تھے۔ یونیورسٹی کے اُن اساتذہ میں شامل تھے جن کی اصابت رائے اور اثر و رسوخ ایک مسلّمہ امر کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے اُنہیں تمام کلیدی کمیٹیوں میں شامل کیا جاتا تھا۔ مجھے اُن سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا اور وہ کبھی کبھی

غریب خانے پر آکر میری عزت افزائی فرماتے تھے اور ہر اعتبار سے شفقت فرماتے تھے۔

مولانا صلاح الدین احمد سے مجھے پیار تھا۔ اُن کی اُردو نوازی بھی پسند کرتا تھا لیکن "اُردو بولو۔ اُردو لکھو اور اُردو پڑھو"، کے نعرے سے اختلاف رکھتا تھا یعنی جزوی طور پر۔ مولانا چاہتے تھے۔ گھروں میں اُردو بولی جائے میں اُن سے کہتا تھا۔ مولانا! اس سے ہمارے گھروں میں ایک مصنوعی سی فضا پیدا ہو جائے گی اور پیار میں کمی ہو جائے گی کہ پیار صرف مادری زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔ مولانا اُردو لکھنے کی تلقین فرماتے تھے۔ میں کہتا تھا اُردو لکھنا برحق، لیکن مادری زبان میں بھی کچھ لکھا جائے تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ مولانا اُردو پڑھنے کا درس دیتے تھے۔ مجھے اس سے اتفاق تھا لیکن میں کہتا تھا۔ جتنی زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔ اُن کا ادب پڑھنا چاہیئے۔ ویسے مولانا بالعموم اوقات پنجابی میں بھی گفت گو فرماتے تھے۔

اُردو سے بہت سی شخصیتوں کو عشق رہا ہے لیکن مولانا کا عشق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ اُردو کے جلوس نہیں نکالتے تھے۔ اس کے لئے ریاض فرماتے تھے۔ قربانی دیتے تھے "ادبی دنیا"، کو انھوں نے اپنے خون سے سینچا۔ آخری دور میں جائداد بیچ کر اس میں لگا دی۔ اور ایسا کاروبار کیا جو سراسر گھاٹے کا کاروبار تھا۔ اسے ضخیم سہ ماہی مجلّے کا روپ دیا۔ تین سو صفحے کے شمارے کی قیمت تھی، صرف ایک روپیہ۔ اس میں ایک تہائی سے قدرے زیادہ اخبار فروش کو کمشن ملتی تھی اور جو باقی بچ رہتا تھا اس میں سو صفحے کا رسالہ مہیا کرنا بھی ممکن نہیں تھا سالانہ

چندہ تین روپے تھا۔ گویا مستقل خریداروں کو فی پرچہ بارہ آنے پڑتے تھے خریداروں کے لئے ایک دلچسپ پیش کش یہ تھی کہ اگر وہ سال بھر کے چار پرچے پڑھ کر لوٹا دیں تو مزید ایک سال کے لئے خریدار بن سکتے ہیں اُنہوں نے احباب سے اپیل کی کہ وہ کچھ روپیہ فراہم کریں۔ تو اس سے نادار لیکن ادب دوست لوگوں کو رسالہ مفت جاری کیا جا سکتا ہے۔ اس کارِ خیر میں مَیں نے بھی حصہ لیا۔ ایک سو روپیہ دیا جس سے تینتیس افراد کے نام پرچہ جاری ہو گیا۔ اشتہار زیادہ نہیں تھے اس لئے اشاعت جتنی بڑھتی تھی۔ خسارہ بھی اس قدر بڑھتا چلا جاتا تھا جسے مولانا خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ مولانا نے اُردو فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اس کے زیرِ اہتمام بہت سی کتابیں چھاپیں۔ اس میں بھی منافعے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لاریب، اُردو کو مولانا جیسا عاشق نہ کبھی پہلے نصیب ہوا۔ نہ کبھی آئندہ نصیب ہو گا۔ اُنہوں نے کبھی حکومت سے گرانٹ مانگنے کا تصور بھی نہ کیا اور اگر کسی نے اس کارِ خیر میں مالی امداد فراہم کی تو وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ذات تھی۔ اللہ بس۔ باقی ہوس۔

مولانا کے انتقال کے بعد یہ کاروبارِ عشق ٹھپ ہو گیا۔ کہ ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

وہ دکان اپنی بڑھا گئے

آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد اور مولانا حامد علی خان نے کوشش کی کہ "ادبی دنیا" جاری رہے۔ عبداللہ قریشی ادارت پر فائز ہوئے۔ اُنہوں نے لشتم پشتم رسالہ جاری رکھا۔ لیکن ایک تو مولانا والی بات نہ پیدا ہو سکی۔ دوسرے، مولانا کی اولاد نے اس کام میں دلچسپی نہ لی۔ بلکہ شاید کچھ رکاوٹ

ہی ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی واحد یادگار موت کے گھاٹ اتر گئی۔ اُن کے انتقال پر میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے کہا جائے گا کہ وہ "ادبی دنیا" اور "اُردو فاؤنڈیشن" کا کام چلائیں لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اور اُنہوں نے مجبوراً "اوراق" جاری کر لیا۔

یہ ۴۴-۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ "ادبی دنیا" ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی لارلز لمیٹڈ کے اہتمام میں نکلتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد ایجنسی میں کام کرتے تھے اور "ادبی دنیا" کی ادارت منصور احمد کے سُپرد تھی۔ منصور احمد کا انتقال ہوا تو مولانا صلاح الدین اور میرا جی نے ادارت سنبھالی۔ وہ "ادبی دنیا" کے شباب کا زمانہ تھا۔ جہازی تقطیع، سفید کاغذ، اعلیٰ پائے کی کتابت اور طباعت۔ آرٹ پیپر کا پُرکشش سرورق۔ اور اندر آرٹ کی تصاویر مضامین میں بلا کا تنوع تھا۔ نئے اور پُرانے، دونوں قسم کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی مہندر ناتھ، علی عباس جلالپوری اور بہت سے دوسرے نامور ادیبوں کی اوّلین نگارشات "ادبی دنیا" میں چھپیں۔ مضامین کا معاوضہ تو دیا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن ہر شمارے کی دو تین منتخب نگارشات پر "ہدیہ" دیا جاتا تھا۔ اس کے لئے پچیس روپے ماہانہ وقف تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء میں اُردو مرثیے کے نشوو ارتقاء کے موضوع پر ایک مقالے کے لئے ساڑھے سات روپے ہدیہ ملا۔ جو قلم سے میری پہلی کمائی تھی۔ یہی رقم وصول کرنے کے لئے میں پہلی مرتبہ مولانا سے ملا اور اس کے بعد تعلقات کا ایسا سلسلہ چلا جسے صرف موت کا بے رحم ہاتھ منقطع کر سکا۔ "ادبی دنیا" مجھے اعزازی طور پر جاری رہا اور میں چھ چھ مہینے کے فائلوں کی جلدیں بندھواتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے

فسادات میں مولانا کا گھر نذرِ آتش ہو گیا تو فائل بھی جل گئے۔ اس پر مولانا نے اپنے چاہنے والوں سے اپیل کی کہ وہ ریکارڈ کے لئے فائل فراہم کریں۔ میں نے کچھ فائل اُن کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ جو بچے، وہ لاہور میوزیم کو دے دیئے۔

پاکستان بننے سے پہلے مولانا سے زیادہ تر ملاقاتیں نگینہ بیکری میں ہوتی تھیں جہاں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ مولانا علم الدین سالک۔ گوپال متّل، عبداللہ بٹ۔ عبداللہ ملک اور نور الحسن ہاشمی اور باری علیگ بھی ہر روز نشست لگاتے تھے۔ یہ سلسلہ پاکستان بننے کے بعد بھی جاری رہا۔ مولانا نے مال روڈ پر ایک کاروباری فلیٹ میں "ادبی دنیا" کا دفتر کھول لیا تو وہاں بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ابھی ابھی ایک بات یاد آئی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مولانا نے کچھ دیر نمک کا کاروبار بھی کیا۔ لیکن قوت لایموت کے لئے اور لبا اوقات اس کی آمدنی بھی "ادبی دنیا" ہی میں لگا دی۔

مولانا ایک وضعدار بزرگ تھے۔ اُن کی وضعداری کا ایک خوبصورت پہلو یہ تھا کہ جن لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے۔ اُن سے ضرورت مندوں کی سفارش فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ذاتی تجربہ بھی ہے۔ یہ تو یاد نہیں رہا کہ کام کیا تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ایک بار کام کہہ دیا اُس کے بعد اُس میں جو مرحلے آئے۔ مولانا خود ہی ٹیلی فون کر کے بتاتے رہے۔ اُن کے دم قدم سے ادبی محفلیں آباد تھیں۔ کبھی زبانی خطاب نہ فرماتے۔ مقالہ لکھ کر پڑھتے۔ اُن کا اسلوبِ نگارش بہت دلآویز تھا یوں سمجھیئے کہ مولانا حسین آزاد کے اسلوب سے ملتا جلتا تھا لیکن اُس میں

قدامت کی جھلک نہیں نظر آتی تھی۔ اصل میں مولانا قدیم و جدید کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ترقی پسند ادب کے بارے میں اُنہیں کوئی حسنِ ظن نہیں تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو ادیب، ترقی پسند تحریک میں پیش پیش رہے۔ اُن میں بیشتر "ادبی دنیا" کے دبستان سے فارغ التحصیل تھے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ بنا۔ تو مولانا کو اس میں شمولیت کی دعوت دی گئی لیکن اُنہوں نے معذرت کر دی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ادبی آمریت کو پسند نہیں کرتے تھے اور گلڈ کی ابتدا دورِ ایوبی میں اور حکومت کی سرپرستی میں ہوئی۔ انجمن حمایت اسلام کے ایک سالانہ اجلاس میں تو اُنہوں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی صدارت میں ایک ایسا مقالہ پڑھا جو حکمران طبقے کے لئے بہت نامرغوب تھا۔ مولانا آزاد منش اور درویش صفت انسان تھے۔ بڑے لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن ادیبوں کے ہر گروہ سے اُن کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔

آغا طاہر نبیرۂ آزاد سے کسی زمانے میں ہماری گاڑھی چھنتی تھی بڑے وجیہہ بزرگ تھے۔ سفید کھدّر کا لباس۔ مزاج میں بلا کا بانکپن۔ دِلّی کی مخصوص تہذیب سے گہرا لگاؤ۔ بولتے تھے تو پھول جھڑتے تھے۔ کہ خالص دلّی کے محاورے میں گفت گو فرماتے تھے۔ زبان میں عجیب گھلاوٹ سی تھی۔ جب ملتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد سے ملاقات ہو گئی۔ آغا طاہر آزادی سے پہلے اکثر دلّی سے لاہور آتے۔ عرب ہوٹل میں محفل آراستہ کرتے۔ کافی ہاؤس میں احباب کو جمع کرتے اور کبھی حاتم طائی کی روح اُن میں حلول کرتی تو مال روڈ پر لورینگز

ریستوران میں دوستوں کو بلاتے ۔ لطیفے اور چٹکلے ان پر ختم تھے ۔ شاعر نہیں تھے لیکن گفتگو میں بلا کی شعریت تھی اور اساتذہ کے اشعار تھے کہ اُمڈے چلے آتے تھے ۔ دلّی قدرتی طور پر ان کی کمزوری تھا ۔ بسا اوقات کسی تہذیبی مسئلے پر بات کرتے ۔ تو آغاز اس فقرے سے ہوتا ۔ کہ "جب دلی میں غدر پڑا تو ....." چونکہ ہماری اُن سے بہت بے تکلفی تھی ۔ اس لئے ہم نے یہ فقرہ اُن کی چھیڑ بنا لیا ۔ چنانچہ بات بات میں اسی کا ذکر لے آتے ۔ مثلاً جب عرب ہوٹل میں کباب کھاتے ۔ تو ہم میں سے کوئی پوچھتا ۔ آغا ! جب دلّی میں غدر پڑا تو کبابوں پر کیا بیتی ؟

آغا صاحب عبداللہ بٹ کی دریافت تھے ۔ اُنہی کی وساطت سے میں اُن کے قریب آیا ۔ ظہیر کاشمیری ۔ حمید نسیم ۔ عبدالمجید بھٹی ۔ فضل کریم خاں دُرّانی ۔ سجاد ہاشمی اور دوسرے بے شمار احباب آغا کی صحبت کے رسیا تھے ۔ سب اُن سے پیار کرتے تھے ۔ اور وہ بھی سب سے بے تکلف تھے ۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں تھی ۔ اُن سے چھوٹے بھی خوش تھے ۔ بڑے بھی ۔ آغا طاہر دہلی میں ناشر کا کام کرتے تھے دیوانِ غالب کا طاہر ایڈیشن اُنہی سے منسوب ہے ۔ اس کے ہر صفحے کی طباعت بلاک کے ذریعے ہوئی تھی اور کسی زمانے میں اسے مستند ایڈیشن قرار دیا جاتا تھا ۔ اُنہوں نے دو ایک کتابیں خود بھی لکھیں لیکن وہ اصلاً ادیب نہیں تھے ۔ محفل آرا قسم کے آدمی تھے اور جب وہ اور عبداللہ بٹ اکٹھے ہوتے تو پھر تابڑ توڑ لطیفے چلتے اور کبھی گرما گرمی بھی ہو جاتی لیکن اُن کے چہرے سے مسکراہٹ کبھی نہ جاتی ۔

آغا طاہر دو چار بار میرے ہاں آئے ۔ اور احباب کی محفل جمی

پاکستان بننے کے بعد لاہور میں ان کی آمد کم ہو گئی۔ بہر حال ایک بار لاہور آئے اور مجھے نہ پایا تو مری کا قصد کیا۔ جہاں میں مقیم تھا۔ وہاں بھی خوب محفلیں آراستہ ہوئیں۔

آغا طاہر بھی نبیرۂ آزاد اور آغا باقر بھی نبیرۂ آزاد لیکن دونوں کے مزاج میں بے حد اختلاف تھا۔ طاہر رونقِ محفل تھے، باقر خاموش طبع طاہر کی گفتگو میں شگفتگی تو تھی لیکن گہرائی نہیں تھی۔ باقر کی گفتگو میں شگفتگی نام کو نہیں تھی لیکن گہرائی بہت تھی۔ طاہر کا ذوق غیر تحقیقی تھا۔ باقر کا ذوق سو فیصد تحقیقی۔ چنانچہ اگر مولانا محمد حسین آزاد سے تعلق رکھنے والی وستاویزات کا مطالعہ کیا تو باقر کے ہاں جا کر۔

ظفر الاسلام عین اُس وقت جان ہار گئے۔ جب وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے شباب کے نقطۂ عروج پر تھے۔ ہائے یہ مرضِ قلب، کیسی کیسی پیاری شخصیتوں کو دبوچ لیتا ہے۔ ظفر الاسلام پہلے پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے ریسرچ سکالر تھے۔ پھر لیکچرار بنے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سمندر پار بھی گئے۔ تحقیقی مقالے لکھے اور خیال تھا کہ تاریخ کی دُنیا میں خوب چمکیں گے کہ اچانک موت کی خبر سُن لی۔ ظفر الاسلام سے میرا قلبی تعلق تھا۔ شعبۂ صحافت کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۲ء میں عالمی اخباری نمائش کرائی تو اس میں مرحوم نے نمایاں حصّہ لیا اور دو سال بعد دنیائے اسلام کی اخباری نمائش کا تو بیشتر کام انہی نے سنبھال رکھا تھا۔ دنیائے اسلام کے اخبارات کی فہرست بنانے اور بعد میں اس کی رُوداد کی ترتیب و اشاعت میں بھی وہی پیش پیش تھے۔ ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی دھڑے

بندی کا عنصر داخل ہوتا ہے۔ میں بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہوں۔ اس کام میں بھی ظفر الاسلام کی مدد شاملِ حال ہوتی تھی۔ اگر کسی اخبار میں میرے خلاف کوئی چیز آتی تو ظفر الاسلام خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے تھے اور حریفوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ میں بھی اُن کا ساتھی تھا۔ جہاں اس کا مفاد خطرے میں نظر آتا، سینہ سپر ہو جاتا۔ اُن سے گہرے رشتے میں یہ چیز بھی کسی حد تک کارفرما تھی کہ وہ قمر الاسلام کے چھوٹے بھائی تھے اور قمر الاسلام کے ساتھ میرا رابطہ بہت پرانا تھا۔ اگرچہ بہت کم بھی تھا موصوف سکول میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ بڑے طرار اور تیز قسم کے طالب علم تھے سکول کی سٹیج پر ہم دونوں تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہم بچھڑ گئے۔ وہ سول سروس میں چلے گئے۔ اور بڑے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور میں خارزارِ صحافت میں اُلجھا رہا۔ اس دوران میں صرف ایک ملاقات کراچی میں ہوئی اور بس۔

سردار ظفر اللہ کے بارے میں مجھے بڑی مدّت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے نامور صحافی مولانا انشاءاللہ خان کے فرزند تھے۔ مولوی صاحب کو میں نے تو نہیں دیکھا لیکن وہ مانے ہوئے ادیب، انشاپرداز اور شاعر تھے۔ ۱۹۰۲ء میں "وطن" کے نام سے لاہور میں ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ جو ایک تہائی صدی تک زندہ رہا۔ سردار ظفر اللہ کو صحافت سے نہیں سیاست سے مس تھا۔ پہلے مسلم طلبہ کی تحریک میں حصّہ لیا۔ پھر مسلم لیگ میں آگئے لیکن پاکستان بننے کے بعد زیادہ اُبھرے۔ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ سول مسلم لیگ (لاہور) کے مدّتوں صدر رہے۔ لیگ کے بُرے دنوں میں بھی ساتھ دیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں کھڑے ہوئے لیکن ناکام رہے۔ کیونکہ اس طوفانی

دور میں لیگ کو کون پوچھتا تھا؟ سردار ظفر اللہ کا پیشہ وکالت تھا شغل سیاست تھا اور خالی وقت میں تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بٹ کی بنائی ہوئی پنجاب لٹریری لیگ میں پیش پیش رہے۔ دوستوں کے دوست تھے۔ محفل آرائی میں بھی درک رکھتے تھے لیکن تقریر بہت کم کرتے تھے۔ شاید اس میں کوئی حجاب حائل تھا۔ دوستوں کے ساتھ زیادہ تر کافی ہاؤس میں ملاقات رہتی تھی۔ جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں۔ سیاسی مسائل پر اس شدت سے مناظرے ہوتے تھے۔ جیسے انہی پر مسائل کے حل کا انحصار ہے۔ حالانکہ وہاں جو کچھ ہوتا تھا، کافی کی پیالی میں طوفان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اُن سے میرا تعلق عبداللہ بٹ کی وساطت سے تھا۔ چنانچہ جب ملاقات ہوئی عبداللہ بٹ ساتھ تھے۔ افسوس، عبداللہ بٹ عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اور سردار ظفر اللہ سرطان کی بھینٹ چڑھ گئے اور یوں دوستوں کی یہ جوڑی بھولی بسری کہانی بن گئی۔

مولانا ظفر علی خان اللہ کو پیارے ہوئے۔ تو والدِ مرحوم نے اُن کی شخصیت کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

"مبارک ہے راہِ ہستی کا وہ بیدار بخت مسافر جس نے ابتدائے سفر میں فرنگی کے اقتدار کے خلاف عمل کی کمر باندھی۔ وہ دیوانہ وار اپنے راستے پر گامزن رہا۔ اُس نے کڑیاں جھیلیں۔ اُس کے تلووں میں چھالے پڑے۔ اور پھوٹے پھر اُس نے اس وقت کمر کھولی۔ جب فرنگی جا چکا تھا وطن آزاد ہو چکا تھا۔ مبارک ہے وہ زبان و قلم کا دھنی۔ جس نے ہمارے

ادب کو، ہماری خطابت کو، ہماری صحافت کو لپستی اور جمود کی زنجیروں سے آزاد کر کے زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ کیا۔ جاندار اور حیات افروز پیغام کا حامل بنایا جس کی زبان آوری اور قلم کاری نے لاکھوں دلوں میں بیداری، خودداری اور کراری کے شعلے روشن کر دیئے۔ مبارک ہے وہ واجب الاحترام بزرگ مولانا ظفر علی خان، جس نے ہم جیسے ہزاروں کو ادب اور سیاست کی ولولہ زائیوں اور غلغلہ آرائیوں کا رسیا بنایا۔ جب تک اس برعظیم میں اسلام باقی ہے۔ پاکستان باقی ہے۔ اُردو زبان باقی ہے ظفر علی خان کا نام روشن رہے گا۔ روز بروز روشن تر ہوتا چلا جائے گا ۔

تا زِمے خانہ دمے نام و نشان خواہد بود
سرِ ما خاک رہِ پیرِ مغاں خواہد بود
بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سال ہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود"

مولانا ظفر علی خان بابائے صحافت تھے۔ اس لئے کہ اُنہوں نے اُردو کی نرم و نازک اور معتدل مزاج صحافت میں ایک نئی جان ڈال دی اس میں سیاسی گھن گرج پیدا کی۔ اجنبی راج سے ایک ایسی جنگ کا آغاز کیا جو تا دمِ مرگ جاری رہی۔ اس جنگ نے دوسرے اخبارات کو بھی اس روش پر لا ڈالا اور آزادئ صحافت کی جنگ دو آتشہ ہو گئی۔ فنِ صحافت کے اعتبار سے بھی وہ بابائے صحافت تھے۔ کیونکہ انہی کے عہد میں خبروں پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اُن کی نسبتی اہمیّت کو اُجاگر کرنے کی خاطر بڑی سرخیوں کا آغاز ہوا۔ صحافتی شاعری اُن سے پہلے گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اُنہوں نے اِسے ایک باقاعدہ صنف کا درجہ عطا کیا۔ ادارتی صفحے پر مزاحیہ کالم مستقل طور

پر دینے کی ریت ڈالی۔ اُن سے پہلے اخبارات کا ادارتی عملہ محدود ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ہندوستان بھر سے اعلیٰ درجے کے ادیب اور صحافی اکٹھے کیے۔ نیاز فتح پوری، عبداللہ العمادی، وحیدالدین سلیم پانی پتی، منشی وجاہت حسین جھنجھانوی، عبدالمجید سالک، غلام رسُول مہر، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکش، خدا بخش اظہر، حاجی لق لق اور بے شمار دوسرے ادیب اور صحافی اُن کے اخبار میں کام کرتے رہے۔ اگر مولانا ظفر علی خان بابائے صحافت تھے۔ تو "زمیندار" امّ الصحافت کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ جن لوگوں نے "زمیندار" میں کام کیا۔ اُن میں سے بیشتر افراد نے اپنے اخبار جاری کیے گویا دیئے سے دیا جلا اور اُردو صحافت میں ایک عظیم تنوع پیدا ہوا۔ ابتداً میں مولانا تمام اداریے خود لکھتے تھے۔ جب کارزارِ سیاست میں تگ و تاز کا وقت آیا تو اداریہ نویسی زیادہ تر دوسروں کے سپرد ہو گئی۔ لیکن سیاسی اور صحافتی شاعری کا بازار خوب گرم رہا۔ ممدوحین کی تعریف میں اور مخالفین کی مذمّت میں زوردار نظمیں لکھتے رہے۔ حالاتِ حاضرہ پر اُن کے شہپارے منظوم اداریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس صنف میں بہت سے لوگ ان کے مقابلے پر آئے۔ منظوم معرکہ آرائی بھی ہوئی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اس صنف کے بادشاہ وہی تھے

برعظیم کے مسلمانوں کی کوئی ایسی تحریک نہیں تھی جس میں وہ پیش پیش نہیں تھے۔ اگر بیسویں صدی کے پہلے نصف حصّے کی سیاسی تحریکوں کی کوئی داستان قلمبند کی جائے تو اُس میں مولانا ظفر علی خان کا نام سرِفہرست ہوگا۔ قید و بند کے مصائب جھیلے، طلبی وضبطی ضمانت اور چھاپہ خانوں کی ضبطی سے ان کی صحافتی اور سیاسی زندگی عبارت تھی۔ سامراج کے دشمن تھے۔

آزادی کے داعی تھے۔ کانگریس میں شامل ہوئے تو اس مقصد کے پیشِ نظر مجلسِ خلافت میں کام کیا۔ تو اس غرض سے۔ مجلسِ اتحادِ ملّت اور نیلی پوشوں کی تحریک شروع کی۔ تو اسی سبب سے۔ اور مسلم لیگ میں بھرپور حصہ لیا۔ تو اسی مقصد کی خاطر۔ اُن سے سیاسی غلطیاں بھی ہوئیں۔ لیکن ان کی نیک نیتی پر کسی کو شُبہ نہیں ہوا۔

عنفوانِ شباب میں مجھے اُن سے قرب حاصل ہوا۔ جو میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تحریک میں سب سے پہلے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنہوں نے جو حوصلہ افزائی فرمائی اور جس طرح ہماری ہر درخواست پر لبیک کہا۔ ہمارے جلسوں میں آئے۔ ہمارے مظاہروں میں شریک ہوئے اس کی داستان اپنے خود نوشت سوانح میں قلمبند کر چکا ہوں۔ وہ آئیڈلسٹ تھے۔ ہر چیز مثالی انداز میں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن قوم میں نہ اتنا شعور تھا۔ نہ اتنی بیداری۔ کہ اُن کے آئیڈیلزم کے ساتھ چل سکتی۔ اس لئے اُن کے بعض منصوبے ناکام بھی رہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود ناکام رہے۔ اُنہوں نے حق کی آواز بلند کی تسلسل اور تواتر سے بلند کی۔ مخالفتیں برداشت کیں۔ دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرے اور اسی تگ و دو میں جان ہار دی۔ اگر وہ کسی موقع پر حوصلہ ہار جاتے تو یہ بات محلِ نظر ہوتی لیکن ان کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہا۔ اور یہی اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اُن کی سیاسی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ بیشتر مرحلوں میں وہ قوم کے محبوب رہے۔ لیکن ایسے کٹھن مرحلے بھی آئے۔ جب عوام نے اُن پر زندگی اجیرن کر دی۔ لیکن کیا بات تھی اُس مردِ مجاہد کی کہ کوئی طاقت اُسے اعلائے

کلمۃ الحق سے باز نہ رکھ سکی۔ اور انہوں نے جو کچھ کیا ضمیر کی آواز کے مطابق کیا۔

ظفر علی خان بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ بلکہ زندگی کا آغاز ادب ہی سے کیا۔ دکن ریویو" کے نام سے جو علمی مجلہ شائع کیا اُس کے فائل آج بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ ستارۂ صبح" کے نام سے جو غیر سیاسی ہفت روزہ نکالا وہ بھی علمیت اور ادبیت کا حامل تھا۔ انہیں زبان پر بے پناہ عبور حاصل تھا۔ بڑے بڑے اہل زبان اُن کی زبان دانی کے قائل تھے۔ اگر صرف شعر و شاعری تک محدود رہتے تو اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہوتے لیکن وہ سیاسی اور صحافتی شاعری کی طرف زیادہ مائل رہے جو بہر حال عارضی نوعیت کی ہوتی ہے اس کے باوجود اُن کے شعری مجموعوں میں ایسا کلام مل جاتا ہے جسے اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک مستقل مقام حاصل ہے۔

میں انہیں اس لئے بھی پیار کے ساتھ یاد کرتا ہوں کہ اُنہیں مجھ سے پیار تھا۔ آغا شورش کاشمیری تو اُن کے معنوی فرزند تھے۔ سیاست میں ہم رکاب تھے۔ اُن کی صحبت سے بہت فیضیاب ہوتے رہے اور اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مجھ سے پیار اور نوعیت کا تھا۔ اور وہ تھا ابنِ سالک ہونے کی حیثیت سے۔ اور کچھ مسلم طلبہ کی تحریک میں شرکت کی وجہ سے۔ اُن کے فرزند مولانا اختر علی خان میرے والد کے ہم عصر تھے۔ مجھے اُن سے بھی شرفِ نیاز مندی حاصل تھا۔ اُن کے پوتے منصور علی خان میرے ہم عصر ہیں۔ اُن کے ساتھ بھی میرا بہت پیار ہے۔ اُن کے بھائی چودھری غلام حیدر خان مسلم ٹاؤن میں رہتے تھے۔ اُن کی عمر میرے باپ کی عمر سے

بھی کہیں زیادہ تھی۔ لیکن وہ اکثر میرے ہاں آیا کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے سوتیلے بھائی پروفیسر حمید احمد خان میرے استاد بھی تھے اور مُرشد بھی۔ مولانا حامد علی خان سے میرے گہرے مراسم ہیں۔ حمید احمد خان کے فرزند اور حامد علی خان کے داماد سعید احمد خان سے بھی مجھے بہت پیار ہے۔ پروفیسر محمود احمد خان سوتیلے بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں اور مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں۔ والدِ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اس خاندان کے تمام افراد میں خلوص اور گرم جوشی کے عناصر بے حد نمایاں ہیں اور میرا تجربہ او رمشاہدہ بھی اسی رائے پر صاد کرتا ہے۔

لاریب، ظفر علی خان نابغۂ روزگار تھے۔ ایسے نابغۂ روزگار، جنہیں دھرتی کبھی کبھی جنم دیتی ہے۔ ایسے میں اگر میں ان سے محدود قرب پر نازاں ہوں، تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے۔

عابد علی عابد سے میری زیادہ راہ و رسم نہیں تھی۔ بس نیاز مندی کا شرف حاصل تھا اور ملاقات ہوتی بھی تو تقریبات میں۔ لاہور کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی میں اُنہیں پہلی بار اس وقت عمل دخل حاصل ہوا جب اس صدی کے ربع اوّل کے آخر میں ایک ادبی رسالہ نکلا جس کا نام "ہزار داستان" تھا۔ یہ پہلا اور آخری پندرہ روزہ ادبی رسالہ تھا۔ عابد اس کے مدیر تھے۔ اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے ڈراموں کی اشاعت میں تخصص حاصل کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس میں امتیاز علی تاج، سد رشن، احمد شاہ بخاری اور رفیع پیرزادہ کی اوّلین نگارشات شائع ہوئیں۔ موصوف کچھ عرصہ "ہمایوں" سے بھی وابستہ رہے لیکن اُن کا اصل پیشہ تدریس تھا۔ دیال سنگھ کالج میں مدّتوں

فارسی زبان و ادب کے پروفیسر رہے۔ اعلیٰ درجے کے شاعر اور نقاد تھے۔ اور ادب کے معاملے میں اُن کی رائے سے استناد کیا جاتا تھا۔ زندگی کے آخری دور میں مجلسِ ترقیٔ ادب کے لئے تصنیف و تالیف کرتے رہے اور اس کے سہ ماہی مجلّے "صحیفہ" کی ادارت بھی اُنہی کے سپرد تھی۔

تصانیف میں "شعرِ اقبال" خاصے کی چیز ہے۔ اقبال کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئیں۔ اُن میں پیغام پر زیادہ زور دیا جاتا رہا اور شعری تکنیک کا تذکرہ برائے وزنِ بیت رہا۔ عابد علی عابد نے اس خلا کو پُر کیا اور اس کتاب میں ابتدائی عواملِ تخلیق، مطابقتِ الفاظ رسائی، علائم و رموز۔ صنعت گری، تشبیہات و استعارات، محسناتِ شعر، صنائع و بدائع، خیال افروزی اور ایجاز و حذف جیسے موضوعات پر بھرپور تبصرہ کیا۔

عرفان چغتائی "نوائے وقت" کے نامہ نگارِ خصوصی اور کالم نویس تھے۔ سانحہ قاہرہ میں موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ اُنہیں واقعات کا کھوج لگانے اور سیاسی صورتِ حالات کے تمام پہلوؤں کی جانچ پڑتال اور تحلیل کا جنون تھا۔ حمید نظامی مرحوم کے فدائی تھے، اور اُن کی قائم کی ہوئی اقدارِ صحافت کی پاسبانی کو اپنا فرض قرار دیتے تھے "معاشرتی نقوش" کے زیرِ عنوان ایک مستقل کالم لکھتے تھے جس میں ایک تو لاہور کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا جچا تُلا جائزہ پیش کرتے تھے۔ دوسرے، عام معاشرتی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اس کالم میں جہاں معلومات کی افراط تھی۔ وہاں زبان و بیان کی لطافتوں کا بھی ہجوم تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار میں نے اُن سے کہا کہ تمہاری نثر اتنی پیاری اور رنگین ہوتی ہے کہ کبھی کبھی لوگ اس کے سحر میں گم

ہو جاتے ہیں اور مطالب پر دھیان نہیں دیتے۔ عرفان چغتائی میں دلنوازیٔ سخن کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ بڑے دل آویز انداز میں باتیں کرتے تھے۔ نظریۂ پاکستان پر پختہ ایمان تھا اور ان کے نزدیک جو لوگ اس نظریئے کے مخالف تھے اُن کے خلاف بڑی شدت سے لکھتے تھے۔ وہ پاکستان میں ایک ایسا نظام دیکھنا چاہتے تھے جو اسلام کی آفاقی قدروں سے مطابقت رکھتا ہو۔ اُن کے کردار کا یہ پہلو بھی خاص طور پر نمایاں تھا کہ ساری عمر صرف اور صرف صحافت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ساری عمر غربت میں کاٹی لیکن راہِ صحافت سے گریز نہ کیا۔ صحافت کی ابتدا جھنگ کے ایک دو اخباروں سے کی۔ لاہور کے ہفت روزہ "آفاق" میں جھنگ کا مکتوب لکھتے رہے۔ اس کے بعد "نوائے وقت" سے منسلک ہو گئے۔ اور اس میں حُسنِ کارکردگی کے جوہر دکھلاتے رہے۔

شیخ عطاء اللہ جانے پہچانے ادیب اور اعلیٰ افسر جناب مختار مسعود کے والد تھے۔ کسی زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر رہے۔ لاہور کے ہیلی کالج آف کامرس سے بھی وابستہ رہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ نو سو صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں مکاتیبِ اقبال جمع کر دیئے۔ پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں آئی تو اس سے کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ کیونکہ مجاورینِ اقبال کو اعتراض تھا کہ اس میں بعض ایسے مکاتیب شامل ہیں جو شائع نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ میں نے انہی خطوط کی بنیاد پر ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "اقبال کی شخصیت کا جائزہ، اُن کے خطوط سے"۔ یہ مقالہ حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھ دیا۔ مجاورینِ اقبال نے ایسا چکر چلایا۔ کہ موصوف کو بعض خطوط حذف

کرنے پڑے۔ حالانکہ یہ چنداں قابلِ اعتراض نہیں تھے۔ اور اگر کوئی خطوط قابلِ اعتراض تھے۔ تو وہ "شاد اقبال" میں شامل تھے جو حیدر آباد دکن کے وزیراعظم سرکشن پرشاد شاد کے نام لکھے گئے تھے۔ اس کتاب پر تو کوئی بس نہ چلا اس لئے غصہ "اقبال نامہ" پر اتار دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں موصوف نے اسی کتاب کی دوسری جلد چھاپ دی۔ انہی دنوں میں نے "اقبال" پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس میں کلام سے کم اور مکاتیب سے زیادہ مدد لی۔ شیخ عطاء اللہ ملے۔ تو کہنے لگے، تم نے "اقبال نامہ" کا صحیح استعمال کیا ہے۔ دوسری جلد میں اُنہوں نے خود تراسی صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ لکھا جس میں مکاتیب کی روشنی میں حکیم الامت کے پیغام کی تشریح فرمائی۔ یہ مقدمہ اقبالیات میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خیال تھا کہ وہ تیسری جلد بھی مرتب کریں گے۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۹۶۹ء کے آغاز میں وہ اس کام کو ادھورا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کاش اقبال کا عُرس منانے والے اس طرف توجہ کرتے!

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاست سے ہزار اختلاف ہو۔ لیکن اُن کی خطابت سے کون کافر انکار کر سکتا ہے؟ سبحان اللہ۔ کیا جاہ وجلال تھا اُن کی خطابت کا۔ الفاظ تھے کہ اُمڈے چلے آتے تھے۔ اشعار تھے کہ شاید ٹکسال سے نکلتے چلے آتے تھے۔ بولتے بولتے زلفوں کو جھٹکاتے، تو یوں محسوس ہوتا، جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہوا ہے۔ پاکستان بننے سے چھ سال پہلے خضر تمیمی مرحوم کی معیت میں ملتان کے قریب کہروڑ پکا پہنچا تو وہاں ایک مسجد میں تقریر سُنی۔ موضوع تھا "سیرت رسولؐ" کچھ نہ پوچھیئے کہ وجد

کا کیا عالم تھا اور ہم دو تین گھنٹوں میں کیسے کیسے مرحلوں سے گزر گئے۔ کبھی روتے تھے۔ کبھی ہنستے تھے۔ کبھی دم بخود ہو جاتے تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو مسجد کے دروازے پر اُن سے تعارف کرایا گیا۔ کہ یہ ابنِ سالک ہے۔ سالکؔ سے سال ہا سال کے انقطاعِ تعلق اور سیاسی اختلاف کے باوجود اس مردِ درویش نے نہ صرف محبت و شفقت کا بے پناہ مظاہرہ کیا بلکہ والدِ مرحوم کے بارے میں یوں رطب اللسان ہوئے کہ ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ اس کے بعد ہمیں قیام گاہ پر لے گئے وہاں خوب محفل جمی۔ باتوں باتوں میں فرمایا۔ دو کتابیں ہمیشہ پاس رہتی ہیں قرآنِ حکیم اور دیوانِ غالب۔ لیکن اُوپر قرآنِ حکیم رہتا ہے۔ نیچے دیوانِ غالب۔ میں بے ساختہ پکار اٹھا رہاں ؎

مسجد کے زیرِ سایہ خراجات چاہیئے

ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ کیسے چھپے رہو۔ آخر ابن سالک ہو۔ اس کے بعد لاہور میں عبداللہ بٹ مرحوم کے ساتھ میں دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک ملاقات میں کہنے لگے۔ مجھے تمہاری آنکھوں میں سالکؔ کی شوخی نظر آتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سید احمد شاہ بخاری (پطرس) نے سالکؔ اور بخاری کو اچانک یک جا کر دیا۔ بچھڑے ہوئے دوست بغل گیر ہوتے۔ نہ بخاری کو یاد رہا۔ کہ سالکؔ نے اُن پر بخار اللہ شاہ عطائی کی پھبتی کسی تھی۔ اور نہ سالکؔ کو یاد رہا کہ بخاری نے انہیں بالک شالوی کہا تھا۔ دونوں تحریک خلافت کے دوران میں جیل میں اکٹھے رہے اور جیل کی دوستی پر حادثات کبھی اثر انداز نہیں ہوتے۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریکِ خلافت سے ہوا۔ تین سال قید بامشقت پائی۔ ۱۹۲۷ء میں شاتمِ رسولؐ راجپال

کے خلاف تحریک میں ایک سال اسیرِ فرنگ رہے۔ کانگرس نے ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی تو بخاری ایک ہندوستان گیر طوفانی دورے کے بعد چھ مہینے کے لئے اسیر ہو گئے۔ اس کے بعد پُرانے خلافتی کارکنوں نے مجلسِ احرارِ اسلام بنائی تو بخاری اس کی زینت بنے اور آخری دم تک اس سے وابستہ رہے۔ مجلسِ احرار کا دماغ مولانا مظہر علی اظہر تھے یا چودھری فضل حق۔ اور بخاری اس کے دل کی حیثیت رکھتے تھے۔ تحریک کشمیر چلی۔ تو دو سال کے لئے جیل میں بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں کئی بار گرفتار ہوئے۔ زندگی کے کم و بیش نو سال جیل میں گزار دیئے۔

شورش کاشمیری نے اُن سے یہ بیان منسوب کیا ہے۔ کہ

"زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی۔ ایک چوتھائی جیل میں۔ جتنے دنوں باہر رہا لوگ گلے کا ہار بنتے گئے۔ آج کلکتہ۔ کل ڈھاکہ۔ ڈھاکہ سے لکھنؤ۔ لکھنؤ سے بمبئی۔ پھر آگرہ۔ آگرہ سے دہلی اور دہلی سے لاہور۔ لاہور سے پشاور۔ پشاور سے کراچی۔ ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کر لو۔ ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی۔

دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

میں نے تقریر کی۔ لوگوں نے کہا واہ۔ شاہ جی۔ واہ میں قید ہو گیا۔ لوگوں نے کہا۔ آہ۔ شاہ جی۔ آہ۔ اور واہ واہ میں ہم ہو گئے تباہ۔!"

عنایت اللہ نے بچوں کے رسالے "ہدایت" سے صحافت کا آغاز کیا "تعمیر" (راولپنڈی) کو بنانے سنوارنے میں پیش پیش رہے۔ "کوہستان" کی بنیاد رکھی اور اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہاں حالات ناسازگار پائے۔ تو "مشرق" جاری کر لیا اور اسی کے ذریعے سے اُردو صحافت کو ایک ہمہ گیر تکنیکی اور موادی انقلاب سے آشنا کیا۔ مولانا کوثر نیازی نے دیارِ فرنگ کا پہلا سفر عنایت اللہ کی رفاقت میں کیا۔ جب دونوں وطن کو لوٹے تو انٹر کانٹی نینٹل میں اُن سے ایک صحبت ہوئی۔ میں نے مولانا سے کہا عنایت صاحب تو اکثر انگلستان جاتے رہتے ہیں اس لئے اُن سے پوچھنا بے کار ہے آپ بتائیے۔ یہ تجربہ کیسا رہا۔ مولانا اپنے تاثرات بیان کرنے لگے۔ تو میں نے کہا۔ صاحب! یہ باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ آپ انسانوں کا حال سُنائیے اچھے انسانوں کا! اُنہوں نے کشمیری مسلمانوں کا تذکرہ شروع کر دیا۔ میں کچھ دیر سنتا رہا۔ پھر کہا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

آپ شاعر ہیں۔ ادیب ہیں، خوش ذوق انسان ہیں اس لئے جمالیات کی طرف آئیے۔ کچھ شوخ و شنگ لعبتانِ فرنگ کا تذکرہ فرمائیے۔ مولانا میری جسارت پر کچھ پریشان سے ہوئے، پھر ہنس پڑے اور بولے لعبتانِ فرنگ سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ تو کیا بتاؤں؟ عنایت صاحب سے جب کہا۔ لندن کی سیر کراؤ۔ یہ مجھے کتابوں کی دکانوں پر لے گئے۔ اس لئے میں نے تو صرف کتابیں ہی دیکھی ہیں۔ مولانا کا یہ ارشاد عنایت اللہ کی اُس ادائے خاص کا غمّاز تھا جس نے مجھے ان کی شخصیت سے اتنا متاثر کیا

کہ میں نے اُن کا دامن تھام لیا اور وہ بھی اس مضبوطی کے ساتھ، کہ صرف موت کا بے رحم ہاتھ اُنہیں مجھ سے الگ کر سکا۔

عنایت اللہ میدانِ صحافت کے ایک نہایت چابک دست، ہوشیار اور ذہین اور ہر لحظہ چوکنا رہنے والے کھلاڑی تھے۔ ایسے لوگ کاغذی کتابوں کی جگہ کتابِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن عنایت اللہ میں علم کی پیاس اس شدت کے ساتھ موجود تھی کہ کبھی سمجھنے میں نہیں آتی تھی۔ اُنہوں نے صحافت پر بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر رکھا تھا اور جب کوئی نئی کتاب آتی تو اس کا مطالعہ کئے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ وہ انگلستان جاتے۔ تو نئی کتابیں خریدتے اور پڑھتے تھے۔ صحافت کے تازہ ترین رجحانات معلوم کرتے تھے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی انگریز صحافی کے شاگرد بن جاتے تھے اور نئے تجربات سے آگاہ ہوتے تھے۔ پھر جو چیز قابلِ عمل نظر آتی۔ اُسے پاکستان میں آزماتے تھے۔ یہاں بھی غیر ملکی اخبارات کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ اور تحقیق بھی کرتے تھے۔ اس تحقیق کی بدولت اُنہوں نے اُردو صحافت کو آفسٹ طریق طباعت سے آشنا کرایا۔ تصویری صحافت کو آگے بڑھایا۔ خبروں کی پیش کش اور اخباری صفحات کی میک اَپ کا انداز بدلا۔ مستقل عنوانات کے نئے سلسلے شروع کئے اور صحافت میں اُردو ٹائپ کو آفسٹ کے ڈھانچے کے اندر جاری کرنے کے لئے نجی طور پر تجربے کرتے رہے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اُردو صحافت فنی دوائر میں ترقی کے اور بہت سے مرحلے طے کر جاتی۔ کیونکہ اس کام میں تحقیق کے ساتھ ساتھ جرأت بھی درکار تھی۔ اور عنایت اللہ میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔

عنایت اللہ نے اُردو صحافت کو جس انقلاب سے آشنا کیا۔ اس کا

ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا ہو تو ہندوستان کے اُن اُردو اخبارات پر نظر ڈالیے جو کسی زمانے میں لاہور سے نکلتے تھے اور اب سرحد کے اُس پار چل رہے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ اخبار فنی اور تکنیکی اعتبار سے اپنے ہم عصر مسلمان اخباروں پر خاصی فوقیت رکھتے تھے۔ لیکن بے پناہ مالی وسائل اور اچھی اشاعت کے باوجود آج اُن کی حالت دگرگوں ہے۔ ان کا موازنہ پاکستان کے اُردو اخبارات سے کیجئے تو زمین اور آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ کیونکہ پاکستان کے اُردو اخبارات ہندوستان کے اُردو اخباروں سے بہت آگے ہیں۔ ہندوستان کے صحافتی جمود کی وجہ یہ ہے کہ وہاں اُردو صحافت کے دائرے میں کوئی صاحبِ جنوں، کوئی انقلاب پسند۔ کوئی علم کی پیاسی، کوئی جرأت سے عبارت شخصیت نہیں اُبھری۔ ایسے میں کون ہے جو عنایت اللہ کی شخصیت اور کردار کو خراجِ عقیدت ادا نہیں کرے گا؟ عنایت اللہ بلا مبالغہ پاکستان کی اُردو صحافت میں ایک عظیم انقلاب کے بانی تھے لیکن ان میں عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا تذکرہ آتا وہ حجاب آلود سے ہو جاتے اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہتے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اپنے اخبار سے مطمئن ہوں؟ ہرگز نہیں۔ بعض اوقات تو اخبار دیکھ کر شرمندہ سا ہو جاتا ہوں۔ کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ اور اس کے بعد وہ اُن طویل مجبوریوں کا طویل دفتر کھول دیتے۔ جو اُن کے راستے میں حائل تھیں اور اُن امکانات کا تذکرہ فرماتے جنہیں مجبوریاں ختم ہونے کی صورت میں بردئے کار لاکر صحافت کی نوک پلک اور سنواری جا سکتی تھی۔ میرے نزدیک عجز و انکسار کی ادا ہی نے ان کے ہاتھوں ایک انقلاب برپا کرا دیا۔ کیونکہ تکمیل کا احساس ترقی کا قاتل ہوتا ہے اور عدمِ تکمیل کا احساس آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے

میں نے عنایت اللہ سے بہت کچھ سیکھا۔ "مشرق" کے ابتدائی دور میں اُن کے ساتھ حقیقی رابطہ پیدا ہوا۔ اس سے پہلے مجھے تاریخِ صحافت میں تو درک حاصل تھا۔ صحافت کے مسائل کی بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ تھی لیکن عنایت کی مسلسل صحبت نے اس سمجھ بوجھ میں گہرائی پیدا کی۔ اور اُن مسائل پر تفکر کا ذوق پیدا کیا۔ جن سے پہلے نا آشنا تھا اور یہ اس لئے ممکن ہوا کہ دو چار ملاقاتوں میں انہوں نے جان لیا کہ زمین شور نہیں ہے۔ اگر بیج ڈالا جائے۔ تو نمو پائے گا۔ چنانچہ میں نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے تعاون سے ۱۹۶۴ء میں مغربی پاکستان کی صحافت اور اس کے مسائل پر مفصل رپورٹ مرتب کی تو اُنہی کی تجویز پر اور اُنہی کے تعاون سے میں نے "مشرق"، کے ابتدائی دور میں جدید اُردو صحافت پر ایک سلسلۂ مقالات قلمبند کیا تو انہی کے ساتھ مسلسل تبادلۂ خیالات کے بعد "فن صحافت" پر اُردو میں پہلی کتاب لکھی۔ تو انہی کی تحریک پر اور کالم نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ تو انہی کے کہنے پر۔ ایسے میں اُنہیں اپنا استاد اور مُرشد نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟

اُردو صحافت کی کلاسیکی شخصیتوں میں عنایت اللہ کے مقام کا تعین کوئی آسان کام نہیں کیونکہ وہ شخصیات اصلاً سیاسی شخصیات تھیں۔ اُن کے پیش نظر جو مقاصد تھے اُن کے حصول کے لئے صحافت کو وسیلہ بنایا گیا۔ گویا ان کے نزدیک سیاست کو صحافت پر فوقیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مستثنیات سے قطعِ نظر ان شخصیات نے فن پر اتنا زور نہ دیا جتنا آزادیٔ صحافت پر دیا۔ اور اس کے لئے اُنہوں نے جو قربانیاں دیں وہ لائق صد تحسین تھیں۔

عنایت اللہ اصلاً اخبار نویس تھے۔ سیاست سے اُن کا کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہر لحاظ

سے ایک اچھا اخبار مہیا کروں۔ ایک ایسا اخبار، جو ہر طبقے کے ذوق کی آسودگی کا سامان فراہم کرے۔ جو ہر طبقے کا ترجمان بنے۔ جو لیڈروں کے پہلو بہ پہلو چھوٹے کارکنوں کو بھی آگے بڑھانے میں مدد دے۔ جو سیاست کے ساتھ ساتھ زندگی کی دوسری ضروریات بھی مہیا کرے۔ جو برائیوں کی روک تھام میں پیش پیش ہو۔ اُن کا کارنامہ یہ تھا کہ فنی اعتبار سے اخبار کو اتنا مکمل بنا دیا کہ ہر خواندہ کنبہ اخبار کو زندگی کی ایک بنیادی ضرورت سمجھنے لگا۔ اس سے اخبارات کی اشاعت بڑھی گویا اُنھوں نے صحافت کو دولت مند، یا بارسوخ یا دانش ور طبقات تک، محدود نہ رکھا، بلکہ اسے عوام تک پہنچا دیا۔ اسی عوامی رنگ کی تخلیق نے عنایت اللہ کو تاریخِ صحافت میں ایک منفرد اور ممتاز مقام بخش دیا۔ عنایت اللہ آزادیٔ صحافت کو یقیناً پسند کرتے تھے لیکن اُن کا نظریہ یہ بھی تھا کہ اگر اظہارِ خیال کے کچھ دریچے بند ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو دریچے کھلے ہیں اُنھیں بھی استعمال میں نہ لایا جائے۔ کیونکہ پابندیوں کے زمانے میں بھی ایسے مواقع موجود رہتے ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر عوام کی خدمت کی جا سکتی ہے اور اُنھوں نے اس تصور کو بھی غلط ثابت کر دیا کہ اشاعت بڑھانے کے لئے حکومت کی جا بجا مخالفت ضروری ہے۔ اُنھوں نے ایک ایسے دور میں صحافتی انقلاب کا پرچم بلند کیا۔ جب فکر و خیال پر بڑی بڑی پابندیاں عائد تھیں لیکن اُنھوں نے خدمتِ عوام کے نئے وسیلے تلاش کر لئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس دور میں اخباری اشاعتوں میں بے پناہ اضافے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

عنایت اللہ کی نجی زندگی کے ایک پہلو کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصے تک کنوارے رہے۔ ایک دفعہ میں نے کہا۔ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کہنے لگے۔ صحافت سے جو شادی کر رکھی ہے۔ بیں

نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن شادی اپنی جگہ پر ضروری ہے۔ پوچھنے لگے۔ اس سے کیا ہوگا؟ میں نے کہا ایک پُرسکون زندگی میسّر آئے گی۔ آپ کو زندگی حاصل ہو جائے گی اور اس طرح رہن سہن نارمل ہو جائے گا۔ پھر اُولاد ہوگی جو آپ کا نام روشن کرے گی۔ یہ بات اُن کے دل کو لگی اور سنجیدگی سے کہنے لگے۔ اچھا۔ اس پر غور کریں گے۔ چند مہینے بعد ایک خاتون نے اُن سے راہ و رسم پیدا کی اور شادی کا مسئلہ بھی زیرِ غور آیا۔ وہ خاتون تعلیم یافتہ تھیں۔ عنایت اللہ سے میری دوستی کی وجہ سے مجھے ملیں اور مدد کی طلب گار ہوتیں لیکن مجھے ان کی باتوں میں کاروباری پہلو نظر آیا جو مجھے پسند نہ آیا کیونکہ شادی کا رشتہ تو محبت کا ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے اسے کاروبار سے کیا واسطہ۔ چنانچہ ایک بار عنایت اللہ سے تذکرہ ہوا۔ تو یہ خاتون خارج از بحث ہو گئیں۔ اور بہ ظاہر شادی کا ارادہ ہی ترک ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کا بھانجا انتقال کر گیا تو اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔ اس سے ازدواجی ضرورت بھی پوری ہو گئی اور خاندان کی ایک لڑکی کو حفاظت کا سامان بھی حاصل ہو گیا۔ انہی کے بطن سے عنایت اللہ کا بیٹا پیدا ہوا۔ جو ماشاءاللہ پھل پھول رہا ہے۔

عنایت اللہ کی شخصیت نہایت دلآویز اور پُرکشش تھی۔ وہ دوستوں کے دوست تھے اور دشمنوں کے ہمدرد تھے۔ مخالفوں کے بارے میں شاذ ہی گفتگو کرتے تھے۔ ذکر آتا تو ہنس دیتے تھے۔ لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بڑی سے بڑی پریشانی میں بھی اُن کا چہرہ پُرسکون ہوتا تھا۔ اور گفتگو متوازن۔ ہر شخص کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے۔ کسی کارکن کو غلطی پر ٹوکتے۔ تو ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ۔ کارکنوں کے دلی خیر خواہ تھے لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جن کے تذکرے کا حق اقبال زبیری کو ہے یا ریاض بٹالوی کو

جن سے اُن کا گہرا ساتھ تھا۔

رہی عنایت اللہ کی ابتدائی زندگی۔ تو میں اُس سے بہت کم واقف ہوں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ انہوں نے "ہدایت" اور "تعمیر" سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور حُسنِ اتفاق سے "ہدایت" اور "تعمیر" کے بانیوں سے میرے ایک عمر کے نیاز مندانہ تعلقات ہیں اور میں اُن کی شرافت اور صلاحیت شناسی کا قائل ہوں۔ اُن میں ایک تو خاندان کے بزرگ اعلیٰ شیخ محمد نصیر ہمایوں ہیں۔ دوسرے اُن کے فرزند شیخ محمد احسن اور اُن کے برادرانِ عزیز۔ عنایت اللہ کی شخصیت کی تعمیر میں اُن کا بڑا حصّہ ہے کیونکہ ابتدائی تجربے کے مرکز کو "ہدایت" اور "تعمیر" ہی تھے۔

علامہ عنایت اللہ المشرقی حقیقی معنوں میں قدآور بلکہ دیو قامت شخصیت کے مالک تھے۔ علمی اعتبار سے اتنے لائق و فائق تھے کہ اس صدی کے آغاز میں جب مسلمانوں میں ذہین اور طباع نوجوان ٹانواں ٹانواں نظر آتے تھے انہوں نے ایم۔ اے (ریاضی) میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی کیمبرج یونیورسٹی میں مقابلے کے امتحان میں اوّل آکر وظیفہ حاصل کیا۔ ریاضی کا "ٹرائی پاس" لیا اور "اوّل آکر" کے اعزاز سے فیضیاب ہوئے علوم مشرقی علم طبیعات اور انجینئرنگ کی ڈگریاں لیں۔ برطانیہ کے علمی رسائل و جرائد میں تحقیقی مقالے لکھے۔ اتنے اعزازات امتیازات شاید ہی کسی ایک شخصیت میں کبھی مرتکز ہوئے ہوں۔

انڈین ایجوکیشنل سروس میں آئے۔ اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل بنے۔ اُنہیں تمام دنیاوی سہولتیں حاصل تھیں لیکن انہوں نے سرکاری ملازمت

پر لات ماری۔ خاکسار تحریک کا آغاز کیا اور خود بھی خاکساری کو شعار بنایا۔ توفیق کے باوجود کبھی کار نہ رکھی۔ ہمیشہ خاکی وردی میں ملبّس رہے۔ جب گھر سے نکلتے تو بس میں سفر کرتے۔ یا سواریوں کے تانگے یا ٹم ٹم میں۔ گویا اس بات کو بھی شان و شوکت کی علامت سمجھا کہ پورا تانگہ لے کر اس میں اکیلے بیٹھیں۔ میں نے اکثر یہ دیکھا کہ اچھرے سے ماڈل ٹاؤن بس یا ادمنی بس میں سوار ہوئے اور بیٹھنے کو جگہ نہ ملی تو چھت کا ڈنڈا تھام کر کھڑے سفر کیا اور یہ روایت آخری دم تک جاری رکھی۔ ۱۹۴۱ء میں میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں رپورٹنگ کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ ایک بار اُن سے اچھرہ میں ملاقات کی۔ وہ جہاں بیٹھے تھے اسے دیکھ کر کچھ ایسا احساس ہوا جیسے محاذِ جنگ پر کسی درویش صفت کمانڈر کی خدمت میں حاضر ہوں۔

اُن کی تنظیمی قابلیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خاکسار تحریک کو چند سالوں کے اندر اندر اتنی عظمت اور وسعت عطا کی کہ پشاور سے رنگون تک اور ہمالہ سے راس کماری تک لاکھوں باوردی خاکسار منظم ہو گئے۔ تحریک کا مقصد تھا۔ غلبۂ اسلام۔ اس کے لئے عسکری تنظیم کو ذریعہ بنایا۔ خاکی وردی "اخوت" کا سرخ نشان اور ایک چمکتا دمکتا بیلچہ۔ یہ تھے وہ تین عناصر، جو خاکساروں کو دوسروں سے ممیز کرتے تھے۔ عسکری تنظیم کو کامیاب بنانے کے لئے ضبط و نظم کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ عسکری کیمپ لگائے۔ مصنوعی جنگوں کا سلسلہ جاری کیا۔ اطاعتِ امیر کا سبق سکھایا۔ اور جو لوگ اس سے سرِ مُو انحراف کرتے انہیں سرِ عام دُرّے لگائے جاتے تھے اور وہ اس سزا کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ خاکساروں کا حسین ترین پہلو یہ تھا کہ یہ لوگ خدمتِ خلق کے لئے ہر لمحہ تیار رہتے۔ چندے کی رسم نے مسلمانوں کی بہت سی

تحریکوں کو ڈبو یا تھا۔ علامہ مشرقی نے یہ رسم ہمیشہ کے لئے ختم کر دی۔ چنانچہ اس تحریک میں شرکت کے لئے کوئی چندہ مقرر نہیں تھا۔ خاکسار اپنے پلے سے وردی بناتا، بیلچہ خریدتا اور کیمپ میں آتا، تو ایک وقت کی روٹی کے لئے چھ پیسے ہمراہ لاتا تھا۔

علامہ مشرقی نے عوام میں قربانی اور ایثار کا جو جذبہ پیدا کیا وہ برعظیم کے مسلمانوں کی اجتماعی سرگرمیوں میں نظیر نہیں رکھتا تھا۔ ۱۹ر مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں اور برطانوی سامراج کے درمیان جو تصادم ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حکومت نے نیم عسکری تنظیموں پر پابندی لگا رکھی تھی۔ خاکساروں نے اسے قبول نہ کیا اور تین سو تیرہ خاکساروں کا ایک دستہ سر سے کفن باندھے بھاٹی دروازے کے اندر اونچی مسجد سے پریڈ کرتے ہوئے نکلا۔ پولیس نے تھانہ ٹبی کے قریب اسے روکنے کی کوشش کی۔ خاکسار نہ رکے۔ اس پر تصادم ہو گیا۔ ایک انگریز ڈی ایس پی اور ایک سپاہی مارا گیا۔ پولیس نے گولی چلائی اور خاکساروں کو آس پاس کے گھروں سے نکال کر گولی کا نشانہ بنایا۔ پچاس کے قریب خاکسار شہید ہو گئے اور دو سو کے قریب گرفتار ہو گئے۔ ان کے خلاف سنٹرل جیل میں مقدمہ چلا۔ جس دن فیصلہ ہوا میں رپورٹر کی حیثیت سے موجود تھا۔ کیا بتاؤں، کہ میں نے کیا دیکھا؟ انیس خاکساروں کو عمر قید کی سزا ملی۔ کچھ خاکساروں کو دس دس سال قید کی اور کچھ کو پانچ پانچ سال قید کی جب سیشن جج جناب خالشا ایک دستے کو سزا سناتے تو سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ سال کی نو عمر خاکساروں کے چہرے مسرت سے کھل جاتے۔ میں نے کسی ایک خاکسار کے چہرے پر بھی کوئی سراسیمگی، کوئی پریشانی نہ دیکھی۔ لاریب مبارک ہیں وہ لوگ۔ جو اپنے مقصد کے لئے قربانی دیتے ہیں اور وہ بھی

ہنستے کھیلتے، خوشی خوشی کے ساتھ۔

اس سانحہ کے ایک سال بعد میں اور "احسان" کے رپورٹر سردار فضلی اُنہیں ملے۔ اُنہوں نے تصادم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی جزوی ذمہ داری میاں محمد شفیع (م۔ش) پر عائد ہوتی ہے، جنہوں نے رپورٹر کی حیثیت سے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں مسلسل خبریں اس انداز سے شائع کیں جیسے خاکسار لاہور پر یلغار کر رہے ہیں اور مورچے باندھ رہے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں میں نے م۔ش سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ کہنے لگے کہ میں جونیئر رپورٹر تھا۔ اس لئے اُن خبروں کی اشاعت کے لئے میں ذمہ دار نہیں تھا۔ وہ خبریں سینئر رپورٹروں نے حکومت کی انگیخت پر دی تھیں۔ ایک مرحلے پر کسی خبر رساں ایجنسی نے خبر دی کہ علامہ مشرقی مسلم لیگ میں شامل ہو کر خاکساروں کو لیگ کا عسکری بازو بنا دیں گے۔ میں نے اس بارے میں علامہ مشرقی سے انٹرویو لیا تو اُنہوں نے شد و مد کے ساتھ اس کی تردید فرمائی اور کہا کہ یہ خبر محض ایک افسانہ ہے۔ اگر علامہ مشرقی مسلم لیگ کے ساتھ محاذ آرائی کی روش پر نہ چلتے۔ اور تعاون کی کوئی راہ نکل آتی۔ خاکسار تحریک مسلمانوں کے لئے ایک عظیم اثاثہ ثابت ہوتی اور ۱۹۴۷ء کے قتل عام میں مسلمانوں کا جو مالی اور جانی ضیاع ہوا۔ اس کی شدت میں بہت کمی ہو جاتی۔ لیکن افسوس۔ ایسا نہ ہو سکا اور خاکسار تحریک لاہور کے تصادم کے بعد اور لیگ سے محاذ آرائی کی وجہ سے مسلسل کمزور ہوتی چلی گئی۔

علامہ عنایت اللہ المشرقی کی شخصیت بہت عظیم تھی لیکن خاکسار تحریک کی وسعت اور ہمہ گیری نے اُن میں ایک انا پیدا کر دی جس پر وہ قابو نہ پا سکے۔ اس انا نے اُنہیں طرح طرح کے ایسے مسائل میں الجھا دیا

جن سے تحریک کا شیرازہ پارہ پارہ ہو گیا۔ اُن کے مزاج میں تلوّن نے بھی اپنا کردار ادا کیا، کیونکہ یہ تلوّن ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لینے اور ایک محتاط پالیسی کی تشکیل میں حائل رہا۔ اُن کی ایک اور کمزوری یہ بھی کہ جیل میں رہنا ناپسند کرتے تھے اور رہائی کے لئے ایسی مفاہمت کر لیتے تھے جس سے تحریک کی ساکھ کو ضعف پہنچ جاتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد اُنہوں نے انڈو پاکستان اسلام لیگ قائم کی۔ اس کا مقصد بھی غلبۂ اسلام تھا۔ چنانچہ ایک مرحلے پر اُنہوں نے ہندوستان پر یلغار کی ٹھانی اور سرحد کے قریب خاکساروں کے کیمپ بھی قائم کر دیئے جنہیں حکومت کو اٹھوانا پڑا۔ موصوف میں مبالغہ آمیزی کا بھی بہت شوق تھا۔ جن دنوں تحریک عروج پر تھی۔ مبالغہ چل جاتا تھا۔ لیکن جب تحریک بے جان ہو گئی تو مبالغہ مذاق اور تمسخر کا موضوع بن جاتا تھا۔ بہر حال خاکساروں میں اتنی سخت جانی ضرور موجود تھی۔ کہ بہت سے لوگ مدّتوں اس کے نام لیوا رہے۔ ۱۹۷۰ء میں پنجاب پولیس نے ہڑتال کر دی تو سینکڑوں خاکسار خاکی وردی میں ملبّس اور اُخوت کا سُرخ نشان لگائے۔ خدمتِ خلق کے لئے میدان میں آ گئے اور ٹریفک کنٹرول کرتے رہے۔ تحریک کے باقیات اب بھی موجود ہیں جن میں یاسین بٹ بہادر سرِ فہرست ہیں جو روزنامہ "وقت" کے ذریعے سے تحریک کا پرچم بلند رکھتے ہیں۔ امیر حبیب اللہ سعدی اور میاں بشیر احمد اور بیگم مشرقی بھی وقتاً فوقتاً تحریک میں انجکشن دینے کی سعیٔ ناکام میں مصروف رہے ہیں۔

عبدالباقی ایک موٹے تازے، خوش لباس، خوش گفتار، صاحب علم

اور سنجیدہ صحافی تھے۔ پیشے کا آغاز لاہور میں کیا۔ پھر دلّی چلے گئے۔ خدا جانے کہاں کہاں کام کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات قریب آئے تو ملک خضر حیات ٹوانہ اور مسلم لیگ میں ٹھنی ہوئی تھی۔ مدیرانِ انقلاب کسی زمانے میں ملک خضر حیات کے مشیر سمجھے جاتے تھے لیکن وہ پاکستان کی مخالفت گوارا نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ملک صاحب لیگ سے وابستگی ہی کا دعویٰ کرتے رہیں۔ ملک صاحب کو یہ لائن منظور نہیں تھی اس لئے اُنہوں نے عبدالباقی کو دِلّی سے درآمد کیا۔ اُنہیں محکمہ تعلقاتِ عامہ میں بھی عہدہ دیا اور یونینسٹ پارٹی کی نشر و اشاعت بھی سونپی۔ اور "شہباز" کی پسِ پردہ رہنمائی بھی اُن کے حوالے کر دی۔ وہ سردار پٹیل کے محبوب تھے پکّے کانگرسی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی عقیدت کا دم بھرتے تھے ایسے میں اُنہوں نے نشر و اشاعت کو ایسا رنگ دیا کہ ملک خضر حیات کی زمیندارہ لیگ اور یونینسٹ پارٹی مختلف نظریات رکھنے کے باوجود کانگرس کے دُم چھلّے نظر آنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو تھوڑے بہت لوگ ابھی تک پارٹی کے نام لیوا تھے وہ بھی رسّہ تڑا کر بھاگ گئے اور انتخابات میں پارٹی کی نہایت عبرت ناک پٹائی ہو گئی۔ اس کے بعد شہرِ خاں نے ملک خضر حیات کو مشورہ دیا کہ سیاست سے الگ تھلگ ہو جائیں لیکن یہاں بھی عبدالباقی اور اُن کے ساتھیوں نے ایسی تار ہلائی کہ ملک خضر حیات نے چھ سات مسلمان ممبروں کو ساتھ لے کر کانگرس کے ساتھ مل کر کولیشن بنالی اور اس طرح رہا سہا وقار بھی مٹی میں ملا دیا۔ عبدالباقی کے ساتھ میری راہ و رسم محض مجلس کی تقریبات تک محدود تھی۔ نہ میں کبھی ان کے ہاں گیا نہ وہ کبھی ہمارے ہاں آئے۔ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے وہ دلّی کو

لوٹ گئے۔ گویا ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جب یاد آتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے:۔ "میں نے باغ میں دیکھا کہ پانی کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ سوال کیا۔ کیوں رو رہی ہو؟ بولی۔ میرا بیٹا اس باغ میں آکر زمین میں جذب ہو گیا۔ اس کے فراق میں، مَیں رو رہی ہوں۔ میں نے پھولوں اور پھلوں کی ہری بھری ٹہنیاں اس کے آگے جھکا دیں۔ اور کہا کہ دیکھ تیرا بیٹا خاک میں ملنے کے بعد اب پھولوں اور پھلوں میں ہے اور سبز پتوں میں ہے۔ پس انسان بھی جب تک اپنے آپ کو پانی کی طرح خاک میں نہیں ملاتا پھلوں اور پھولوں کی صورت میں نمودار نہیں ہو سکتا۔" جو لوگ انسانیت کے سینے میں فکر و خیال کی قندیلیں روشن کرتے ہیں۔ اسے زندگی کے حسن و جمال سے آگاہ کرتے ہیں۔ تعمیر کی نت نئی پگڈنڈیاں نکالتے ہیں۔ اخلاق و کردار کے نشو و نما کے راستے سجھاتے ہیں اور عظمتِ آدم اور شرفِ انسانی کی نگہبانی کرتے ہیں۔ ان کی برسوں کی ریاضت کبھی ناکام نہیں رہتی۔ بلکہ اس ریاضت کے بطن سے ایک ایسا سدا بہار گلشن آباد ہوتا ہے جس کی بُو باس میں ان کے مرنے کے بعد بھی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کلیاں چٹکتی ہیں پھول کھلتے ہیں۔ لالہ و گُل کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں اور اُن کی مہک سے ایک عام منظر ہوتا ہے تا آنکہ کوئی نئی شخصیت اُٹھتی ہے اور کاروبارِ گلشن کو ایک نیا رنگ اور ایک نئی مہک عطا کرتی ہے اور اس طرح انسانیت ارتقا کی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم بھی ایک ایسی ہی شخصیت کے حامل تھے جس کی ہمہ گیری نے ایک پُورے دور کو متاثر کیا۔ میں فلسفے کا طالب علم نہیں ہوں۔ نہ مجھے فلسفے کی گھمبیر اصطلاحات کے ادراک کا دعویٰ ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ خلیفہ عبدالحکیم نے اُس زمانے میں ہمیں روشنی دکھائی۔ جب تاریکی اتنی تھی کہ کچھ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب انسان نے انسان کا گلا کاٹا، عصمتوں کے فانوس بجھے، شہر جل گئے اور بستیاں اُجڑ گئیں اور نگر نگر میں سسکیوں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تو اس عہد کی نوجوان نسل اس سوچ میں پڑ گئی کہ آیا مذہب کا منشا یہی ہے۔ علمائے نئی نسل کی زبان سے ناآشنا تھے اس لئے وہ جو کچھ کہتے۔ اس سے شکوک بڑھتے ہی تھے۔ کم نہیں ہوتے تھے اور کلامِ اقبال محض نعرہ زنی کا ذریعہ بن رہا تھا۔ ایسے میں خلیفہ عبدالحکیم کی تصانیف نے نئی نسل کو سنبھالا دیا اور دین پر اعتماد کو بحال کیا۔ ان کی کتاب "اسلامک آئیڈیالوجی" نے عصرِ حاضر کی نسل سے عصرِ حاضر کی سائنسی زبان میں خطاب کیا اور سوچنے سمجھنے والے نوجوانوں کو معلوم ہوا کہ اسلام وہ نہیں جو وہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اسلام ایک جاندار نظامِ حیات ہے جو انسانیت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں کی خوبیاں بدرجہ احسن موجود ہیں اور خرابیوں کا نشان تک نہیں اور اگر اسلامی نظریہ ریاست کو عمل میں لایا جائے تو اس دُکھی معاشرے کے سارے روگ دُور ہو جائیں گے اور اس کی روحانی اور مادی نجات کا سامان فراہم ہو جائے گا۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی، ماہنامہ "ثقافت" جاری کیا اور اہلِ دانش اور حقیقت بین علمائ کو اپنے گرد جمع کیا۔ اور مطبوعات اور مقالات کا ایک ایسا سلسلہ شروع

کیا جس میں اسلام کی لبرل روایات کو پیش کیا اور روزمرّہ مسائل اور معاشری معاشی اور سیاسی دوائر میں جتنی الجھنیں ذہنوں میں پیدا ہو رہی تھیں۔ اُنہیں سلجھانے کی سعی فرمائی۔ لاریب یہ ایک ایسی خدمت تھی جس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا محال ہے۔ وہ اس مہم میں کامیاب ہوئے کیونکہ اُن میں اس قسم کی ذہنی قیادت کے تمام عناصرِ ترکیبی موجود تھے۔ ایک طرف انہیں دین پر کامل عبور تھا۔ اور حضور سرورِ کائنات ﷺ سے بے پناہ پیار تھا۔ دوسری طرف عصرِ حاضر کے علوم میں اُن کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ وہ مشرقی اور مغربی علوم پر بیک وقت حاوی تھے۔ اور ایک سائنسی انداز میں قدیم و جدید کا امتزاج پیش کرتے تھے۔

"فکرِ اقبال" کی تالیف اُن کا دُوسرا بڑا کارنامہ تھا۔ ایک طرف فلسفے کے مسائل کا کامل اِدراک۔ دوسری طرف اقبال سے بے پناہ قرب تیسرے کلامِ اقبال کا گہرا مطالعہ اور چوتھے سلیس اور سادہ اندازِ بیان ان چاروں عناصر نے "فکرِ اقبال" کو چار چاند لگا دیئے۔ یوں تو کلامِ اقبال پر کئی عالم و فاضل لوگوں نے اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے اور اُن میں سے بعض حضرات کی تالیفات کا بڑا مقام ہے لیکن "فکرِ اقبال" ان سب سے ممتاز ہے۔ کیونکہ اس میں نہ وہ ابہام موجود ہے جو اکثر فضلاً کی تحریر میں ہوتا ہے نہ اس کی تحریر اتنی ادق ہے کہ بہت تھوڑے لوگ سمجھ سکیں۔ اس کی زبان نہایت شگفتہ، رواں، سادہ اور عام فہم ہے جسے ایک عام پڑھا لکھا شخص بڑی خوبی سے سمجھ لیتا ہے۔ اور یہی اصل عالم کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے پر قادر ہو۔

خلیفہ عبدالحکیم میرے دوست نہیں تھے۔ میرے والد مرحوم کے دوست تھے۔ میرے تو وہ بزرگ تھے لیکن جب ملتے تو بے تکلف دوستوں کی طرح۔ مری کی مال روڈ پر، لِن ٹائنس اور سیمنز کے رنگین گوشوں میں۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے دفتر میں، مجلسی تقریبات میں اور خود اپنے گھر پر، جہاں ملاقات ہوتی۔ لُطف آجاتا۔ اُن کے ایک رفیق کار نے خلیفہ صاحب سے یہ بیان بالکل صحیح منسوب کیا ہے کہ "میں جب کسی سے ملتا ہوں تو مساویانہ سطح پر ملتا ہوں۔ وہ یوں، کہ اگر وہ اپنے آپ کو مجھ سے چھوٹا تصور کرتا ہو تو اُسے اُوپر کھینچ کر اپنی سطح پر لاتا ہوں۔ پھر گفت گو کرتا ہوں"

خلیفہ عبدالحکیم بہت بڑے عالم تھے۔ بہت شفیق تھے۔ دوست نواز تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی وہ انسان تھا جو اُن کی شخصیت میں رچا لبسا تھا۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بارے میں مَیں کیا لکھ سکتا ہوں؟ کہاں وہ: کہاں میں۔ غائبانہ تعارف ایک عرصے سے تھا کیونکہ مسلم لیگ کی تحریک اور اُردو تحریک میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اور مولوی عبدالحق بھی قومی ہیرو تھے۔ سہ ماہی مجلّہ "اُردو" جن دنوں حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا اُس وقت سے زیرِ مطالعہ تھا۔ اور مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ جب ۱۹۳۷ء میں مَیں نے اسلامیہ کالج کے مجلّہ "فروغِ مشرق" میں شیخ محمد اکرام کی کتاب "غالب نامہ" پر پوسٹ مارٹم نما تنقید لکھی۔ تو وہ بابائے اُردو کی بھی نظر سے گزری۔ اور اُنہوں نے "اُردو" میں "غالب نامہ" پر تبصرہ کیا۔ تو میری تنقید کا بھی حوالہ دیا۔ اس کے بعد ہم مختلف علمی اور ادبی تقریبات پر اُن سے پیغام

منگواتے رہے۔ اُن سے ایک ہی ملاقات ہوئی اور وہ ۱۹۵۹ء میں۔ والد مرحوم دمہ قلبی کے پہلے حملے کے بعد کسی قدر تندرست ہوئے تو بابائے اُردو اُن کی عیادت کو مسلم ٹاؤن تشریف لائے۔ اس نشست میں میں بھی موجود تھا۔ اُن کے سامنے چائے رکھی گئی اور چائے کے ساتھ دو چار چیزیں بھی تھیں والد مرحوم نے باتیں کرتے کرتے برفی کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ تو بابائے اُردو کی بزرگی کی رگ پھڑکی۔ ڈانٹ کر کہا۔ بدپرہیزی نہ کرو۔ صحت کا خیال رکھو۔ اس پر والد ہنس دیئے۔ اور بولے۔ آپ کا مشورہ بالکل بجا ہے۔ بعد میں میں نے والد سے کہا۔ کہ مولانا عبدالحق نے تو آپ کو بچہ سمجھ لیا۔ وہ بولے تمہارے لئے بزرگ ہوں۔ لیکن اُن کے لئے تو بچہ ہوں!

کیا بات تھی۔ مولوی صاحب کی! ہندوستان میں رہے تو اُردو کے لئے لڑتے لڑتے ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ پاکستان میں آئے۔ تو یہاں بھی قسمت میں لڑنا ہی لکھا تھا اور یہ حسرت اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ کہ پاکستان میں قومی زبان کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو۔

عبدالخالق قریشی اے۔ کے۔ قریشی کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ کسی زمانے میں کارکن صحافی تھے۔ لیکن جب اُن سے میری ملاقات ہوئی تو وہ صوبہ سرحد کے انفرمیشن سیکرٹری تھے۔ اُنہوں نے ”انقلاب“ میں شائع شدہ ”قابلِ اعتراض“ مواد پر مجھ سے بازپرس فرمائی اور جواب سخت ملنے پر کچھ پریشان ہوئے بہرحال اُن سے رابطہ قائم رہا۔ ایک مرحلے پر وہ حکومت پنجاب کے انفرمیشن سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ میں یونیورسٹی میں ایک سازش کا شکار ہو گیا۔ قریشی صاحب سے ملا تو وہ کہنے لگے

کہ سرکاری ملازمت کے دوران میں میں اس مفروضے کی بنا پر چوکنا رہتا ہوں کہ میرا قریب ترین افسر اور قریب ترین ماتحت، دونوں میرے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بھی یہی کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اس طریق کار کو اپنا نہ سکا۔

عبدالحق قریشی کے بارے میں بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ اُردو صحافت کی ترقی کے لئے بہت کوشاں رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اُردو ٹیلی پرنٹروں کے بغیر اُردو اخباروں میں کام کرنے والے صحافیوں کی کارکردگی میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے خدوجہد کرتے رہے۔ جرمنی کی ایک کمپنی سے اُردو ٹیلی پرنٹروں کی تیاری کے سلسلے میں بات چیت کی۔ اور حکومت سے آٹھ لاکھ روپے کی منظوری کے لئے کوشش کر رہے تھے کہ سانحۂ قاہرہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ان کے بعد اُردو ٹیلی پرنٹر نصب کئے گئے لیکن غیر سنجیدہ انداز میں نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں بہت جلد اٹھا لینا پڑا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اُردو ٹیلی پرنٹر محض ایک خواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پیرزادہ عبدالستار سندھ کے سیاست دان تھے۔ بڑے وجیہہ اور لباس کے معاملے میں بہت خوش ذوق۔ حکومتِ پاکستان کی غالباً پہلی کابینہ میں وزیر خوراک تھے۔ میں "انقلاب" کا نامہ نگار خصوصی تھا۔ اسی حوالے سے اُنہیں دیکھا اور سُنا۔ ایک بار اُنہوں نے گورنر ہاؤس میں پریس کانفرنس بلائی سب اخبار نویس پہنچے اور لگے انتظار کرنے۔ پیرزادہ مرحوم گورنر ہاؤس ہی میں موجود تھے لیکن صوبائی وزرا کے ساتھ کسی اہم مسئلے پر تبادلۂ خیالات میں اتنے

گم ہوئے کہ پریس کانفرنس کا خیال نہ رہا۔ اخبار نویس بھی بھنّے خاں ہوتے ہیں جب پینتالیس منٹ تک پیرزادہ نہ آئے تو وہ سب واک آؤٹ کر گئے اور فیصلہ کیا کہ وزیرِ خوراک کو اس دن کے لئے بلیک آؤٹ کر دیا جائے۔ چنانچہ جب پیرزادہ صاحب پریس کانفرنس میں آئے تو وہاں ریڈیو پاکستان کا نمائندہ تھا یا افسرانِ تعلقاتِ عامہ۔ دوسرے دن اس کانفرنس کی رُوداد کہیں نہ آئی۔ بہرحال یہ ناراضگی عارضی تھی۔ جب دوسری مرتبہ پیرزادہ عبدالستار لاہور تشریف لائے تو پریس کانفرنس میں حاضری مکمل تھی۔ وہ بھی وقت پر آئے بڑا خوشگوار ماحول تھا۔ بے تکلفی کا عالم تھا۔ کانفرنس اختتام کو پہنچی تو ہم لوگوں نے گانے کی فرمائش کی۔ وہ اس لئے کہ موصوف کو موسیقی میں بہت درک تھا اور سُنا تھا کہ ستارنوازی میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے کچھ پس وپیش کی۔ پھر کہنے لگے کہ سازوں کے بغیر گانے کا لُطف نہیں آتا۔ بہرحال آپ لوگوں کو ایک غزل سنا دیتا ہوں۔ چنانچہ کلاسیکی رنگ میں ایک غزل سُنا دی۔ اخبار نویس باغ باغ ہو گئے اور ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے

حاجی عبدالشکور اللہ بخشے بہت نیک بزرگ تھے۔ سفید بال، رنگ گورا، کمر جھکی ہوئی۔ مال روڈ پر دہلی ہاؤس کے مالک تھے۔ عیدالفطر اور عیدالضحیٰ کے مواقع پر اُن سے باقاعدہ ملاقات ہوتی تھی۔ صبح سویرے والدِ مرحوم کے ساتھ ہم دونوں بھائی ان کے ہاں پہنچتے۔ حاجی صاحب کے دونوں فرزند بھی ہوتے۔ سب مل کر بادشاہی مسجد جاتے۔ نماز ادا کرتے اور اس کے بعد اُنہی کے ہاں ناشتے کی تقریب ہوتی۔ اس میں بڑے بڑے بزرگ شامل ہوتے تھے۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی، محمد نقی رئیسِ

اعظم لاہور، پروفیسر قاضی محمد اسلم اور حکیم ظفر یاب وغیرہ۔ کچھ علمی و ادبی لطائف ہوتے، بڑے بوڑھے خضاب وغیرہ کے موضوعات پہ دلچسپ تبادلۂ خیالات کرتے۔ حضرت شفاؔ الملک کے انتقال کے بعد یہ محفل تو جاری رہی لیکن اس میں وہ دلچسپی اور دلبستگی باقی نہ رہی۔ پھر محمد تقی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور جب حاجی صاحب اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ تو یہ محفل قصۂ پارینہ بن گئی۔

حاجی عبدالشکور اور اُن کے فرزند مشرقی روایات اور اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ اُن کے گھر جا کر یُوں محسوس ہوتا کہ جیسے پُرانے زمانے کی دلی کے کسی گھرانے میں موجود ہیں۔ ناشتے میں انواع و اقسام کی چیزیں ہوتی تھیں جن میں دِلی کی مخصوص ڈشیں بھی ہوتی تھیں۔ لیکن لذیز ترین چیز تو حاجی عبدالشکور کی شفقت اور محبت تھی۔ جو ہم لوگوں پر بے حساب نچھاور ہوتی تھی۔ اُن سے ملاقات عیدین کا لازمہ تھی اور سچ پوچھیئے تو اس محفل کے اُجڑ جانے کے بعد ہماری عیدیں سُونی ہو گئیں۔

پروفیسر سید عبدالقادر ساری عمر اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ پڑھاتے رہے۔ وہ اس موضوع پر چند اچھی درسی کتب کے مصنف تھے لیکن تحقیق کے دائرے میں شاذ ہی قدم رکھا۔ سیاست سے کنارہ کش رہے۔ لیکن سیاسی کارکنوں کی مدد کرتے رہے۔ تجارت کا ذوق نہیں تھا لیکن پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں نے جو تجارتی ادارے لاہور میں قائم کیے سید صاحب نے اُن میں پیسہ لگایا۔ ہمیشہ مالی نقصان اٹھایا۔ بیشتر زندگی تدریس میں گزاری لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کتابوں کی ایک بڑی

دکان کھول لی۔ وہ مالی اعتبار سے مرفع الحال تھے۔ لیکن رہن سہن ہمیشہ نہایت سادہ رکھا اور لباس کے معاملے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کفایت شعار تھے۔ طبیعت پر سنجیدگی بڑی طرح غالب تھی اس لیے شگفتگی کم نظر آتی تھی۔

اسلامیہ کالج کو انہوں نے بنایا، سنوارا، پاکستان بننے سے پہلے جب مسلمانوں میں تعلیم کا شوق کم تھا تو وہ مولانا علم الدین سالک کی رفاقت میں ہر سال میٹرک اور ایف۔ اے کے یونیورسٹی نتائج کے بعد اخبارات میں ایسے مضامین لکھتے تھے جن میں مسلمانوں سے اپیل کی جاتی تھی کہ وہ اپنی اُولاد کو شمالی ہند کی واحد اسلامی درس گاہ اسلامیہ کالج میں داخل کرائیں۔ بڑے اعلیٰ پائے کے اُستاد تھے۔ لیکچر آہستہ رفتار سے دیتے۔ ہر فقرے کو مختلف الفاظ میں دہراتے۔ تاکہ مطلب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور نوٹس مرتب کرنے میں آسانی ہو۔ مجھے بھی اُن کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ اُن کے ساتھ ہمارا خاندانی سطح پر تعلق تھا۔ کسی زمانے میں ہم پڑوسی بھی رہے۔ رشید صاحب والد کے دوست تھے۔ اُن کی بیگم والدہ مرحومہ کی سہیلی تھیں۔ اُن کا بڑا بیٹا عبدالحق مجھ سے چھوٹا تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ میری دوستی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد میرے عزیز دوست ذکریا ساجد (پروفیسر شعبہ صحافت، کراچی یونیورسٹی) کی شادی اُن کی دختر نیک اختر کے ساتھ ہوئی۔ تو اس خاندان کے ساتھ میرا تعلق اور بھی گہرا ہو گیا۔ لیکن کالج کے زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب کالجی سیاست کے سلسلے میں اُن سے جھگڑا ہو گیا۔ ایک دھڑے کا لیڈر میں تھا اور ایک کے عبداللہ بٹ مرحوم۔ اُن کی ہمدردی عبداللہ بٹ کے ساتھ تھی۔ یا شاید میرا تاثر ایسا تھا۔ ایک بار میں نے دھڑے بندی میں

اُن کی شرکت محسوس کی تو بزمِ فروغِ اُردو کے نوٹس بورڈ پر ایک بیان لگا دیا جس میں اشارے کنائے سے اُن کی مخالفت کی۔ اُنہوں نے پرنسپل مسٹر ایم۔ اے عینی کے پاس شکایت کر دی۔ پرنسپل صاحب نے مجھے بلا بھیجا اور باز پُرس فرمائی۔ میں نے پہلے کچھ تیزی دکھائی، پھر بیان واپس لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن نوٹس بورڈ کی کنجی کی گمشدگی کا بہانہ بنا کر دو دن تک بیان کا کاغذ نہ اُتارا۔ یہ بچپن کی حرکت تھی۔ بہر حال کچھ عرصے بعد سید صاحب پھر شفقت فرمانے لگے۔ زندگی کے آخری سالوں میں اُن کی صحت اچھی نہیں تھی دکان کے پچھلے حصّے میں ایک چارپائی پر دراز رہتے تھے۔ اُن سے بے شمار ملاقاتیں رہیں۔ کوئی ایک ملاقات ہوئی ہو تو اس کا حال بتاؤں۔

سید عبدالقادر صاحب کوئی امیر آدمی نہیں تھے۔ کچھ املاک جالندھر میں تھی۔ لاہور میں صرف پروفیسری فرماتے تھے۔ اور ظاہر ہے اُس میں بافت کم تھی۔ لیکن کفایت شعاری اور جُزرسی کی بدولت اُن کے پاس کچھ رقم جمع رہتی تھی۔ یہی رقم مسلمانوں کے کاروباری اداروں کے کام آتی رہی مسلمان بنکاری میں بہت پسماندہ تھے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے مسلم بنک کی بنیاد رکھی تو سید صاحب نے اس کے حصص خرید لئے اور غالباً ڈائرکٹر بھی بن گئے۔ لیکن ۱۹۲۹-۳۲ء کے عالمی معاشی بحران نے جہاں دنیا بھر کے بعض بڑے بڑے بنکوں کو ٹھپ کر دیا۔ وہاں لاہور میں مسلم بنک بھی دیوالیہ ہو گیا۔ چند سال بعد ایک اور بنک کی بنیاد ڈالی گئی۔ اُس کا نام سنٹرل ایکس چینج بنک تھا۔ سید صاحب نے اس کی بھی سرپرستی فرمائی لیکن مجھے یاد نہیں کہ کب اور کیسے اس بنک کا بوریا بستر گول ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں جالندھر کی املاک چھنی۔ تو کچھ املاک یہاں الاٹ ہوئی۔ اس میں کتابوں کی وہ دکان

شامل تھی۔ جو زندگی کے آخری سالوں میں سہارا بنی۔

سرشیخ عبدالقادر مشہور علمی اور ادبی مجلّے "مخزن" کے بانی تھے۔ اس مجلّے نے صدی کے آغاز ہی میں ایک علمی تحریک کا رُوپ لے لیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اُردو ادب کو تراجم، تنقیدی مقالات اور نئی اصنافِ سخن سے مالا مال کیا جائے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو نہ صرف اُردو ادب سے آشنا کرایا جائے بلکہ اسے گیسوئے اُردو کی آرائش پر بھی آمادہ کیا جائے۔ اور سچ پوچھیے۔ تو یہ تحریک بہت کامیاب رہی۔ علامہ اقبالؒ سے اُن کے گہرے مراسم رہے۔ چنانچہ حضرتِ علامہ اقبال نے "بانگِ درا" کا دیباچہ اُنھی سے لکھوایا۔ زباں دانی کے بارے میں والد کا یہ قول یاد آتا ہے کہ پنجاب میں دو شخصیتیں زباں دانی میں کمال رکھتی ہیں۔ ایک سر شیخ عبدالقادر دوسرے مولانا ظفر علی خان۔ سر شیخ عبدالقادر بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ وکالت بھی کی اور اس میں ناموری حاصل کی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ، کہ لاہور کے ثقافتی دولہا تھے۔ جہاں کوئی بڑی تقریب ہوتی اُنھیں صدارت کے لئے بُلایا جاتا۔ اور وہ ہر محفل میں جو مختصر صدارتی خطبہ ارشاد فرماتے وہ جامعیت کے اعتبار سے اس موضوع پر حرفِ آخر ہوتا تھا۔ اُنھیں لاہور کی ثقافتی تقریبات میں وہی مقام حاصل تھا جو پاکستان بننے کے بعد مسٹر جسٹس ایس اے رحمٰن کو حاصل ہوا اور جچے تُلے انداز میں صدارتی خطبے کی اگر کوئی دوسری مثال دیکھی تو پروفیسر حمید احمد خان کی زبانی۔

موصوف سے عنفوانِ شباب میں دس بارہ مرتبہ ملاقات ہوئی۔ بہت شفیق بزرگ تھے، حوصلہ بڑھانے والی باتیں کرتے تھے۔ میں نے

کالج کے زمانے میں ایک بار مسر ڈینٹیس آف اسلام لیگ کے زیر اہتمام وائی ایم سی اے ہال میں اُن سے ایک لیکچر کرایا۔ موضوع تھا "برطانیہ میں ہندوستانی طلبہ" وجہ یہ ہوئی کہ وہ انہی دنوں انڈیا کونسل کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر لاہور کو لوٹے تھے۔ ایک بار علامہ عبداللہ یوسف علی کے لیکچر پر اُن سے صدارت کرائی اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ اُنہوں نے میرے ایک مقالے کی بھی صدارت فرمائی۔ مقالے کا عنوان اُردو ڈرامہ نگاری سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ محفل بزمِ فروغِ اُردو کے اہتمام میں اسلامیہ کالج کے سٹاف روم میں ہوئی اور صدارت کے لئے میں نے خود اُن سے درخواست کی تھی۔

جن دنوں میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں وقائع نگاری کی تربیت حاصل کرتا تھا۔ کبھی کبھی اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا اور شخصیات کے بارے میں پس منظری معلومات حاصل کرتا تھا۔ اُن دنوں جب کوئی شخصیت اس دنیا سے اُٹھ جاتی۔ اخبار نویس انہی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور سوانحی معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ میں جب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ میری موجودگی اُن پر گراں گزری ہے۔ اُن سے ملاقات کر کے ہمیشہ طبیعت میں انشراح پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک تو وہ معلومات کا خزینہ تھے دوسرے، خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ تیسرے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو آج کل کی شخصیات میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

اُن کے انتقال سے لاہور کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا جو مدتوں پُر نہ ہو سکا۔ اُن کی بیگم لیڈی عبدالقادر بھی تہذیبی زندگی میں پیش پیش تھیں، لیکن وہ نسوانی تقریبات کی صدارت

ذہانتی بھتیں۔ اُن کے تین فرزندوں منظور قادر، احسان قادر اور ریاض قادر سے بھی میری صاحب سلامت رہی۔

مولانا عبدالقادر قصوری دین سے شغف، علم و فضل، اخلاص، قوم کے لئے ایثار، سیاست میں جرأت اور بے باکی اور سیاسی کارکنوں کی سرپرستی اور امداد کے اعتبار سے ایک مینارِ عظمت تھے۔ مجھے اُن سے براہِ راست کوئی تعلق نہ رہا۔ لیکن بزرگوں سے جو کچھ سُنا۔ اُس کی بنا پر مجھے اُن سے گہری غائبانہ عقیدت رہی۔ اور اُن کے فرزندانِ گرامی سے نیازمندی کا شرف حاصل رہا۔ ڈاکٹر محمد علی ایم اے کینٹب مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے تھے اُنہوں نے تجارت میں لاکھوں روپے کمائے۔ لیکن قوم کی راہ میں لٹا دیئے۔ احمد علی قصوری سے تو گہرا قُرب رہا۔ کیونکہ وہ ہفت روزہ "پنچایت" کے مینجر تھے۔ اور میں ایڈیٹر۔ اُن سے دو اڑھائی سال تک ہر روز کا ملنا تھا اور میاں محمود علی قصوری کو کون نہیں جانتا؟ قومی سرگرمیوں میں ہمیشہ سے پیش پیش رہے ہیں۔ شہری آزادیوں کے تحفظ کی خاطر اُنہوں نے جو جنگ لڑی ہے وہ ہماری سیاسی تاریخ میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو پہلی سول لبرٹیز یونین بنی۔ وہ اس کے صدر تھے اور میں مجلسِ عاملہ کا رکن تھا۔ اور مجھے فخر ہے کہ اُن سے جو برادرانہ رشتہ استوار ہوا۔ وہ اب بھی قائم ہے۔

مولانا عبدالقادر قصوری ۱۹۴۲ء میں اللہ کو پیارے ہوئے زندگی کے آخری چند سال سیاست سے لاتعلق رہے۔ کیونکہ ایک تو بڑھاپا دامن گیر تھا۔ دوسرے سیاسی ذوق نے مختلف رُوپ لے رکھا تھا اور وہ اس

ڈھب کے آدمی نہیں تھے۔ آزاد قبائلی علاقے میں جو مجاہدین جمیر قند برطانوی سامراج کے خلاف سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ مولانا کا گہرا رابطہ قائم تھا اور وہ مالی امداد بھی فرماتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریکِ ہجرت چلی۔ تو وہ پنجاب میں اس کی روحِ رواں تھے۔ تحریکِ خلافت میں وہ سب سے آگے تھے۔ صوبائی خلافت کمیٹی کی صدارت پہ مدتوں فائز رہے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی رہے۔ ایک عرصے تک صوبہ کانگرس کمیٹی کی صدارت پہ فائز ہوتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگرس کی مجلسِ عاملہ کی رُکنیت پر بھی مقرر ہوتے رہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان وہ کھلا تصادم شروع نہیں ہوا تھا۔ جنہوں نے دونوں کے راستے الگ الگ کر دیئے بلکہ بہت سے رہنما دونوں جماعتوں کے رُکن تھے۔

اُن کے بارے میں مولانا غلام رسُول مہرؔ نے لکھا: "مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم نے سال ہا سال تک کانگرس کی خدمت کی اور پراونشل کانگرس کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں کانگرس کو اُن سے زیادہ مخلص، صاحبِ ایثار اور بے غرض رہنما آج تک نہیں ملا۔ مرحوم و مغفور کی عظمت اخباروں کے شذروں یا افتتاحیوں کی محتاج نہیں تھی۔ وہ جس مسلک کو اچھا سمجھتے تھے بے باکانہ اس پہ کاربند رہے۔ اُن کے محاسن کا کوئی حق شناس انکار نہیں کر سکتا۔ وہ حد درجہ ایثار پیشہ، غیور، بہادر اور مدبر تھے۔ سینکڑوں ہزاروں کارکن قومی سرمالیوں سے اپنے مصارف وصول کرتے رہے۔ اور یہ کوئی گناہ نہیں تھا لیکن مولانا مرحوم نے اپنی ساری زندگی میں ایک حبہ کبھی نہیں لیا۔ قومی کاموں کے سلسلے میں سارے مصارف

خود برداشت کرتے رہے۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بہت سی خدمات سرانجام دیں۔ اگرچہ نہرو رپورٹ کے وقت اُن کا مسلک ہمارے نزدیک صحیح نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اُنہیں کوئی ذاتی آرزو اُدھر لے گئی۔ یہ محض اختلاف رائے تھا۔ جو نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اس کے باوجود کوئی حق شناس آدمی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا مرحوم موجودہ دور میں بے لاگ اور بے لوث رہنمائی کا ایک نادر نمونہ تھے اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی تڑپ ہمارے علم کے مطابق ہر دور اور ہر عہد میں اُن کی سرگرمیٔ عمل کا مورد ومحور رہی حالانکہ بعض حالات میں ہمیں بھی اُن سے اختلاف رائے کی ضرورت پیش آئی۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے سیاسی کردار کو ناپنے کے لئے تحریکِ پاکستان میں شرکت یا عدم شرکت کا پیمانہ پیشِ نظر رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ ان مسلمان رہنماؤں میں شامل تھے جو سامراج کے مخالف تھے اور اُن کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ جب تک برطانوی سامراج کو شکست نہ دی جائے گی۔ نہ دنیائے اسلام غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو گی۔ نہ برعظیم کے مسلمانوں کی نجات کا سامان فراہم ہو گا۔ وہ سامراج کے خلاف جنگ کے لئے متحدہ محاذ کے قائل تھے اور ایمان داری کے ساتھ سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد مسلمان اتنے طاقت ور ہوں گے کہ ہندو اکثریت اُن پر غالب آ سکے گی۔ اس رائے سے آخری مرحلے میں مسلمانوں نے بھرپور اختلاف کیا اور علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اور اُسے حاصل کر لیا۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا عبدالقادر قصوری اور اُن کے ہم نواؤں کا نقطۂ نگاہ غیر صحیح تھا لیکن اُن سے کوئی غلط قسم کے محرکات

وابستہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اختلافِ رائے ایمان دارانہ تھا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاسی شعور اور بیداری کی جس زمین پر تحریکِ پاکستان کا قصر تعمیر ہوا۔ اُسے اُن اوّلین رہنماؤں نے ہموار کیا۔ کیونکہ اُنہوں نے لوگوں کے دلوں سے انگریز کا خوف نکال باہر کیا اور اُن کے سینوں میں آزادی کی جوت جگائی۔

میر عبدالقیوم لائل پور کے نامور وکیل اور سیاسی رہنما تھے لیکن لاہور کی بہت سی علمی اور ادبی محفلیں بھی اُن کے دم قدم سے وابستہ تھیں۔ پنجاب لٹریری لیگ کے صدر تھے۔ ثقافتی تقریبات میں پیش پیش تھے۔ دوستوں کے دوست تھے اور دشمنوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ عمر میں خاصے فرق کے باوجود میرے دوست تھے۔ زیادہ تر ملاقاتیں تو ریستورانوں میں ہوتیں لیکن کبھی کبھی غریب خانے کو بھی نوازتے تھے۔ اُن کی سیاسی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے۔ پہلے مجلسِ احرارِ اسلام سے وابستہ تھے۔ میاں فضل حسین نے "سیاسیاتِ پنجاب" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا۔ تو میر عبدالقیوم نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی۔ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور دولتانہ گروپ سے خصوصی تعلق رکھا۔ پھر ری پبلکن پارٹی میں براجمان ہوئے۔ مارشل لا آیا تو منقار زیرِ پر ہو گئے۔ جب سیاسی زندگی کی ہمہ ہمی کا آغاز ہوا تو اپوزیشن سے رابطہ رکھا لیکن علالت کے پیشِ نظر آتش کدہ سرد پڑ چکا تھا اور جب بحالیٔ جمہوریت کی عوامی تحریک اپنے جوبن پر تھی تو میر عبدالقیوم ۱۹۶۹ء کے آغاز میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ اللہ۔ کیا پُربہار شخصیت پائی تھی۔ بچوں میں بچے، جوانوں

میں جوان تھے اور بوڑھوں میں بوڑھے بن جاتے تھے۔ ہر شخص کی مدد کرتے تھے۔ قابل وکیل، اچھے پارلیمانی مقرر، دیانت دار سیاست دان اور علم دوست بزرگ تھے۔ اُن سے کوئی ایک صحبت ہوئی ہو تو بتاؤں۔ لاہور کے کافی ہاؤس میں، شعر و نغمہ کی مجالس میں، بزم لطائف میں، حلقۂ احباب میں، مری کے مرغزاروں اور سیمیز اور رلن ٹاٹس کے ریستورانوں میں، فیئر فیلڈز ہوٹل میں اور سب سے بڑھ کر لائل پور میں اُن کے مسکن میں بے شمار صحبتیں ہوئیں۔ اُن سے سیاسی مباحث بھی ہوئے لیکن ان میں گرما گرمی بھی قہقہوں اور مسکراہٹوں سے عبارت تھی۔ سچ پوچھیے تو سیاست پر گفتگو کا مزا وضعدار لوگوں کے ساتھ ہی آتا ہے۔ لیکن اب ایسی وضعدار شخصیتیں کہاں ملتی ہیں؟

عبداللہ بٹ ۱۹۶۰ء کے اواخر میں حال کی جگ مگ جگ مگ کرتی روشنیوں سے نکل کر ماضی کی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہو گیا لیکن چند دوستوں اور ساتھیوں نے زندگی کی چند گھڑیاں اس کے ساتھ گزاری تھیں۔ ان کے سینوں میں یادوں کے دیئے ہمیشہ فروزاں رہیں گے۔ رہا اپنا حال تو خود ہی سوچ لیجیے، جس شخص نے ایک دوست کے ساتھ صدی کا ایک تہائی حصہ گزار دیا ہو۔ وہ اسے کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ حمید نظامی اور عبداللہ بٹ کے گزر جانے سے میری زندگی کا وہ باب ختم ہو گیا جس کی ابتدا کالج کی سیاست سے ہوئی۔ پیار اور محبت، ہر وقت کی رفاقت مباحثوں اور مناظروں میں شرکت، کبھی کشیدگی، کبھی صُلح، کبھی سیاسی اختلافات کبھی سیاسی معرکے جن کی لپیٹ میں بڑے بڑے لوگ آگئے۔ کبھی بیان بازی

کبھی الزام تراشی، فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگان، پھر عہد شباب کی رفعت ادھیڑ عمر کی آمد آمد۔ ماضی کی یاد سے لطف اندوزی، پُرانے اختلافات پر قہقہے، پُرانے ساتھیوں کے کردار کی بوالعجبیوں پر تبصرے۔ ایک دوسرے کو زچ کرنے کے جائز و ناجائز حربوں کا رضا کارانہ افشائ اور اُن پر دادو تحسین کا تبادلہ۔ رہنماؤں کے ساتھ مراسم پر ربع صدی پُرانی معلومات کا انکشاف۔ یہ ہے اُس کہانی کی ایک جھلک، جو عبد اللہ بٹ اور حمید نظامی کے انتقال کے ساتھ ختم ہو گئی۔

زندگی کی ہمہ ہمی اور مکروہاتِ دُنیوی کا کیا کیجئے گا کہ یہ عشق کی قاتل ہیں۔ لیکن بچپن کا دوست ایک عجیب چیز ہوتا ہے۔ بالکل بند ڈبے کے پھل کی طرح کہ دس سال بعد بھی کھولو تو تر و تازہ، شگفتہ اور لذیذ پاؤ۔ یہی حال عبداللہ بٹ کا تھا۔ کبھی کبھی ملاقات کو چھ مہینے بھی گزر جاتے تھے لیکن جب ملتا میں یہی محسوس کرتا کہ اسلامیہ کالج کے کسی برآمدے یا عظیم اللہ سٹریٹ میں کھڑے باتیں کر رہا ہوں۔ اس پر فالج گرنے سے چند دن پہلے کی بات ہے۔ ایک تقریب تھی۔ عبداللہ بٹ ایک وزیر کو اور اُن کے رفقائے کار کو اپنے قہقہوں سے نواز رہا تھا۔ میں پاس جا کھڑا ہوا تاکہ فارغ ہو۔ تو اُسے اغوا کروں۔ جب محفل نے طول پکڑا۔ تو میں نے پیچھے سے اُس کی چٹکی لی۔ اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا تو میں نے بھاگ نکلنے کا اشارہ کیا۔ جب چلے تو میں نے کہا۔ یار۔ تو بڑا ظالم ہے۔ درویش تیری محبت کا طلبگار ہے۔ اور تو ہے کہ وزیر کی گود سے نکلنے میں متامل۔ اس نے معذرتی لہجے میں کہا۔ بھئی۔ یہ بہت اچھا آدمی ہے۔ میں بولا کہ میں نے کب کہا کہ ہے کہ بُرا آدمی ہے میں نے تو صرف آج شام کے لئے اُسے رقیبِ روسیاہ قرار دیا ہے۔

اچھا۔ اب چھوڑ دیہ تذکرہ اور بے ثباتئ عالم پر وعظ کرو۔ یاد رہے کہ کسی زمانے میں وہ بے ثباتئ عالم پر گفتگو کرتا تھا۔ تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا تھا۔ باتوں باتوں میں شخصیات کی برسیاں منانے کا ذکر چھڑ گیا۔ کہنے لگا۔ قائد اعظم اور اقبال کی برسیاں خود بخود منائی جاتی ہیں۔ باقی برسیوں کے لئے کسی نہ کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا۔ تو میری برسی منائیگا کہنے لگا۔ پہلے تو وعدہ کر، کہ میری برسی منائے گا۔ پھر میں بھی وعدہ کروں گا میں نے کہا میرا ایک منصوبہ ہے۔ جس سے نہ صرف ہمارا بھلا ہو گا بلکہ دوسروں کا بھلا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بعد از مرگ تعلقات عامہ کا ادارہ قائم کیا جائے۔ جو شخص چاہے کہ اس کی برسیاں منائی جائیں اس سے مناسب فیس وصول کر کے پانچ برسیوں کے لئے مقالات تیار کر کے رکھ لئے جائیں تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔ اگر اُس شخصیت میں جان ہو گی۔ تو پانچ برسیاں گزرنے پر کوئی نہ کوئی خود ہی برسیاں منانے کا اہتمام کر لیا کرے گا۔ اگر جان نہ ہوئی تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔ کہنے لگا۔ تجویز معقول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ابتدا ہمیں سے ہو۔ میں تیرے لئے مقالات لکھتا ہوں تو میرے لئے لکھ دے میں نے کہا نہیں نہیں۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ تو میرے خلاف شرارت کر جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی اپنی مدح میں خود ہی مقالے تیار کر لیں۔ ہنسی مذاق کے بعد گفتگو نے سنجیدہ کروٹ لی اور عبداللہ بٹ نے زمانے سے شکووں کا دفتر کھول دیا اور میں سوچنے لگا قسمت کس طرح بعض لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ وہ کون سی صلاحیت تھی جو اُس میں موجود نہیں تھی وہ ذہین اور طباعؔ تھا۔ اعلیٰ درجے کا مقرر تھا۔ طنز نگاری اور مزاح نگاری

میں اُسے کمال حاصل تھا۔ "امروز" میں "حرف وحکایت" کا کالم لکھا اور اہل نظر سے دادِ وتحسین پائی۔ اپنے ماہنامہ "حرف وحکایت" میں ملّا جمالی کے قلمی نام سے جو مزاحیہ کالم لکھتا تھا اس کے بارے میں میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس سے حسرتؔ اور سالکؔ کے مزاحیہ کالموں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اُسے کلاسیکی ادب میں دسترس حاصل تھی۔ عربی زبان کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ سیاست کے نشیب وفراز سے اُسے جو آگاہی تھی اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ اعلیٰ درجے کا آرگنائزر تھا۔ مؤلف تھا۔ مصنّف تھا اور گفتگو کا بادشاہ تھا۔ ان تمام صلاحیتوں کے باوجود معاشرہ اس کے لئے کوئی ایسا ذریعۂ روزگار مہیا نہ کر سکا جو اُس کی شان کے شایاں ہوتا۔ طرّہ یہ کہ بڑی بڑی شخصیتوں سے دوستانہ روابط تھے لیکن کسی نے ملازمت کا نہ پوچھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہنستا تھا۔ کھیلتا تھا۔ ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتا تھا۔ لیکن اُس کا دل معاشرے کے ہاتھوں مجروح تھا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ لاہور کی تہذیبی زندگی میں چند اچھی روایتوں کا آغاز اس کے ہاتھوں ہوا۔ مثلاً شخصیات کی برسیاں منانے کا رواج۔ قیامِ پاکستان سے پہلے عبداللہ بٹ نے دو اہم برسیاں اس ٹھاٹھ سے منائیں کہ لائبریری میں جا کر ان کی یاد اب بھی تازہ کی جا سکتی ہے اس نے شاہ اسماعیل شہید کی یاد میں ایک عظیم اجتماع منعقد کیا جس میں بڑے بڑے اہل دانش نے مقالے پڑھے اور بعد میں مقالات کا مجموعہ کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ اس طرح سلطان ٹیپو شہید کی برسی منائی۔ اور مقالات کا مجموعہ شائع کر دیا۔ یہ بھی اب شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ اُس نے آل انڈیا مسلم ہسٹری کانگرس منعقد کی تھی۔ جو اپنی قسم کی پہلی اور شاید آخری

کانفرنس تھی۔

پاکستان بننے سے پہلے عبداللہ بٹ نے ایک ادر انوکھی تقریب کی طرح ڈالی۔ اُس نے سوچا، سنجیدہ تقریبیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کچھ تفریح کا بھی اہتمام ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے بزمِ لطائف کے نام سے ایک چھوٹی سی مجلس بنائی اور اس کے اہتمام میں وقتاً فوقتاً ایسی تقریبیں منعقد کیں جن میں صرف لطیفے ہی سنائے جاتے تھے۔ یہ کام کسی ترتیب سے نہیں ہوتا تھا بس ایک صاحب لطیفہ سناتے۔ اُس کے بعد دوسرے صاحب کو جو لطیفہ یاد آ جاتا سنا دیتے، بات سے بات نکلتی اور لطیفے سے لطیفہ اُبھرتا۔ اور اس طرح دو گھنٹے ہنستے کھیلتے گزر جاتے۔ بزمِ لطائف کی مستقل صدارت والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک کے سپرد تھی اور اس کی محفلوں میں چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، محمد فاضل، وقار انبالوی، اور بہت سے دوسرے جانے پہچانے ادیب حصّہ لیتے تھے۔ عبداللہ بٹ تو اس محفل کی جان تھا اور غالباً سب سے زیادہ لطیفے وہی سناتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد "بزمِ لطائف" ہی کے نام سے اس نے سب لطیفوں کا مجموعہ چھاپ دیا۔ پاکستان بننے کے بعد اضافہ و ترمیم کے ساتھ اس کتاب کو "مئے شبانہ" کے نام سے چھاپ دیا گیا۔

پاکستان بننے سے پہلے یوں تو لاہور میں بہت سی علمی اور ادبی مجالس قائم ہوئی تھیں لیکن ان میں پنجاب لٹریری لیگ کو تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں خصوصی مقام حاصل تھا۔ اس کے کرتا دھرتا زیادہ تر غیر مسلم حضرات تھے۔ پاکستان بنا تو عبداللہ بٹ نے اس کا احیا کیا۔ اور سالکؔ اور حسرتؔ ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر عنایت اللہ، میر عبدالقیوم

میاں ممتاز دولتانہ، اقبال چیمہ، عبداللہ ملک، چوہدری رحمت اللہ، مولانا صلاح الدین احمد، سردار ظفراللہ، اکبر ملک اور دوسرے حضرات اس میں شامل ہوتے اس کے اہتمام میں بے شمار جلسے ہوئے۔ بڑی بڑی شخصیات نے خطاب کیا اور اہل ذوق بہت بڑی تعداد میں اس کی محفلوں کی زینت بنتے رہے۔ اس لیگ کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی اُردو کانفرنس بھی ہوئی۔

عبداللہ بٹ نے بہت سی اور کتابیں بھی مرتب کیں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے اُن مقالات کے دو مجموعے شائع کئے جو "الہلال" اور "البلاغ" میں چھپے تھے۔ ایک کتاب "نہر سویز" پر لکھی۔ ایک سیّد جمال الدین افغانی پر۔ ایک پروپیگنڈے کے فن پر۔ جو اُردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب تھی۔ ایک کتاب کا نام ہے "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" اس میں عالمی شخصیات کا بڑے دلآویز اور پرکشش انداز میں تجزیہ کیا۔ مجھے یاد ہے۔ اس کے مختلف باب اس نے دوستوں کی مختصر سی ایک محفل میں سنائے اور مشورے بھی طلب کئے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔ عبداللہ بٹ کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کرنے کا سہرا قومی کتب خانے کے ناظم اعلیٰ حضرتِ احسن کے سر ہے۔ اُنھی نے بٹ کی بیشتر کتابیں چھاپیں اور ٹھاٹھ سے چھاپیں اور یہی کتابیں عبداللہ بٹ کو زندہ رکھیں گی۔ مصنّف اور مؤلف کی حیثیت سے عبداللہ بٹ کی زندگی کا یہ پہلو قابلِ ذکر ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کیا۔ پاکستان بننے سے پہلے کیا پاکستان بننے کے بعد زیادہ تر صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنایا "امروز" میں کچھ دیر کالم نویسی کی۔ پھر "حرف و حکایت" کے نام سے ایک ماہ نامہ جاری کیا جو اگرچہ شگفتہ ادب کا ایک اچھا نمونہ تھا لیکن پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے

چل نہ سکا۔ کچھ دیر ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" کی ادارت کے فرائض ادا کیئے۔ اور زندگی کے آخری دَور میں "حرف و حکایت" کو ہفت روزہ کا روپ دیا۔ میں اس کا بالالتزام مطالعہ کرتا رہا۔ اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس توازن اور اعتدال کے ساتھ اس نے اپوزیشن کا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ ہم عصر اخباروں میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ اس کے باوجود اخبار کی اشاعت محدود تھی اور یہ سراسر گھاٹے کا کاروبار رہا۔

عبداللہ بٹ منہ پھٹ قسم کا آدمی تھا۔ سُنانے پر آتا۔ تو سنا دیتا اور نہ آگا دیکھتا نہ پیچھا۔ چنانچہ وحدتِ مغربی پاکستان کے ایک وزیر نے اُس سے کہا۔ کہ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ عبداللہ بٹ نے کہا۔ ایک ہی خدمت ہے جو آپ سر انجام دیں۔ تو ممنون ہوں گا۔ پوچھا۔ وہ کیا؟ بولا۔ وزیر بننے سے پہلے میرے پاس بیٹھ کر آپ جو کرسیاں توڑتے رہے اُن کی مرمت کرا دیجئے گا!

حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کی شخصیت کے تین پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل: زندگی کا آغاز افلاس سے ہوا اور محنت کے بل بوتے پہ لکھ پتی بن گئے۔ دوم: اُنہوں نے اپنی دولت رفاہی کاموں میں صرف کی۔ اور املاک کا بہت بڑا حصّہ وقف میں منتقل کر دیا۔ سوم: پاکستان بننے سے پانچ سال پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لیکن پاکستان کے تصور کو آگے بڑھانے میں اتنا اہم کردار ادا کیا کہ مورّخ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں نے انہیں دیکھا ہے اور ایک بار ملا بھی ہوں۔ اور بچپن سے اخبارات میں اُن کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں پڑھتا رہا اور تحقیقی ضروریات کے لئے

پُرانے اخباری فائلوں کی ورق گردانی کے دوران میں بھی محقق کے طور پر سیٹھ صاحب کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوتا رہا۔ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے لئے انہوں نے کام کیا اور اس کا معاشی جواز پیش کیا۔ خطبۂ الٰہ آباد سے چند مہینے پہلے اقبالؒ نے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے مسلمانوں کی "اپر انڈیا مسلم کانفرنس" کے انعقاد کا فیصلہ کیا تو سیٹھ ہارون نے اپنے حلقۂ اثر میں اس کے لئے کام کیا۔ خطبۂ الٰہ آباد کی حمایت میں آواز بلند کی۔ قائدِ اعظم کے چودہ نکات کو آگے بڑھانے میں پورا تعاون کیا۔ جب طلبہ نے پاکستان کو نصب العین بنایا تو انہیں مدد دی۔ اور ۱۹۳۸ء سے کانفرنسوں اور جلسوں کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ اس نصب العین کو اپنا لے۔ لاہور سیشن میں وہ نمایاں تھے۔ مسلم لیگ کو جتنی مالی امداد انہوں نے دی، شاید ہی کسی اور نے دی ہو۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔ لیکن جس مملکت کا خواب دیکھتے رہے وہ دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ کیونکہ ۱۹۴۲ء میں اچانک سینے میں درد ہوا اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے پہلے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ یوسف ہارون اور محمود ہارون انہی کے فرزند ہیں۔ میں نے بچپن میں انہیں بھی دیکھا تھا کیونکہ وہ دو ایک بار دفتر "انقلاب" میں بھی آئے تھے۔ یوسف ہارون میرے بڑے بھائی کے ہم عصر تھے اور محمود ہارون میرے ہم عصر۔ مہرؔ و سالکؔ سیٹھ ہارون کے نیازمند تھے اور اُن کے بہت معترف بھی تھے۔

اس حقیقت کا علم اُن کے سوانح سے ہوا کہ چار برس کے تھے کہ باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور اٹھارہ سالہ بیوہ نے اُنہی کی تربیت میں ساری عمر بسر کر دی۔ پیسے کی حفاظت سکھانے کے لئے ایک بار صرف ایک پائی

کھو دینے پر مٹی کا دیا ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ بازار میں جا کر ڈھونڈو۔ تجارت سکھانے کے لئے چھوٹی سی عمر میں اُنہیں یہ فرض سونپا کہ ٹرے میں کھلونے اور عام ضرورت کی چیزیں لے کر بازار میں پھیری لگائیں یا فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بیچیں اور وہ مدتوں اسی شغل میں مصروف رہے۔ پھر وہ دن بھی آئے کہ اُنہوں نے چینی کی ایک بوری سے وہ کاروبار شروع کئے جس میں روپے کی ریل پیل ہو گئی اور صنعت و تجارت میں اتنی ترقی کی کہ دولت اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ اسی دولت سے بے شمار محتاج، یتیم اور بیوائیں وظائف حاصل کرتی رہیں۔ سیٹھ ہارون لکھ پتی ہونے کے باوجود غریبوں میں گھل مل جاتے اور اُن کا دکھ بٹاتے۔ یہی دولت قوم کے کام آئی۔ اس سے رفاہی ادارے بنے جو اب تک اُن کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ زندگی کے آخری تیس پینتیس سالوں کے دوران میں مجالسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ تین بار مرکزی اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ اور یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اُنہوں نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ پانچ سال تک سندھ کے علاقے میں خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ علی برادران اور اُن کی والدہ بی اماں جب کراچی آتے تو انہی کے دولت کدے پر قیام فرماتے کہ وہ تحریکِ خلافت کا بڑا مرکز تھا۔ اُن کی ذات میں بہت سی خوبیاں مرتکز تھیں۔ اور بہ ظاہر کوئی ایسی کمزوری موجود نہیں تھی۔ جس پر انگلی اٹھائی جا سکے۔

عبداللہ یوسف علی قرآنِ حکیم کے اس حسین و جمیل اور مترنم ترجمے کے سزاوار تھے جو شیخ محمد اشرف نے چھاپا اور اب تک مقبول ہے۔ کچھ

لوگوں کا خیال تھا۔ کہ اُنہیں عربی زبان میں زیادہ درک حاصل نہیں اس لئے مختلف انگریزی تراجم کو سامنے رکھ کر اُنہوں نے زیادہ شُستہ اور زیادہ بامحاورہ اور ادبیت سے بھرپور ترجمہ مرتب کر لیا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اس ترجمے کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں اُن سے یاد اللہ تھی۔ اس زمانے کے سب سے اعلیٰ ہوٹل" نیڈوز" میں رہتے تھے۔ میں کبھی کبھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اُنہیں مجلسی تقریبات میں مدعو کرتا۔ اور وہ ہمیشہ سرپرستی فرماتے۔ سروینٹس آف اسلام لیگ کی طرف سے اُن سے اسلام میں خدا کے تصور پر ایک پمفلٹ لکھوا کر مفت تقسیم کیا۔ موصوف خالص علمی شخصیت تھے۔ ماہر تعلیمات تھے دو مرتبہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل رہے۔ اُنہیں سیاست سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن ایک بار اس میں گھسیٹ لئے گئے اور چند دنوں کے اندر اندر نکال بھی دیئے گئے اور یار لوگوں کے لئے ایک لطیفہ فراہم ہو گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ یونینسٹ پارٹی کے قائد سردار سکندر حیات نے اُنہیں کہا کہ آپ شیخوپورہ کی ایک دیہاتی نشست سے کھڑے ہو جائیں۔ اُنہوں نے بھولپن میں آکر کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ دوسری طرف سردار صاحب نے مولوی غلام محی الدین قصوری کو امیدوار بنوا دیا۔ اور ایک مقامی زمیندار بھی کھڑے ہو گئے۔ سردار سکندر حیات نے علامہ عبداللہ یوسف علی کو بُلا کر کہا کہ ہم تو آپ کو منتخب کرانا چاہتے تھے لیکن فلاں زمیندار نے کاغذات داخل کر کے گھپلا ڈال دیا ہے۔ چونکہ وہ زیادہ بارسوخ ہے اس لئے آپ کے لئے بڑی مشکل پیش آئے گی۔ اس لئے نام واپس لے لیں۔ تو بہتر ہوگا۔ پھر زمیندار کو

بُلا یا۔ اور کہا۔ تم نے غضب کیا کہ علامہ عبد اللہ یوسف علی جیسے فاضلِ اجل کے مقابلے پر آ گئے۔ میری مانو تو اپنا نام واپس لے لو کیونکہ اگر علامہ تمہارے حلقے سے کامیاب ہو گئے۔ تو سب کے لئے مفید ہو گا۔ اور اتنی بڑی شخصیت کے طفیل تمہارے علاقائی مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے۔ سر سکندر کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ اس لئے زمیندار نے اُن کی بات مان لی۔ چنانچہ مقررہ تاریخ کو علامہ یوسف علی اور زمیندار دونوں نے کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لئے اور مولوی غلام محی الدین قصوری بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ کہتے ہیں سر سکندر نے یہ سارا ڈرامہ انہی کے لئے رچایا تھا کیونکہ مقابلے میں ان کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

علامہ عبد اللہ یوسف علی کی شخصیت بہت بلند و بالا تھی۔ اسلامیہ کالج کی پرنسپلی کے دوران میں اُنہوں نے انجمن حمایت اسلام کے اربابِ بست و کشاد کی نہ صرف خوشامد نہ کی بلکہ گھاس تک نہ ڈالی۔ یہ بات اربابِ انجمن کے دلوں پر شاق گزرتی تھی۔ چنانچہ سازش کا جال بچھایا گیا۔ اُنہیں تنگ کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر طلبا کو غصّہ آیا انہوں نے ہڑتال کر دی شیشے توڑے، جلوس نکالے۔ اور ایسے سنگین حالات پیدا کر دیئے کہ انجمن اُنہیں واپس لے آئی۔ بہر حال یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چلا اور موصوف ایک دن چپ چاپ مستعفی ہو کر لندن چلے گئے۔ ہاں ایک بات یاد آئی کہ ۱۹۳۵ء میں اُنہوں نے چند دن کے لئے لاہور کے مسلمان انگریزی روزنامہ "ایسٹرن ٹائمز" کی ادارت بھی فرمائی۔

علامہ عبد اللہ یوسف علی کی اپنے وطن میں وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے اس لئے عمر کا زیادہ تر حصہ برطانیہ میں بسر کیا۔ اور وہ بھی

گم نامی میں۔ ایک دفعہ لندن کے ہائیڈ پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی لاج

راجہ غضنفر علی خان کی کیا بات تھی۔ بڑی ٹھاٹھ دار شخصیت کے مالک تھے۔ طُرّہ دار پگڑی پہنتے۔ جب یونینیسٹ پارٹی کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی۔ اور پگڑی جاگیرداری کی علامت بنی تو راجہ صاحب نے پگڑی چھوڑی اور جناح کیپ پہننی شروع کر دی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد پھر طُرّہ دار پگڑی پہن لی کہ یہ اُن کی شخصیت کا ایک لازمی جزو تھی۔ سیاست اُن کی گھُٹی میں تھی۔ ۱۹۱۹ء کے مارشل لائ کے زمانے میں گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے۔ سیاست میں حصّہ لیا۔ تو کالج سے فارغ کر دیئے گئے۔ مارشل لائ ختم ہوا۔ تو تعلیم مکمل کی۔ مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے صرف دو اُمیدوار پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو سکے۔ ایک راجہ غضنفر علی خان، دوسرے ملک برکت علی راجہ صاحب نے منتخب ہوتے ہی لیگ سے علیحدگی اختیار کی اور یونینیسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور اسی رگڑے جھگڑے میں پارلیمانی سیکرٹری بن گئے۔ جب قائداعظم اور ملک خضر حیات ٹوانہ کے درمیان ٹھن گئی تو راجہ صاحب نے اُلٹی زقند لگائی۔ اور ایک بار پھر مسلم لیگ کی صفوں میں شامل ہو گئے بڑے بڑے جلسوں سے خطاب فرمایا۔ ہندوستان کی مرکزی کابینہ میں مسلم لیگ کی نمائندگی کا فریضہ ادا کیا اور پاکستان بنا۔ تو وزیر مہاجرین کے

عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو مسلمان مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے مغربی پنجاب میں داخل ہوئے۔ اُن کو حالات سدھرنے پر پھر مشرقی پنجاب میں آباد کیا جائے اور جو غیر مسلم یہاں سے ترکِ وطن کر کے مشرقی پنجاب چلے گئے تھے۔ اُنہیں بھی اُن کے اصلی گھروں میں آباد کیا جائے۔ لیکن حالات سازگار نہیں تھے۔ اس لئے اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔

پنجاب میں نواب افتخار حسین آف ممدوٹ وزارتِ اعلیٰ پر فائز تھے۔ مہاجرین کی بحالی کے مسئلے پر اُن کا خیال یہ تھا کہ مرکز اپنے فرض میں کوتاہی کا مرتکب ہے۔ چنانچہ ایک بار اُنہوں نے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں ایک تقریر میں وزارتِ مہاجرین کو جلی کٹی سنائیں۔ اُسی دن شام کے وقت راجہ غضنفر علی خان ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے والے تھے۔ میں اسمبلی چیمبر سے نکل کر سیدھا لورنگز ہوٹل پہنچا۔ راجہ غضنفر علی خان نے میری پذیرائی فرمائی۔ میں نے انہیں گرما گرم اور تازہ ترین خبر سُنا دی کہ اُن پر نواب آف ممدوٹ نے نکتہ چینی کی ہے اتنے میں اور اخبار نویس بھی آ گئے۔ راجہ صاحب نے اپنا اصل موضوع چھوڑ دیا اور نواب آف ممدوٹ کی تقریر کو پریس کانفرنس کا موضوع بنا دیا اور یوں ایک سیاسی بحران نے جنم لیا۔ جو بڑی مشکل سے سلجھایا گیا۔

ایک دفعہ راجہ غضنفر علی خان نے دن کے ایک بجے نہر کے قریب مال روڈ پر اپنی کوٹھی میں پریس کانفرنس بلائی۔ چونکہ نہ کھانے پر بلایا گیا۔ نہ چائے کی اطلاع دی گئی اور فاصلہ بھی طویل تھا۔ اس لئے میرے سوا کوئی اخبار نویس نہ پہنچا۔ راجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کانفرنس

ملتوی کر دی جائے۔ یا منعقد کی جائے۔ میں نے کہا صاحب! ضرور منعقد کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی قسم کی واحد پریس کانفرنس یعنی مجھ سے خطاب کیا۔ اس کے بعد میں نے سوالات پوچھے۔ انہوں نے جواب دیئے۔ اور یوں میں نے ایک "سکوپ" مار لیا۔

راجہ غضنفر علی کی میرے والد سے پرانی دوستی تھی۔ جب والد دمہ قلبی کے عارضے میں مبتلا تھے تو راجہ صاحب عبدالرحمٰن چغتائی اور پروفیسر حمید احمد خان کے ساتھ مسلم ٹاؤن عیادت کے لئے آئے۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ پہلے تو کچھ لطائف و ظرائف ہوئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب کہنے لگے۔ سالک صاحب کی صحت یابی کے لئے تم کچھ بھی نہیں کرتے میں نے کہا۔ صاحب! علاج باقاعدہ ہو رہا ہے۔ میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ تیمار داری ہی کر سکتا ہوں۔ بولے۔ تم میری بات نہیں سمجھے۔ دل کے مریض کو اگر شام کے وقت شراب کا ایک چھوٹا سا پیگ پلا دیا جائے تو طبیعت میں انشراح پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ والد راضی ہوں تو یہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس پر والد ہنس پڑے۔ کیونکہ جانتے تھے کہ راجہ صاحب نے یہ تجویز سنجیدگی سے نہیں پیش کی۔ اس پر راجہ صاحب کہنے لگے۔ اگر یہ منظور نہیں تو دوسرا علاج یہ ہے کہ کبھی محفلِ موسیقی برپا کرو۔ کوئی اچھی گانے والی بلاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ مجھے ضرور مدعو کیا جائے۔

راجہ صاحب بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ عنفوانِ شباب میں شاعری بھی فرماتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب دارالاشاعت پنجاب میں

سالک ہے۔ پطرس اور تاج کے ساتھ اُن کا دوستانہ تھا لیکن یہ کم بخت سیاست شعر و شاعری کی قاتل ہوتی ہے۔ اس لئے راجہ صاحب کی شاعری نہ چل سکی

چودھری غلام حیدر خان اس اعتبار سے یکتائے روزگار تھے کہ کم از کم نوّے سال کی عمر تک اُنہوں نے جنگ جاری رکھی۔ سیر کرتے تھے، بہت لمبی۔ بائیسکل کی سواری کرتے تھے اور اس ٹھاٹھ کے ساتھ، کہ لاہور سے وزیر آباد کے قریب کرم آباد تک بائیسکل پر جاتے تھے اور واپس بھی آتے تھے۔ ایک بار پوچھنے لگے۔ بازو کو کتنی بار مسلسل خم دے سکتے ہو؟ میں نے کہا۔ پچیس، تیس، چالیس اور پچاس بار! بولے۔ میں پانچ ہزار مرتبہ مسلسل خم دے سکتا ہوں۔ زندگی کے بارے میں ان میں بلا کی خود اعتمادی موجود تھی۔ موت کا نام لینا بھی گوارا نہیں تھا۔ نوّے سال کی عمر میں بائیسکل کے ایک حادثے میں ٹانگ مجروح ہوئی۔ تندرست ہو گئے۔ لیکن وہ پُرانی بات نہ رہی۔ ایک ملاقات میں کہنے لگے۔ ہم تو چراغِ سحری ہیں۔ میں نے کہا یوں نہ کہئے۔ ہم آپ کو سنچری بنائے بغیر رخصت نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن چورانوے سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

چودھری صاحب مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ عہدِ شباب میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ "زمیندار" میں کام کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں "زمیندار" بند ہوا تو کلکتے پہنچے۔ وہاں سے یکے بعد دیگرے دو اخبار جاری کئے۔ پنجاب بازوئے شمشیر زن تھا۔ اس لئے یہاں حکومت "بے تکلف" اخبارات کی روادار نہیں تھی۔ اس لئے چودھری صاحب نے کلکتے سے پہلے ایک اخبار جاری کیا۔ پنجاب میں اُس کا داخلہ

بند ہوا۔ تو دوسرا جاری کر دیا۔ اُس کا داخلہ بھی بند ہو گیا تو پنجاب کو لوٹ آئے۔ مولانا ظفر علی خان کے اخبار "ستارۂ صبح" میں کام کرنے لگے۔ ساری عمر مولانا ظفر علی خان کے ساتھ گزار دی۔ پہلے "زمیندار" کے رکنِ ادارہ کی حیثیت سے، اور بعد میں اُن کے پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا ظفر علی خان فالج کا شکار ہو کر صاحبِ فراش ہو گئے تو چودھری صاحب ۱۹۵۶ء تک اُن کی رفاقت اور عیادت میں مصروف رہے۔ چودھری صاحب سے زیادہ مولانا ظفر علی خان کو کسی نے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے جب میں "صحافت پاکستان و ہند میں" لکھنے لگا۔ تو اُن سے فرمائش کی کہ مولانا کی زندگی اور صحافتی کردار پر میری مدد کے لئے ایک مفصّل نوٹ لکھ دیں اُنہوں نے نوازش فرمائی اور ایک طویل نوٹ لکھ دیا۔ میں نے مولانا پر جو باب تحریر کیا۔ وہ اسی نوٹ پر مبنی تھا۔ لیکن کتاب چھپی۔ تو آغا شورش کاشمیری نے ہنگامہ برپا کر دیا کہ خورشید نے مولانا کی توہین کر دی ہے اور چودھری صاحب سے کہا کہ اس مسئلے پر وہ بھی لکھیں۔ چودھری صاحب نے صاف کہہ دیا کہ خورشید نے جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے اور میرے مفصّل نوٹ کی بنیاد پر لکھا ہے۔

چودھری غلام حیدر کی زبان بہت سلیس اور شُستہ تھی۔ دو ایک کتابیں لکھیں۔ لیکن جہاں تک مضمون نگاری کا تعلق تھا۔ اس شغل کو مسلسل جاری رکھا۔ اُن کے دو تین محبوب موضوع تھے۔ ایک دینِ اسلام، دوسرا اخلاق و کردار کی تعمیر، تیسرا جسمانی صحت کی دیکھ بھال اور بڑھاپے کے خلاف جنگ۔ انہی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔ زندگی کے آخری چند سال مسلم ٹاؤن میں اپنے صاحبزادے راجہ فاروق علی خان کے پاس رہے۔

اُسی دور میں میری اُن سے اصل دوستی ہوئی ۔

چودھری غلام عباس سے میرا کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا۔ اور اُن سے اگر کوئی رابطہ پیدا ہوا تو پریس کانفرنسوں میں یا اپنے والد کے توسط سے جن کے ساتھ چودھری صاحب کے مراسم مدت سے چلے آتے تھے۔ یہ مراسم ۱۹۳۰ء میں شروع ہوئے جب چودھری غلام عباس نے جموں میں ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن قائم کر کے اپنی اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔ دونوں میں گہرا تال میل رہا، تاآنکہ ۱۹۵۹ء میں والدِ مرحوم اللہ کو پیارے ہو گئے اس سانحہ پر چودھری صاحب نے جو خط لکھا۔ اس سے مراسم کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

> عزیزم ڈاکٹر صاحب ۔ سلامِ ممنون ۔ سالک صاحب مرحوم کی اچانک موت سے اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ۔ آپ مشفق والد سے محروم ہو گئے ۔ برصغیر ایک ایسی بلند و ممتاز ہستی سے محروم ہو گیا ۔ جس کا بدل قرنوں ناممکن ہے ۔ اور میں نے ایک ایسے بزرگ بھائی ، دوست اور دلی طور سے ہمدرد اور غمخوار رفیق کو کھو دیا ہے ۔ جس کا بدل میرے لئے پاکستان میں ناممکن ہے ۔ مرحوم کے ہم سب پر بالخصوص تحریک کشمیر پر اتنے بڑے احسان تھے کہ یہاں اور مقبوضہ کشمیر میں وہ ہمیشہ ہمارے لئے زندۂ جاوید ہیں ۔
>
> "بات بڑی ہے لیکن عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

میری دلی خواہش اور آرزو یہی ہو گی کہ اب متعلقین مجھے اُن
کی بجائے تصور کریں اور اپنا خادم سمجھیں۔

شریکِ غم

یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء غلام عباس چودھری

چودھری غلام عباس نے پاکستان آکر اپنے خود نوشت سوانح "کشمکش" کے نام سے مرتب کئے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ چودھری صاحب نے یہ مسودہ والدِ مرحوم کے حوالے کیا۔ اور اُن سے کہا کہ ناشر کا بندوبست بھی خود کریں اور مقدمہ بھی خود لکھیں۔ ۱۹۵۰ء میں یہ کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی "کشمکش" کے پیش لفظ میں والدِ مرحوم نے چودھری صاحب کو جو خراجِ تحسین ادا کیا وہ محض دوستی کا نتیجہ نہیں تھا۔ والدِ مرحوم اس کے ایک ایک نقطہ پر یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ تحریک کشمیر کے آغاز سے وہ چودھری صاحب کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے۔ اس پیش لفظ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ "یہ کتاب بلاشبہ چودھری غلام عباس کی خود نوشت سوانح عمری ہے لیکن حقیقت میں تحریکِ حریتِ کشمیر کی مستند تاریخ ہے اور ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جس کی ساری زندگی اس مقصدِ مقدس کے لئے جد وجہد کرتے گزری ہے اور جس نے گزشتہ پچیس سال کی مدت میں اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی آسائش اور اپنے متعلقین کی خوش حالی کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے لئے درویشانہ و قلندرانہ جہاد کیا جیل خانوں کی سختیاں جھیلیں، ناداری کی کڑیاں سہیں، اپنے رفقاء کی غداریوں کے تلخ جام نوش کئے۔ لیکن اس خود غرض اور مطلب پرست دنیا میں اپنی عدیم المثال دیانت، اپنے بے نظیر ایثار اور اپنے شبانہ روز عمل کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اگر آزاد کشمیر اور پاکستان نے چودھری غلام عباس کو

حکومتِ آزاد کشمیر کا رئیسِ اعلیٰ مقرر کیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کشمیر میں فی الحال اس سے کوئی بڑا عہدہ موجود نہیں جو رئیس الاحرارِ کشمیر کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ میں ادر انقلاب روزِ اوّل ہی سے تحریکِ حریتِ کشمیر کے خادموں کی حیثیت سے چودھری صاحب کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے چودھری صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ یہ شخص ہماری گزشتہ نصف صدی کی قیادت میں اپنی بہت کم مثالیں رکھتا ہے اور خوش قسمت ہے وہ ملک جس کو ایسا رہبر اور کارکن میسّر ہو جس کی دیانت اور قربانی کی شہادت اس کے اشد ترین مخالفین بھی دے رہے ہیں۔ اگر ہمیں حریتِ کشمیر کی جدوجہد میں کامیابی حاصل ہوئی اور یقیناً ہو گی۔ تو یقین کیجئے کہ وہ چودھری غلام عباس جیسے مخلص، نیک نیت، ایثار پیشہ کارکنوں کی برکت وسعادت ہی سے ہو گی۔"

چودھری غلام عباس کی زندگی کے آخری سال ناخوشی میں گزرے وہ نہ پاکستان کی انتظامیہ سے خوش تھے۔ نہ حکومت پاکستان کے اُس طریق کار سے، جو آزاد کشمیر میں روا رکھا گیا۔ وہ جدوجہد کے قائل تھے۔ اور اس کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ اُن پر پیچ و تاب کھاتے رہے۔ یُوں بھی برسوں کی جدوجہد کے دوران میں قید و بند کے مصائب اور پاکستان بنتے وقت اہل خانہ کی ابتلا کی وجہ سے اتنے زیادہ حساس ہو چکے تھے کہ اُن کا چہرہ اور اُن کی گفتگو بھی اس کی غماز تھی۔ پریس کانفرنسوں میں بھی اُن کے چہرے پر سراسیمگی کے سے آثار نظر آتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور ہمارے لئے اپنا تابناک ماضی چھوڑ گئے۔

خان غلام محمد خان لوند خوڑ سے ایک عرصہ یاد اللہ رہی لیکن دوسرے دن

سے مختلف انداز میں ۔ میری دوستی دن کی دوستی تھی ۔ رات کی نہیں ۔ اس لئے
اُن کی شبینہ زندگی کی رعنائیوں ، رنگینیوں اور لذتوں سے ناآشنا رہا ۔ اس واحد کمزوری
سے قطع نظر وہ بہت بلند کردار کے مالک تھے ۔ اور ان کی سیاسی زندگی بالکل
بے داغ تھی ۔ ابھی شباب کی آمد آمد تھی کہ کارزارِ سیاست میں داخل ہو گئے
خدائی خدمت گار تحریک ، کانگریس ، مسلم لیگ ، عوامی مسلم لیگ اور عوامی لیگ
جس جماعت میں رہے ڈٹ کر کام کیا اور قید و بند کی صعوبتیں خوشی سے
جھیلیں ۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے شہری آزادیوں کی حفاظت
کا پرچم بلند کیا ۔ تو نہ صرف سرحد کی صحافت کو پابند پایا بلکہ پنجاب کی صحافت
کو بھی حکمران طبقے سے متاثر دیکھا ۔ ایسے میں "انقلاب" ان کی مدد کو پہنچا ۔ اسی
دور میں اُن کے ساتھ دوستی ہوئی اور انہی کی وساطت سے سرحد کے دوسرے
رہنماؤں سے رابطہ پیدا ہوا ۔ جب سرحد میں "انقلاب" ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا
تو خان عبد القیوم خان کی وزارت نے نہ صرف اس کا داخلہ بند کر دیا بلکہ خان
غلام محمد خان کو بھی صوبہ بدر کر دیا ۔ چنانچہ وہ کافی عرصہ لاہور رہے "انقلاب"
کی مستقل بندش کے بعد بھی عرصے تک ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ لیکن آہستہ آہستہ
رابطہ اتنا کم ہو گیا کہ سالوں کے بعد ملاقات ہوتی تھی ۔ یہ میری خوش نصیبی ہے
کہ اُن کی جان لیوا چار روزہ بے ہوشی سے چوبیس گھنٹے پہلے مجھے اچانک ملنے کا
خیال آ گیا ۔ چنانچہ ہسپتال میں تقریباً ایک گھنٹہ اُن کے پاس رہا ۔ وہ باتیں کرنے
کے موڈ میں تھے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ میں نے ۱۹۴۶ء میں کانگریس کو
چھوڑ کر لیگ کا دامن پکڑا لیکن اس سے کئی سال پہلے کانگریس کے کردار
کے بارے میں تشکک میں مبتلا رہا ۔ چونکہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا ۔ اس لئے
کانگریس سے علیحدگی میں خاصی تاخیر ہو گئی ۔

مولوی غلام محی الدین قصوری لاہور کے نامور وکیل، قومی کارکن اور اعلیٰ پائے کے مقرر تھے۔ چودھری نذیر احمد خان کے خُسر تھے۔ چو اسی سال عمر پائی۔ آخری وقت تک چاک وچوبند رہے اور آواز کا شباب قائم رہا۔ لارنس روڈ پر صبح کے وقت سیر کر رہے تھے کہ ایک موٹر سائیکل کی زد میں آکر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ موٹر سائیکل والا بھاگ گیا اور اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اُن سے میری شناسائی طالب علمی کی زندگی میں ہوئی۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لئے چندہ لینے گئے تو اُنھوں نے کمال شفقت سے کام لیتے ہوئے دس روپے کا چیک عنایت فرمایا۔ یہاں سے تعلقات کا آغاز ہوا۔ جو آخری وقت تک جاری رہی۔

مولوی صاحب کی آواز بلند آہنگ تھی۔ اس میں لوچ بھی تھا۔ اور گھلاوٹ بھی۔ اس لئے اُنہیں تقریر کرتے وقت لاؤڈ سپیکر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑے بڑے مجموں سے خطاب کرتے تھے تحریکوں میں پیش پیش رہتے تھے لیکن سیاست میں اعتدال کی روش پر چلتے تھے۔ سر سکندر حیات نے انہیں پنجاب اسمبلی کا رکن منتخب کرا دیا تو پارلیمانی مقرر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنا سکّہ منوا لیا۔ سیاست سے الگ ہوئے تو اصلاحِ معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا۔ مدّتوں انجمن حمایت اسلام میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

لاہور کی مجلسی زندگی میں اُنہیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ثقافتی تقریبات میں شرکت فرماتے تھے۔ نہایت شُستہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ سنجیدگی اور ثقاہت کے باوجود گفتگو میں بلا کی شگفتگی ہوتی تھی۔

⁂

ف۔م۔ ساقیؔ جون ۱۹۷۵ء میں یہ کہتے ہوئے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ کہ

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

"ساغر" پرانے انداز کا ایک ہفت روزہ تھا۔ ہفت روزہ صحافت میں کئی انقلاب آئے۔ لیکن "ساغر" پرانے ڈھرے پر چلتا رہا۔ نہ کتابت اچھی تھی نہ طباعت۔ نہ جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا تھا نہ جنسی ذوق کی آسودگی کا۔ بس ایک ہی دُھن تھی۔ نظریہ پاکستان کی حفاظت اسلامی قدروں کی ترویج اور پیام اقبال کی اشاعت۔ اُن سے میری پُرانی رسم و راہ تھی۔ ملاقات تو بہت کم ہوئی۔ لیکن نصف ملاقات کا شغل چلتا رہا۔ اُن کے مقاصد سے تو اتفاق تھا۔ لیکن طریقِ کار سے اختلاف۔ کہ یہ جمود کا حامل تھا۔ بہر حال اُنہوں نے جب حکم دیا۔ میں نے "ساغر" کے لئے ایک مضمون لکھ دیا۔ زندگی کے آخری دور میں اُنہوں نے علامہ اقبال پر پے در پے "ساغر" کے دو خاص نمبر چھاپے۔ ایک خاص نمبر کی تقریب رونمائی بھی ہوئی اور اہل علم نے اُنہیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ بس یہی وہ موقعہ تھا جب اُن کی کسی خدمت کو سراہا گیا۔ اُن کی تحریروں میں گہرائی تو نہیں ملتی تھی لیکن دلِ دردمند کا اخلاص ضرور جھلکتا تھا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو روز بروز کم یاب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ خارزارِ صحافت میں نصف صدی پہلے قدم رکھا حسب معمول "اُمّ الصحافت" (زمیندار) سے کام کا آغاز کیا۔ مختلف اخبارات کی خاک چھاننے کے بعد کراچی کو مرکز بنایا۔ "ساغر" جاری کیا۔ جو ربع صدی تک چلتا رہا۔ یا رینگتا رہا۔ ویسے پرچہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس سے قوت لایموت کا سامان کیسے فراہم ہوتا ہوگا۔

اے فاروق رحمت اللہ سیالکوٹ کے قومی کارکن تھے اور اخبار نویس بھی۔ ۱۹۳۹ء میں پیر علی محمد راشدی کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ قائم کی۔ تو اے فاروق رحمت اللہ نے رابطہ پیدا کیا۔ اور وہیں سے تعلقات شروع ہو گئے۔ اُنہی کی بدولت میں سیالکوٹ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے کوٹے سے ۱۹۴۰ء کے لیگ سیشن منعقدہ لاہور کا مندوب چنا گیا۔ ساری عمر غریبی میں کٹی۔ پاکستان بننے کے بعد ایک علاقائی اخبار "انقلاب" جاری کیا لیکن درم و دام کے بغیر اخبار کیا چلتا؟ کبھی کبھی پرچہ نکالتے۔ تحریک پاکستان کی یاد تازہ کرتے۔ اور پھر غائب ہو جاتے۔ تجارت میں ہاتھ ڈالا۔ ناکام رہے۔ نرینہ اولاد کی آرزو تھی۔ لیکن جب لڑکا پیدا ہوتا۔ چند ماہ بعد اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ غرض زندگی کیا تھی، مایوسیوں اور ناکامیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے کردار بھی متاثر ہوا۔ ہمارے پرانے سیاسی کارکنوں کا یہی حال ہوتا تھا۔ لیڈر امیر تھے۔ کارکن غریب۔ اس لئے لیڈر جب چاہتے۔ کارکنوں کا تعاون حاصل کر لیتے۔ جب چاہتے اُن سے کنارہ کش ہو جاتے۔ اور کارکنوں میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ اپنی اہمیت کے مطابق سیاست میں مقام حاصل کرتے پاکستان بننے کے بعد متروکہ املاک کی الاٹمنٹ کا چکر چلا۔ اے فاروق رحمت اللہ اس میں بھی پھسڈی ثابت ہوئے۔ اور کوئی ایسی چیز حاصل نہ کر سکے۔ کہ زندگی چین سے کٹتی۔ مسلسل جدوجہد اور مسلسل مایوسی کی زندگی نے عوارض کو جنم دیا اچھے علاج کی توفیق نہیں تھی۔ اس لئے صحت گرتی چلی گئی تا آنکہ موت نے سارے دکھ درد دور کر دیئے۔ اُن سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی لاہور آتے۔ تو میرے ہاں قدم رنجہ فرماتے۔ دوستوں نے کبھی کبھی ضرورت پوری کرنے میں مدد دی۔ لیکن اصل مدد تو خدا دیتا ہے۔ اور کہتے ہیں

پروردگار بے نیاز ہے۔

فاطمہ بیگم کے ساتھ منشی فاضل کے الفاظ بالکل اسی طرح نام کے اجزا بن گئے جیسے شیخ حسام الدین بی۔اے، احسان بی۔اے اور شبلی بی۔کام کے اسما کے ساتھ ڈگریاں بُری طرح چسپاں ہیں۔ وہ لاہور کے مشہور صحافی اور" پیسہ اخبار" اور بہت سے دوسرے اخباروں اور رسالوں کے بانی مولوی محبوب عالم کی بیٹی تھیں۔ کسی زمانے میں بمبئی سے ہفت روزہ "خاتون" نکالتی تھیں۔ پھر لاہور کو لوٹ آئیں۔ تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا۔ جلوسوں کی قیادت فرمائی۔ جلسوں سے خطاب کیا۔ جناح کالج فار گرلز قائم کیا جس میں ایک مرتبہ قائداعظم بھی آئے۔ اور پاکستان بننے کے بعد تو ایک بہت بڑا معرکہ مارا کہ جس پیسہ اخبار سٹریٹ میں کسی زمانے میں اُن کے باپ کی صحافت کا طوطی بولتا تھا۔ وہیں سے "خاتون" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کر لیا۔ یہ برعظیم میں عورتوں کا پہلا اور آخری روزنامہ تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس میں عورتیں کام بھی کرتی تھیں یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ فاطمہ بیگم اس کے اداریے خود لکھتی تھیں۔ یہ اخبار کم و بیش ایک سال جاری رہا۔ اس کے بعد بند کرنا پڑا۔ کیونکہ اخبار سرمایہ چاہتا تھا اور سرمایہ موجود نہیں تھا۔ پھر فاطمہ بیگم کی اپنی سیاسی اور معاشری مصروفیات بھی تھیں۔ جو اخبار چلانے میں حائل تھیں۔

فاطمہ بیگم نے ایک دائرے میں بہت بیش قیمت خدمات سرانجام دیں۔ اور وہ تھا اغوا شدہ خواتین کی بازیابی کا مسئلہ۔ ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات میں غیر مسلموں نے مشرقی پنجاب میں ایک اندازے کے مطابق پچاس ہزار مسلمان خواتین اغوا کر لی تھیں۔ اُدھر ہندوستان یہ الزام لگاتا تھا کہ مغربی پنجاب

میں غیر مسلم خواتین بھی اغوا ہوئی ہیں۔ اس پر بین المملکتی سمجھوتے کے تحت ایک ادارہ قائم کیا گیا جسے پولیس اور فوج کی امداد بھی فراہم کی گئی اور اس کے ذمّے یہ کام سونپا گیا کہ ایسی خواتین کی بازیابی کا بندوبست کرے۔ پاکستان میں یہ کام فاطمہ بیگم کے سپرد ہوا، چنانچہ وہ کئی مرتبہ مشرقی پنجاب گئیں اور بے شمار خواتین کا کھوج نکال کر اُنہیں وطن واپس لائیں۔ آہستہ آہستہ یہ کام سُست پڑتا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار فاطمہ بیگم نے ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں مَیں بھی شامل تھا۔ اُنہوں نے یہ سارا مسئلہ پیش کیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ اب بہت سی عورتوں کا سراغ بھی نہیں مل رہا۔ اور پوچھا کہ آیا کام بند کر دیا جائے یا اِسے جاری رکھا جائے۔ میں نے کہا میری معلومات کے مطابق زیادہ تر خواتین نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُن میں سے بہت سی بیاہ کے بندھن میں آ چکی ہیں اور ایک آدھ بچّہ بھی ہو چکا ہے۔ اور ایسی عورتوں نے واپس آنے سے انکار بھی کیا ہے۔ میرے نزدیک خواتین کی بازیابی کے کام کو جاری رکھنا ضروری ہے لیکن ایک شرط پر کہ جو لڑکیاں اُدھر سے لائی جائیں۔ اُنہیں بےآسرا نہ رکھا جائے۔ اُنہیں بے گناہ سمجھا جائے۔ اُنہیں معاشرے میں صحیح مقام دیا جائے۔ اور ایسے لوگ یہاں موجود ہوں جو اُن سے شادی کو کارِ ثواب جانیں اور اُن کی عزت کریں۔ اس پر فاطمہ بیگم کی جبین پر کچھ شکن سی آ گئی۔ لیکن اُنہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

چودھری فخر الدین احمد راجروی بہت یاد آتے ہیں۔ کچھ اس محبت کی وجہ سے جو وہ ہمارے خاندان پر نچھاور کرتے تھے، اور کچھ اس وجہ سے، کہ اُنہوں نے دارالفرقان" کے نام سے جو مثالی یتیم خانہ بنایا تھا اُن کی بے دخلی

کے بعد اُس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جن سے ہمارے یتیم خانے عبارت ہیں۔ انہوں نے بیگم پورہ میں "دارالفرقان" کے نام سے جو رفیع الشان عمارت بنائی۔ وہ اُن کے جانے کے بعد ایسے آثارِ قدیمہ کی صورت اختیار کر گئی جن کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ کہاں وہ دن تھے کہ اس کے در و دیوار چمکتے تھے اور کہاں وہ دن آ گئے کہ خاک اُڑنے لگی۔ جب چودھری صاحب ناظمِ اعلیٰ تھے۔ تو صبح سویرے منہ اندھیرے نماز باجماعت ہوتی اور تلاوتِ قرآنِ حکیم سے ساری عمارت گونج اٹھتی۔ یتامیٰ کا لباس صاف ستھرا ہوتا تھا۔ اُن کی تعلیم اور تربیت کا بہترین انتظام موجود تھا۔ یتامیٰ کے بھیک مانگنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نظم و ضبط کمال پر تھا لیکن چودھری صاحب کی بے دخلی کے بعد یہ سب کچھ ایک افسانہ ہو گیا۔

دوسری عالمی جنگ سے دو ایک سال پہلے کا ذکر ہے کہ انہوں نے اسلامیہ کالج کے قریب ریلوے روڈ پر یتیم خانہ انجمن تعلیم الفرقان کی بنیاد ڈالی اور والدِ مرحوم کا دامن پکڑ لیا اور اُن کی رہنمائی قبول کر لی۔ انہوں نے بھی جان و دل سے ساتھ دیا۔ اور پھر وہ وقت آیا جب تین چار لاکھ روپے کی لاگت سے بیگم پورہ میں حضرت ایشانؒ کے مزار کے پہلو میں وہ شاندار عمارت بنی جس میں بڑے بڑے سیاسی اور دینی رہنما آتے رہے اور چودھری صاحب کو خراجِ عقیدت ادا کرتے رہے۔ والدِ مرحوم بورڈ آف ٹرسٹیز کے چیئرمین تھے۔ اور میں مجلسِ انتظامیہ کا صدر تھا۔ لیکن ہم تو صرف حوصلہ افزائی کرتے اور پشت پناہی کرتے۔ اصل کام چودھری صاحب ہی کرتے تھے۔

جیسا کہ ہمارے ملک کا رواج ہے۔ کوئی شخص جذب و جنوں کے ساتھ

کام کرے۔ تو لوگ اس سے محرکات وابستہ کرتے ہیں اور اس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ یہی حشر چودھری صاحب کا ہوا۔ والد کی وفات کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی بے آسرا ہو گئے۔ اُنھوں نے ابنِ سالک کو جانشین بنایا لیکن میں مخالفین کا مقابلہ تو کر سکتا تھا لیکن کمینہ دشمنوں سے مقابلہ میرے بس کا روگ نہیں تھا چودھری صاحب نے میرے مشورے سے دار الفرقان کی قیادت سردار شوکت حیات خان کے سپرد فرمائی۔ اُنھوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ کام کیا لیکن عدیم الفرصت ہونے کے سبب سے اتنی توجہ نہ دے سکے جس کا یہ ادارہ مستحق تھا حالات بگڑتے گئے تا آنکہ چودھری فخر الدین احمد کو نظامتِ اعلیٰ سے دستبردار ہونا پڑا۔ اور میں نے بھی اس ادارے سے تعلق توڑ لیا۔

چودھری صاحب کا دولت کدہ دار الفرقان کے بالمقابل واقع تھا اُنھوں نے والدِ مرحوم سے عقیدت کی بنا پر ایک تو دار الفرقان کے ہال کو سالک ہال کا نام دیا۔ دوسرے، اپنے گھر کا نام سالک منزل رکھا میں نے نظامتِ اعلیٰ سے علیحدگی کے بعد اُنہیں مشورہ دیا۔ کہ وہ سالک منزل کرائے پر چڑھا دیں اور خود لاہور سے چند میل دور اپنی اراضی پر سکونت اختیار کریں۔ لیکن وہ نہ مانے۔ وہیں رہے۔ اور حسرت بھری نظروں سے اُس ادارے کو اُجڑتے دیکھا جس کی آبیاری میں اُنھوں نے خون پسینہ ایک کر دیا تھا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کا مرقد دار الفرقان کے پہلو میں ہے لیکن دار الفرقان کی نئی انتظامیہ اتنی سنگ دل تھی کہ اُسے قبر کی تعمیر بھی گوارا نہیں تھی۔ چنانچہ چودھری صاحب کی بڑی بیٹی نسیم اور داماد ڈاکٹر عبد الغنی نے قبر کی تعمیر کا فریضہ انجام دیا۔

٭

فریدہ بیدی ایک نہایت خوبصورت، سرو قامت، باوقار جرمن نژاد خاتون تھیں۔ کمیونسٹ عقیدے کی علمبردار تھیں۔ لاہور کی مجلسی زندگی میں انہیں خاص مقام حاصل تھا۔ انگریزی زبان میں خطابت اُن پر ختم تھی۔ لاہور کے نامی گرامی اُستاد پروفیسر بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی کی رفیقۂ حیات تھیں۔ وہ بھی کمیونسٹ تھے اور پنجابی زبان کے عوامی مقرر تھے۔ دونوں کو صحافت میں بھی ایک گونہ دلچسپی تھی۔ چونکہ ان دنوں انگریزی اخبار اتوار کو چھٹی کرتے تھے اور اس طرح سوموار کو شائع نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اس جوڑے نے ایک ہفت روزہ "منڈے مارننگ" کے نام سے جاری کیا۔ سائز آج کے "پاکستان ٹائمز" کے برابر تھا۔ نام کی تختی سُرخ ہوتی تھی۔ اُس دن کی خبریں بھی ہوتی تھیں اور دوسرے ہفت روزہ اخبارات کی طرح عام دلچسپی کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ "ٹریبیون" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کو یہ صُورت نہ بھائی کہ سوموار کے دن گاہکوں کو "منڈے مارننگ" اپنی طرف کھینچ لے۔ چنانچہ اُنہوں نے چھٹی ختم کر دی۔ "منڈے مارننگ" مقابلے کی تاب نہ لاسکا۔ اور اُسے بند ہونا پڑا۔

فریدہ بیدی نے دیسی لباس اختیار کر رکھا تھا اور مقامی معاشرت میں اس درجہ گھُل مل گئیں کہ غیر ملکی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اُنہوں نے یہ کوشش بھی فرمائی کہ برعظیم کے لوگ گھروں کی اندرونی سجاوٹ بھی مغربی انداز کی تقلید نہ کریں۔ چنانچہ ایک رسالے میں اُنہوں نے اندرونی تزئین و آرائش کے دیسی طریقوں پر سلسلۂ مقالات لکھا۔ لیکن مغربی انداز ہمارے معاشرے میں اس درجہ رچ بس چکا تھا۔ لوگوں نے فریدہ بیدی کی تحریک پر توجہ نہ دی۔

⁂

میاں فضل حسین اور محمد علی جوہر پون صدی پہلے برطانیہ میں ہم جماعت تھے دونوں مسلمان قوم کی سربلندی کے خواب لیتے تھے، وطن کو لوٹے۔ تو دونوں کارزارِ سیاست میں داخل ہو گئے۔۔ مقصد ایک ہونے کے باوجود دونوں کے راستے مختلف تھے۔ لیکن دونوں نے ملکی سیاست پر گہرا اثر ڈالا۔ محمد علی شمشیرِ برہنہ تھے، فضل حسین دُور اندیشی کے رسیا۔ محمد علی نے حکومت سے باہر رہ کر کام کیا۔ فضل حسین نے اندر رہ کر کام کیا۔ بہ ظاہر محمد علی برطانیہ دشمن تھے اور فضل حسین برطانیہ نواز۔ لیکن اگر فضل حسین کی سیاسی زندگی پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ اندرونِ خانہ وہ بھی برطانیہ کو زچ کرتے رہے۔

فضل حسین کی شخصیت ہمیشہ متنازعہ رہی۔ اور جس زمانے میں میں نے ہوش سنبھالا اور اخبارات پڑھنے کے قابل ہوا، ہندو بھی اُن کے خلاف تھے اور مسلمان بھی۔ ہندو اس لئے، کہ فضل حسین اقتدار میں رہ کر اپنی قوم کے بھلے کے لئے ٹھوس قدم اٹھاتے رہے اور مسلمان اس لئے، کہ فضل حسین اُن کے ذوقِ نعرہ زنی کی آسودگی کا سامان فراہم کرنے سے عاری تھے لیکن جب وُہ ۱۹۳۶ء میں انتقال کر گئے، تو کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب اشکبار تھے۔ ہندو اس لئے کہ میاں فضل حسین اپنی قوم کا تو بھلا چاہتے تھے لیکن ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے قائل نہیں تھے۔ اور مسلمان اس لئے کہ اُنہیں ہمیشہ اپنے رہنماؤں کے مرنے کے بعد اُن کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے جب یہ دیو قامت شخصیّت پنجاب کی سیاست سے غائب ہوئی، تو پنجابی مسلمانوں نے اچانک محسوس کیا کہ وہ یتیم ہو گئے ہیں۔ اور تو اور مولانا ظفر علی خان جیسے کٹّر مخالف نے بھی اُن کی شخصیّت کو شاندار خراجِ تحسین ادا کیا۔

مارلے منٹو اصلاحات کے دور کا ذکر ہے۔ ۱۹۱۵ء میں میاں فضل حسین پنجاب کی قانون ساز کونسل کے انتخابات میں پنجاب یونیورسٹی کے حلقے سے کھڑے ہوئے۔ یہ ایک مخلوط حلقہ تھا۔ ووٹروں میں غالب اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ اُس زمانے میں وہ "فرقہ پرست" نہیں سمجھے جاتے تھے۔ سب ان کی قابلیت کے قائل تھے لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اور ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے باوجود غیر مسلموں نے ووٹ دینے سے معذرت چاہی اور بہت کم غیر مسلموں نے ووٹ دیئے۔ مسلمانوں نے من حیث القوم حمایت کی۔ وہ تھوڑے سے ووٹوں سے جیت گئے لیکن محض اس لئے کہ ہندو امیدوار زیادہ تھے اور اُن کے ووٹ آپس میں بٹ گئے۔ اس واقعہ سے میاں فضل حسین کا یہ عقیدہ زیادہ راسخ ہو گیا کہ مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے زندہ رہنا ہے تو جُداگانہ انتخاب کو اپنانا ہوگا لیکن وہ مجموعی بھلائی کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے قائل تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان پہلے اور آخری معاہدے۔ میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء۔ کے معماروں میں وہ بھی شامل تھے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پنجاب میں سیاسی زندگی کی ابتدا میں میاں فضل حسین کا بہت ہاتھ تھا۔ مارلے منٹو اصلاحات کے زمانے میں پنجاب کونسل میں اُنہیں لیڈر آف دی اپوزیشن کا اعزاز حاصل تھا جب مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نفاذ سے دو تین سال پہلے آئینی اصلاحات کا مطالبہ ہوا تو پنجاب کے رسوائے عالم گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے یہ پوزیشن لی کہ پنجاب کے لوگ اپنے حال پر خوش اور مطمئن ہیں اس لئے اُنہیں آئینی اصلاحات کی کوئی ضرورت نہیں۔ گویا وہ پنجاب کو صوبہ سرحد کی طرح سرزمینِ

بے آئین بنانا چاہتے تھے۔ اس پر فضل حسین مقابلے میں آگئے۔ اُنہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی ایک شاخ قائم کی۔ ایک سیاسی کانفرنس کا انعقاد کیا اور اصلاحات کے مطالبے میں اتنی گرج پیدا کر دی کہ سر مائیکل اوڈوائر کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

قائداعظم کی طرح میاں فضلِ حسین آئین وقانون کے بہت پابند تھے اس لئے وہ عدم تعاون کی تحریک میں شامل نہ ہوئے۔ بلکہ جب اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے تحریک کے سلسلے میں کالج کے مقاطعہ کا بازار گرم کیا۔ تو میاں صاحب سینہ سپر ہو گئے اور اُنہوں نے اسلامیہ کالج کو عملاً محفوظ رکھا یاد رہے کہ وہ کالج کمیٹی کے سیکرٹری تھے اور اُنہوں نے اپنے اصول کی خاطر عوام کی ناراضی بھی مول لی۔

یونینیسٹ پارٹی پنجاب کی پہلی پارلیمانی سیاسی جماعت تھی۔ اِسے جاگیرداروں کی جماعت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد میاں فضل حسین نے ۱۹۲۳ء میں رکھی۔ جو خود جاگیردار نہیں تھے۔ بلکہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے دادا غریب تھے۔ باپ نے جو کچھ بنایا محنت سے بنایا پھر پارٹی نے مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کے تحت قائم شدہ قانون ساز کونسل کی صدارت کے لئے شیخ عبدالقادر (منظور قادر کے والد) کو منتخب کرایا اور وہ بھی جاگیردار نہیں تھے۔ ان اصلاحات نے حکومت میں دو عملی کا طریقہ رائج کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومتی شعبے دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ غیر منتقلہ اور منتقلہ۔ اوّل الذکر وہ محکمے تھے۔ جو گورنر کے براہِ راست کنٹرول میں تھے اور مؤخر الذکر کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان کا نظم ونسق منتخب شدہ ارکان میں سے لئے ہوئے وزیر چلاتے تھے۔ ان میں تعلیم، زراعت، بلدیاتی نظام جیسے

شعبے شامل تھے۔ وزرا کا تقرر گورنر کے ہاتھ میں تھا لیکن میاں فضلِ حسین نے یہ اصول منوا لیا کہ گورنر یونینیسٹ پارٹی سے مشورے کے بعد وزیر مقرر کریں گے

مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۳۶ء کے آغاز میں جب یونینیسٹ پارٹی کی تشکیلِ نو عمل میں آئی تو زمامِ قیادت میاں فضلِ حسین نے سنبھالی۔ انہوں نے پارٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم کمزور، بے آسرا اور پس ماندہ طبقات کی حالت بہتر بنانا چاہتے ہیں تعلیمی، معاشی اور ثقافتی اعتبار سے۔ آج کے دور میں اُن کی تقریر کا یہ اقتباس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے: "ہم نہ کمیونسٹ بننا چاہتے ہیں، نہ سوویت والے۔ لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے سینے میں یہ شدید خواہش موجود ہے کہ عوام کے معیارِ زندگی کو موجودہ سطح سے بلند کریں۔ اصل مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم دولت مند طبقات کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں اور یہ بوجھ اُٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ کیونکہ یہی وہ دانش مندانہ طریقِ کار ہے جس پر چل کر وہ نجی املاک اور صحت مند سرمایہ داری کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک خود غرضانہ سرمایہ داری، تنگ دلانہ سرمایہ داری اور لالچی سرمایہ داری کا تعلق ہے وہ خود اپنا خاتمہ کر رہے ہیں۔ اگر غریب اور امیر کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی تو کوئی حکومت اس قابل نہیں ہو گی کہ امیروں کو زیادہ عرصہ بچا سکے۔ اس لئے اُمرا کے اپنے مفاد کا تقاضا ہے کہ وہ حکومت کو ایسے اقدامات کے قابل بنائیں جن سے غریبوں کی حالت سدھرے رفاہی سرگرمیوں پر زیادہ روپیہ صرف ہو اور اس طرح اگر خلیج ختم نہ ہو۔ تو کم از کم ایک حد کے اندر رہے"۔

یونینیسٹ پارٹی کی تشکیل کے پس پردہ میاں فضلِ حسین اور اُن کے

رفقائے کار کے یہ محرکات کارفرما تھے :۔

اوّل ۔ پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کو قطعی کثریت حاصل نہیں۔ اس لئے وہ اکیلے وزارت نہیں بنا سکتے۔

دوم : اُنہیں کسی ایسے غیر مسلم طبقے کے تعاون کی ضرورت ہے جس سے اُن کے مفاد مشترک ہوں۔

سوم : یہ طبقہ انبالہ ڈویژن کے جاٹوں کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی طرح وہ بھی زراعت پیشہ ہیں اور ساہوکارہ نظام سے زخم خوردہ ہیں نیز دونوں صوبے کی اجتماعی زندگی میں پس ماندہ ہیں۔

چہارم : ان دو طبقات کا اتحاد ایک ایسی سیاسی پارٹی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے جو معاشی بنیادوں پہ استوار کی جائے۔ چونکہ اس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہو گی۔ اس لئے وہ اپنے مخصوص حقوق کی حفاظت بھی بدرجہ احسن کر سکیں گے۔

میاں فضل حسین بڑے بڑے عہدوں پہ فائز رہے۔ پنجاب میں وزیر رہے، حکومتِ ہند میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے بھی رکن رہے۔ اُنہوں نے ہر طبقے سے انصاف کیا لیکن اس انصاف کے تقاضے سے مجبور ہو کر مسلمانوں کو نظم و نسق میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی دلائی کیونکہ وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے۔ گورنمنٹ کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج (لاہور) میں جب تک داخلہ کم ہوتا رہا۔ کوئی جھگڑے کی بات نہیں تھی۔ لیکن جب امیدوار زیادہ ہوئے اور نشستیں محدود تھیں تو قابلیت کی بنا پر غیر مسلم اُمیدوار زیادہ کامیاب ہوتے تھے اور اس طرح مسلمان مستقل طور پر محرومی کا شکار ہوتے تھے۔ میاں فضلِ حسین نے اپنی وزارت کے

عہد میں ان دونوں کالجوں میں مسلمان طلبا کے لئے چالیس فیصد کوٹہ مقرر کر دیا اس پر ہندو جل اُٹھے۔ کیونکہ یہی وہ درس گاہیں تھیں۔ جہاں کے گریجویٹ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے تھے اور ہندوؤں نے محسوس کیا کہ چند سال کے اندر اندر سرکاری ملازمتوں میں اُن کا اجارہ ٹوٹ جائے گا۔ میاں فضلِ حسین کا یہی وہ "جرم" تھا جو ہندوؤں نے کبھی معاف نہ کیا۔ مسلمانوں کو قدرتی طور پر بہت فائدہ ہوا۔ اور وہ ممنون ہوئے۔

میاں فضلِ حسین ایک خاموش سیاست دان تھے۔ بولتے کم تھے سوچتے زیادہ تھے۔ جو قدم اٹھاتے سوچ سمجھ کر اٹھاتے۔ اور اس میں کامیابی حاصل کرتے۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" اُن کا مسلک تھا اُن کے خلاف مسلمان اخبار بھی بہت لکھتے تھے۔ لیکن وہ جواب نہیں دیتے تھے۔ اس کی وجہ ایک یہ تھی کہ اگر جواب دیتے تو شاید مسلمانوں کو اتنا فائدہ نہ پہنچا سکتے۔ جتنا پہنچا رہے تھے۔ گویا قوم کی خاطر اُنہوں نے اپنے خلاف غلط بیانیاں بھی برداشت کر لیں۔ اُن کے کارہائے نمایاں کی تفاصیل معلوم کرنے کے لئے دو کتابیں موجود ہیں۔ ایک سید نور احمد کی لکھی ہوئی مختصر سوانح عمری، دوسری اُن کے فرزند میاں عظیم حسین کی مرتبہ ضخیم کتاب۔ لیکن دونوں نے ایک بات نہیں بتائی کہ میاں فضل حسین کی "ہابی" کیا تھی۔ یعنی فرصت کے لمحات کس طرح بسر کرتے تھے۔ والدِ مرحوم نے مجھے بتایا کہ میاں صاحب ہمیشہ جاسوسی ناولوں کی ٹوہ میں رہتے۔ کیونکہ سیاست کی ہماہمی سے جب وقت ملتا۔ ان ناولوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

عبدالعزیز فطرت کا مسکراتا ہوا چہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ اُس کی

مُسکراہٹ اپنایت، شرارت اور معصومیت کا ایک لطیف امتزاج تھی۔ دوست سالک کا بھی تھا اور ابنِ سالک کا بھی۔ بے تکلفی دونوں سے تھی لیکن ذرا مختلف نوعیت کی۔ کہ وہ باپ کا نیاز مند تھا، بیٹے کا بزرگ۔ جن دنوں مجھے یہ لت پڑی ہوئی تھی کہ ہر سال موسمِ گرما کی چھٹیاں بال بچوں سمیت مری میں گزاروں۔ آتے اور جاتے وقت راولپنڈی میں ضرور پڑاؤ ہوتا۔ کبھی ایک رات کا، کبھی چند گھنٹوں کا۔ اور یہ وقت فطرت ہی کے ساتھ بسر ہوتا تھا ایک دفعہ اس روایت سے انحراف کیا۔ تو فطرت نے اسے خلافِ فطرت اقدام سے تعبیر کیا۔ معصومیت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ایک دفعہ خط میں لکھا۔ دو لڑکوں کے رول نمبر درج ہیں۔ اُنہوں نے میٹرک کا امتحان دے رکھا ہے۔ یتیم ہیں۔ بے آسرا ہیں۔ مدد فرمایئے ؂

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اُن دنوں ثانوی تعلیمی بورڈ قائم نہیں ہوئے تھے۔ سارے امتحانات کا انصرام یونیورسٹی کے سپرد تھا۔ اُنہوں نے سوچا۔ یہ شخص صدر شعبہ صحافت ہے۔ صاحبِ اثر و رسوخ ہے۔ شعبۂ امتحانات میں جائے گا اور بچوں کو اچھے نمبر دلائے گا۔ مجھے اس بھولپن پر ہنسی تو آئی۔ لیکن غصہ بھی آیا کہ اتنے گرم و سرد چشیدہ انسان کی بے خبری کا یہ عالم ہے۔ میں سیدھا والد کے پاس پہنچا۔ اُنہیں خط دکھایا۔ اور کہا۔ فطرت صاحب مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ وہ ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ شاعر آدمی ہے۔ اسے کیا پتہ۔ کہ امتحانات کا نظام کیا ہوتا ہے۔ اور صدر شعبۂ صحافت کے پاس کس قسم کے اختیارات ہوتے ہیں؟ فطرت سے اگلی ملاقات کا موقعہ آیا تو کہنے لگے۔ یار معاف کر

دنیا، ہم سے کوتاہی ہوئی۔ میں نے کہا۔ کوتاہی جیسی کوتاہی؟ بولے۔ چلو، اب جانے بھی دو۔

فطرتؔ اعلیٰ پایے کے شاعر تھے لیکن اس بات کا کیا کیجئے گا کہ راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ ملازمت کی اور وفات پائی۔ لاہور میں کبھی کبھی آتے تھے لیکن یہاں سکونت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور شاعری کی دنیا میں "عظمت" حاصل کرنے کے لئے لاہور کی ادبی محفلوں میں مسلسل شرکت کے بغیر گزارہ نہیں۔ پھر کسی انجمن ستائشِ باہمی کی رکنیت بھی حاصل نہیں تھی۔ ایسے میں وہ سکّہ بند شعرا کی صف میں شامل ہوتے تو کیسے؟ بہرحال اُنھوں نے راولپنڈی میں بہت نام پیدا کیا۔ اور کیوں نہ کرتے۔ کہ پوٹھوہار کے علاقے میں اُردو شعر و شاعری کی تاریخ انھی سے عبارت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں۔۔ اُن کی وفات سے دو سال پہلے، راولپنڈی کے اہلِ علم نے بڑے تزک و احتشام سے "جشنِ فطرت" منایا۔ اُنھیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ اور اُن کی خدمت میں بھاری رقم کی ایک تھیلی پیش کی۔ ان کی دردیش فطری ملاحظہ ہو کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود یہ رقم فروغِ اُردو کے لئے وقف کر دی۔ لاریب، ایسے لوگ اب خال خال ملتے ہیں۔

فطرتؔ کے والد غلام نبی کاملؔ فنِ تعمیر میں مہارت رکھتے تھے دیواروں پر نقش و نگار کے لئے بہت مشہور تھے۔ راولپنڈی کی مرکزی جامع مسجد کی دیواریں اُن کے فن کی گواہی دیتی ہیں۔ غلام نبی کاملؔ اُردو میں شعر کہتے تھے۔ لیکن زیادہ نام پنجابی شاعری میں پایا۔ گویا فطرتؔ نے شاعری ورثے میں حاصل کی۔ اُس زمانے میں راولپنڈی میں جو اُردو شاعر موجود تھے۔ اُن میں ڈاکٹر عطا محمد طاہر سرِ فہرست تھے۔ فطرتؔ نے انھی سے تلمذ

کا شرف حاصل کیا۔ اور بقول ایوب محسن ۔۔۔ "سال ہا سال کے بعد جب وہ خود مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے اور اُن کے شاگردوں کا وسیع حلقہ قائم ہو چکا تو ازراہِ عقیدت و تبرک اُنہوں نے حضرت عبدالمجید سالکؔ کو اپنا اُستاد تسلیم کیا اور عرصے تک اُن کی خدمت میں اپنا کلام پیش کرتے رہے"۔

راولپنڈی میں مشاعروں کی ابتدا ڈاکٹر عطا محمد طاہر سے ہوئی۔ لیکن ۱۹۲۸ء میں اُنہوں نے مشاعرے برپا کرنے کا فریضہ فطرت کو سونپ دیا جو اُس وقت تئیس برس کے جوان رعنا تھے۔ اُنہوں نے مشاعروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جس سے شعر و شاعری کا خوب چرچا ہوا اور شاعروں کی ایک بہت بڑی کھیپ اُبھر آئی۔ اس میں باقی صدیقی بہت نمایاں ہوئے۔ فطرت نے ادبی مجالس قائم کیں۔ ایک دور میں عبدالحمید عدمؔ کے ساتھ چشمک چلی۔ دونوں طرف سے مشاعروں کے دور چلے۔ اور یہ چشمک اس اعتبار سے علم و ادب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی کہ بہت سے نئے شاعر پیدا ہوئے۔ اور جو شاعر میدان میں موجود تھے۔ اُن کے فن میں ایک نیا نکھار پیدا ہوا۔ انجمن ترقی اُردو ادب قائم ہوئی تو فطرتؔ پیش پیش تھے۔ اور حلقہ اربابِ ذوق قائم ہوا۔ تو اس میں بھی وہی نمایاں تھے۔ لیکن بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ فطرتؔ کے کلام کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہ آسکا۔ ان کی وفات کے آٹھ سال بعد احباب کو خیال آیا کہ غزلیات کا ایک مجموعہ مرتب کیا جائے۔ چنانچہ بکھری ہوئی چیزیں اکٹھی کی گئیں چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

سمجھا نہ سکیں جو بات دل کی
دعوے نہ کریں سخن وری کا

عجیب دھیمے پن سے کہہ رہی ہے داستانِ غم
فسردہ رُو، تھکی تھکی، اُداس اُداس چاندنی

اسرارِ جہاں ہیں فاش سارے
گستاخ ہے چشمِ ابنِ آدم

کلی چٹکنے پہ جب باغباں بھڑکتا ہے
چمن میں کوئی زباں کیسے کھول سکتا ہے

دن میں کریں ظہور تو خورشید ماند ہو
دہ وہ نجوم زینتِ دامانِ شب ملے

ہائے یہ انتظار کا عالم
تھم گئے وقت کے قدم جیسے

اور آزاد نظم کا ایک نمونہ ؎

گھرا ہے دلِ بے قرار، زنداں سے کم نہیں، قید کون کاٹے
حسین سرما کا چاند، دیوانہ وار مجھ کو بلا رہا ہے
فسونِ مہتاب کی قسم ہے، پھر آج شب کچھ نہ لکھ سکوں گا
پھر آج گھر میں نہ رہ سکوں گا
کہ اک جنوں سا ہے مجھ پہ طاری، مناظر کوہ و گنجِ جشنِ شبِ منور منا رہے ہیں

بلا رہے ہیں مجھے، مرے واسطے قیامت اٹھا رہے ہیں

(مری میں جشنِ شبِ منور)

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ گیسوئے علم و ادب سنوارنے والوں کو قوتِ لایموت کے لئے ایسے مشاغل اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کا علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی کلیہ عبدالعزیز فطرت پر صادق آتا ہے۔ عمر کا بیشتر حصّہ ڈاک خانے کی ملازمت میں گزارا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تھوڑا سا عرصہ روزنامہ "تعمیر" میں گزارا۔ پھر جناب ایوب محسن کے سہ روزہ "راہ و منزل" کے جنرل منیجر رہے۔ کچھ عرصہ "نوائے وقت" کے شعبۂ اشتہارات میں بسر کیا۔ عمر کے آخری حصّے میں ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ یہ کام طبیعت سے مناسبت رکھتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں علالت نے آلیا۔ اسی حالت میں حج کی سعادت حاصل کی۔ واپس آئے۔ تو صحت گر چکی تھی۔ چند مہینے بعد ۶ ر اکتوبر کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

رہے نام اللہ کا۔

اب راولپنڈی جاتا ہوں۔ احباب سے ملاقات رہتی ہے۔ لیکن فطرتؔ کے بغیر محفلیں سُونی سُونی نظر آتی ہیں۔

حکیم فقیر محمد چشتی پنجاب کے پہلے طبیب تھے جنہیں شفاءالملک کا خطاب ملا۔ لیکن وہ صرف طبیب نہیں تھے۔ مصوّر بھی تھے اور خطاط بھی۔ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ بڑے محفل آرا تھے۔ والد مرحوم کے ساتھ اُن کا دیرینہ یارانہ تھا۔ اُن سے کئی لطائف وابستہ تھے جو والد مرحوم نے اپنی "سرگزشت" میں بیان کئے ہیں۔ "یارانِ کہن" میں بھی ان پر

ایک باب شامل ہے۔ انہی کے ساتھ مجھے بھی بچپن میں اُن سے چند مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُن کا قد لمبا تھا۔ بڑے وجیہہ تھے۔ مختصر سی ڈاڑھی تھی۔ سر پر لپشاوری لُنگی پہنتے تھے، سیاہ فراک کوٹ، کالر اور ٹائی، شلوار اور بوٹ زیبِ تن فرماتے تھے۔ اس زمانے میں وضعدار بزرگوں کا لباس یہی ہوتا تھا اور اسے ماڈرن لباس سمجھا جاتا تھا۔ گفتگو کے بادشاہ تھے۔ اس کا اوّلین احساس مجھے اس وقت ہوا جب والد کی معیت میں ایک مریض کی حیثیت سے اُن کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ جو دوائیں تجویز کرتے تھے ان کی مقدار بہت زیادہ ہوتی تھی لیکن شفا ہو جاتی تھی۔ اور بڑے بڑے پیچیدہ امراض کے علاج میں کامیاب ہوتے تھے۔ ایسے امراض میں بھی، جن کا علاج بڑے بڑے ڈاکٹروں کے بس کا روگ نہیں ہوتا تھا۔ دہلی ہاؤس کے حاجی عبدالشکور مرحوم کے دولت خانے پر عیدین کے مواقع پر گھنٹے دو گھنٹے کی جو محفلیں آراستہ ہوتی تھیں حکیم صاحب اُن میں شامل ہوتے تھے اور علمی و ادبی نکتہ آفرینیوں اور لطائف سے ہر کسی کا دل موہ لیتے تھے۔ ان کا انتقال ہوا۔ تو اگرچہ یہ محفلیں جاری رہیں۔ لیکن ان میں وہ بات نہ رہی۔ جو حضرتِ شفاء الملک کی شرکت سے عبارت تھی۔

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نہ پی ایچ ڈی تھے۔ نہ ایم بی بی ایس، نہ ہومیوپیتھی میں درک تھا۔ اور نہ یونانی طب کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر اُن کے نام کا جزو کیسے بنا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عنفوانِ شباب میں لاہور کے میڈیکل کالج کی لیبارٹری میں ملازمت کی۔ کچھ دیکھا۔ کچھ سمجھا اور گوجرانوالہ جا کر ایک دواخانہ بنا لیا۔ اور نسخے بھی لکھنے لگے۔ اس کے بعد اس کام سے جی اُکتا گیا لیکن لفظ ڈاکٹر

نے ساتھ نہ چھوڑا۔

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں انتقال کیا۔ اور اس کم و بیش پون صدی کی زندگی میں ساٹھ پینسٹھ برس تک شاعری فرمائی۔ وہ پنجابی زبان کے چند گنے چنے نامور شعرا میں شامل تھے۔ غزلیں کہیں نظمیں کہیں رباعیاں لکھیں، قطعات قلمبند کئے۔ گیت الاپے۔ کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے تنقید میں بھی نام پیدا کیا۔ سیاسی تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ سامراج کے خلاف جنگ میں شاعری کے ذریعے سے عوام کے دلوں کو گرمایا اور تڑپایا لیکن اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد پنجابی زبان اور ادب کو آگے بڑھانے کی تحریک کا آغاز کیا۔ اور اس میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بھی شامل کر لیا۔ اور اس طرح یہ تحریک وسیع تر دائرے میں پھلنے پھولنے لگی۔ اپنی ذات کو آگے بڑھانا ان کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا۔ تشہیر سے حجاب تھا۔ چنانچہ کام خود کرتے تھے۔ نام دوسروں کا ہوتا تھا۔ لیکن اگر کسی شخص نے تحقیق کا ڈول ڈالا اور ڈاکٹر فقیر کے کارہائے نمایاں کا تجزیہ کیا تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ پاکستان بننے کے بعد پنجابی زبان اور ادب کی تحریک کے اوّلین قائد وہی تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے بھی اُن کے نام کا بہت شہرہ تھا۔ شاعروں اور ادبی محفلوں میں وہ پردھان تھے اور انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں قومی نظمیں سناتے تھے۔ اور اپنے کام کی بدولت انجمن کے لئے چندہ فراہم کرنے میں مدد دیتے تھے۔ پاکستان کی تحریک کا زور ہوا تو اس کے ساتھ اُردو تحریک بھی اُسی کی علامت بن گئی اور عارضی طور پر پنجابی زبان کو سکھوں سے منسوب کیا جانے لگا۔ چونکہ یہ رجحان محض ایک قومی مصلحت کے

تابع تھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں نے پنجابی زبان چھوڑ دی۔اس لئے جب پاکستان بنا تو یہ عارضی مصلحت بھی باقی نہ رہی اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر پہلے بزرگ تھے جنہوں نے پنجابی لیگ کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے بعد ماہنامہ "پنجابی" جاری کیا۔ جس میں والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک اُن کے ساتھی تھے۔ اس رسالے نے جہاں پنجابی زبان کے ادیبوں کو اظہارِ خیال کا ایک وسیلہ مہیا کیا وہاں اُردو زبان کے بہت سے نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں کو بھی پنجابی میں لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس رسالے نے جو فضا پیدا کی اُس کے نتیجے میں پنجابی ادبی اکیڈمی کا وجود عمل میں آیا اور ڈاکٹر فقیر نے اس میں ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے اتنا کام کیا جو اکیڈمی کے اربابِ بست وکشاد کے کام سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ رسالہ "پنجابی" کی دیکھا دیکھی اور رسالے بھی جاری ہوئے اور جدید پنجابی ادب کی تخلیق نے کتابوں کا بھی روپ لیا۔ اور اب صورت یہ ہے کہ پنجابی کتابیں پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں منظرِ عام پر آرہی ہیں۔

ڈاکٹر فقیر سے مجھے ربع صدی سے کچھ زیادہ عرصہ شرفِ نیازمندی حاصل رہا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں بھی آتے تھے غریب خانے کو بھی نوازتے تھے۔ مجلسی تقریبات میں بھی اُن سے ملاقات رہتی تھی۔ وہ بہت شفقت فرماتے تھے لیکن ہمارے مزاج بعض معاملات میں ایکدوسرے سے مختلف تھے۔ میں جس شخص کو غلط یا بوگس سمجھتا تھا اُس سے تعاون نہیں کرتا تھا۔ اور ڈاکٹر فقیر صاحب کو بھی اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اُن کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بوگس یا غلط کیوں نہ ہو۔ لیکن اس سے پنجابی ادب کے فروغ کا کام نکل سکتا ہے تو تعاون میں کوئی ہرج نہیں بلکہ تعاون ضرور کرنا چاہیئے۔ پھر وہ مرنجاں مرنج آدمی بھی تھے۔ سب کے ساتھ بنا کر رکھتے تھے۔ مجھے کہتے

تھے۔ کہ اس وقت جوانی کا خون جوش مار رہا ہے۔ جب ہماری عمر کو پہنچو گے تو دھیمے ہو جاؤ گے اور مصلحت شناسی کو منافقت نہیں سمجھو گے۔ بہرحال مزاج کے اس واضح اور بیّن اور عملی فرق کے باوجود اُن سے تعلقات نہایت شگفتہ رہے اور وہ مجھے "مرشد زادہ" کہتے رہے کہ سالک اُن کے نزدیک مُرشد کی حیثیت رکھتے تھے۔

میاں فیروز الدین احمد جانے پہچانے سیاسی کارکن تھے۔ یُوں تو مختلف تحریکوں میں حصّہ لیتے چلے آئے تھے لیکن اُن کی شخصیت تحریکِ مسجد شہید گنج میں خصوصیت سے اُبھری۔ اس کے بعد تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا۔ کہتے ہیں۔ انھی نے سب سے پہلے ایک جلسہ عام میں قائد اعظم کو "قائد اعظم" کا خطاب دیا اور یہاں سے یہ سلسلہ ایسا چلا کہ سرکاری طور پر بھی یہی خطاب چالو ہو گیا۔ میاں فیروز الدین احمد موچی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ بڑے دبنگ آدمی تھے مخلص تھے۔ دیانت دار تھے اور قوم کے بے لوث خادم چنانچہ اُن کی آواز پر اکثر نوجوان جمع ہو جاتے اور قومی اور ملّی تحریکوں کا سہارا بن جاتے تھے۔ میاں فیروز الدین احمد کے والد نور دین کاہڈا بھی بڑی دبنگ شخصیت کے مالک تھے۔ "کاہڈا" کا مطلب تھا کھوجی۔ اور یہ نام اس لئے مشہور ہوا کہ جرائم کا کھوج لگانے میں ید طولےٰ حاصل تھا۔ بزرگوں نے بتایا ہے کہ ان کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ علاقے کا تھانیدار خائف رہتا تھا اور یہ ایک روایت بن چکی تھی کہ جب کوئی نیا تھانیدار آتا۔ تھال میں چینی کا ڈھیر لگا کر اس پر گیارہ روپے رکھتا اور اُن کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ یہ گویا ایک طرح کا خراج تھا جو اُنہیں پیش کیا جاتا تھا۔ ایک بار نئے تھانیدار نے بطور

سے کام لیا اور خراج ادا نہ کیا تو علاقے میں اتنی وارداتیں ہونے لگیں کہ اعلیٰ حکام نے اُس سے باز پرس کی۔ اس پر وہ جھک گیا۔ اور حسب روایت خراج لے کر حاضر ہوا۔ اور معذرت بھی پیش کر دی۔ چنانچہ چند دنوں کے اندر اندر حالات سُدھر گئے اور علاقے میں امن ہو گیا۔

میاں فیروز الدین احمد کا بھی رعب اور دبدبہ تھا لیکن مختلف انداز کا کیونکہ اُنہوں نے سیاسی ذہن پایا تھا۔ وہ اچھے مقرر تھے۔ قوم کا درد رکھتے تھے اس لئے بہت سے نوجوان اُن کے فدائی بن گئے۔ باغ بیرون موچی دروازے میں اُن کا سکہ چلتا تھا جس سیاسی جماعت کے وہ مخالف ہوتے تھے۔ اُسے اس باغ میں جلسہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ احرار بھی یہاں جلسہ نہ کر سکے۔ مولانا ظفر علی خان کی جلسہ گاہ اکثر یہی ہوتی تھی۔ اُن سے میاں صاحب کو والہانہ پیار تھا۔ تحریکِ شہید گنج کے آغاز میں یہیں وہ تاریخی جلسہ ہوا جہاں مولانا ظفر علی خان کو اس تحریک کا امیر چُنا گیا اور یہیں میاں فیروز الدین احمد کی رہنمائی میں نوجوانوں نے ایک جلوس نکالا۔ جس میں وہ نظم کورس میں گائی گئی۔ جس کا ایک مصرعہ یہ ہے کہ ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

قومی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اُنہیں قید و بند کے مصائب بھی جھیلنے پڑے۔ لیکن اُنہوں نے ہر چیلنج کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ پاکستان بننے کے چند سال بعد اُن کے فرزند مصطفےٰ کمال پاشا نے بھی اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لیا لیکن بی۔ این۔ آر۔ آڈی ٹوریم میں۔ کیونکہ وہ عوامی مقرر نہیں ہیں۔

فیروز الدین منصور ساری عمر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے۔ آزادی

سے پہلے چنداں مشہور نہیں تھے لیکن ۱۹۴۷ء میں غیر مسلم کمیونسٹ ترکِ وطن کر گئے۔ تو فیروز الدین منصور کی شخصیت بھی اُبھری۔ میکلوڈ روڈ پر رتن سینما کے ساتھ جو چھوٹا سا قبرستان موجود ہے۔ اُس سے متصل ایک عمارت میں کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر تھے، وہی عمارت جہاں بعد میں "کوہستان" کے دفاتر قائم رہے۔ تقسیم کے بعد یہ عمارت ویران ہوگئی۔ فیروز الدین منصور یہیں رہتے تھے سجاد ظہیر پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری بنے۔ تو یہاں کچھ رونق ہوئی۔ منصور صوبہ کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری تھے۔ اس کے علاوہ پنجاب کسان کمیٹی کے صدر تھے اور اس دور میں اُنہوں نے کسانوں کے مسائل پر کچھ مفید کتابچے لکھے کمیونسٹ پارٹی کے کارکن اُنہیں دادا منصور کہتے تھے لیکن مجھے دادا کے لفظ کا یہ اسراف پسند نہیں تھا۔ اس لئے منصور صاحب ہی کہتا تھا۔ اُن سے میرے مراسم اُس دور کی یادگار ہیں۔ جب وہ بھی کافی ہاؤس میں خاصا وقت بسر کرتے تھے۔ اور میں بھی کافی ہاؤس کا رسیا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوا۔ تو اُن سے تعلقات بڑھ گئے۔ اس انجمن سے نکلا، تو کم ہو گئے۔

فیروز الدین منصور غریب تھے۔ مخلص تھے۔ اور کُل وقتی کارکن تھے۔ جیل کے مصائب بھی جھیلے اور بڑی کوشش کی کہ کمیونسٹ پارٹی کی جڑیں مضبوط ہوں۔ لیکن بات نہ بنی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کمیونزم لوگوں کے مزاج کو راس نہیں آتا تھا۔ اور دوسری یہ، کہ حکومت نے پارٹی کو خلافِ قانون قرار دیا۔ اس سے نئی بھرتی کے راستے میں رکاوٹ پڑ گئی۔

ملک فیروز خان نون بڑے نامور سیاست دان تھے، ان کے بارے میں ایک لطیفہ زبانِ زدِ عام رہا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں

ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ پڑھو مسلمانو! درود شریف لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ ۱۹۲۱ء میں خارزارِ سیاست میں قدم رکھا عوام کے سیاسی شعور کا یہ عالم تھا کہ صوبائی قانون ساز کونسل کی رکنیت کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک حریف نے دوستوں کے سامنے یہ تجویز بڑی سنجیدگی کے ساتھ رکھ دی کہ الیکشن لڑنے سے بہتر یہ ہے کہ فیروز خاں نون سے میری کُشتی کرا دو۔ جو جیتے۔ کونسل کا ممبر بن جائے۔ ملک صاحب کے چچا نے جب ایک کسان سے کہا کہ نون کو ووٹ دو۔ تو بولا۔ اچھا دے دوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے۔ کہ یہ شلجم ٹھاؤ۔ کار میں رکھو۔ اور میرے گھر پہنچا دو۔ اور میرے بچوں کو کار کی سیر کرا دو۔ ایک کسان اُن کے والد کے پاس پہنچا۔ کہنے لگا۔ دو سال ہوئے میری ایک گدھی چوری ہو گئی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ تمہارے گاؤں کے کمہار نے چُرائی تھی۔ اگر بیٹے کو ووٹ دلانا ہے۔ تو یا گدھی واپس کر دو۔ یا معاوضہ ادا کر دو۔

ملک فیروز خاں نون سیاسی اعتبار سے خاصے خوش نصیب تھے ۱۹۲۷ء میں عروج حاصل ہوا۔ نو سال تک متحدہ پنجاب میں وزیر رہے۔ فارغ ہوئے تو لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے۔ پانچ سال بعد وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنے۔ گویا مرکزی وزارت میں لئے گئے پہلے لیبر کا پورٹ فولیو ملا۔ پھر دفاع کا۔ برطانیہ کی جنگی کابینہ میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے رہے اور اقوامِ متحدہ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ تحریک پاکستان کے آخری دور میں حصہ لیا۔ پاکستان بنا تو پنجاب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی قیادت چاہی لیکن خان افتخار حسین آف ممدوٹ نے اس طرح چاروں شانے چت کیا کہ اڑھائی سال تک سیاست میں پذیرائی سے محروم

رہے۔ آخر قسمت کا ستارہ چمکا، مشرقی پاکستان کے پہلے پاکستانی گورنر بنے۔ تین سال بعد مغربی پاکستان میں وزارتِ عظمیٰ پہ فائز ہوئے۔ پھر مرکز میں وزارت میں لئے گئے۔ پہلے وزیر خارجہ تھے۔ پھر وہ وزیرِاعظم بن گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ میں فوجی انقلاب آیا اور یوں سے

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اس کے بعد ایسے گوشہ نشین ہوئے۔ کہ پھر نہ اُبھر سکے۔ اور دس سال بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ گوشہ نشینی کے دور میں اُن کی اہلیہ بیگم وقار النساء نون بدستور نمایاں رہیں۔ وہ ریڈ کراس ایسوسی ایشن میں پیش پیش تھیں اور پیپلز پارٹی کے دور میں بے دخل ہوئیں۔

ملک فیروز خان نون مصنف بھی تھے۔ سیاسی زندگی کی ہمہ ہمی کے دوران میں چار کتابیں لکھ ڈالیں۔ کینیڈا اور ہندوستان۔ احمقوں سے عقل ہندوستان۔ خاکِ معطر۔ گوشہ نشینی کے دور میں خود نوشت سوانح قلمبند کر ڈالے اس کتاب کا نام ہے FROM MEMORY یعنی یادداشت سے۔ لیکن یادداشت قدرے کمزور تھی جس کی بہت سی مثالیں کتاب کے مطالعہ سے سامنے آتی ہیں۔ کہتے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کا انتقال ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ حالانکہ ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ افغانستان میں بچہ سقہ کا انقلاب ۱۹۲۲ء سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ تحریک ہجرت کا سال ۱۹۲۹ء بتاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اسے گاندھی جی نے شروع کیا۔ حالانکہ یہ تحریک ۱۹۱۹ء میں جاری ہوئی۔ گاندھی جی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ایک خالص اسلامی تحریک تھی جسے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ایک فتویٰ دے کر شروع کیا ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن کی جو تجاویز منظرِ عام پر آئیں، اُن کی بھی غلط تاویل فرمائی

وہ کہتے ہیں کہ ان تجاویز کی رُو سے ہندوستان کو پانچ سات بڑے صوبوں میں منقسم ہونا تھا۔ اور صوبوں کو یہ حق دیا جانا تھا۔ کہ چاہیں، تو دس سال بعد مرکز سے الگ ہو جائیں۔ حالانکہ تجاویز کے نمایاں نقوش کچھ اس قسم کے تھے کہ برعظیم کے صوبوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جائے۔ اوّل: پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان دوم: بنگال اور آسام۔ سوم: باقی صوبے۔ ایک سہ منزلہ حکومت تجویز کی گئی تھی، ایک ایک صوبائی حکومت، ایک ایک گروپ حکومت اور ایک فیڈرل حکومت۔ یہ تجویز بھی تھی کہ دس سال بعد صوبوں کا کوئی گروپ مرکز سے تعلق پر نظر ثانی کر سکے گا۔ ملک فیروز خان نون نے اپنے عہد کے گفتہ و ناگفتہ زبانِ زد عام لطائف بھی درج کئے۔ لیکن پنجاب کے وزیر سردار وسوندھا سنگھ سے تعلق رکھنے والے لطائف اُن کے پیش رَو سردار سندر سنگھ مجیٹھیا سے منسوب کر دیئے۔

اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ ایک حقیقت نمایاں نظر آئے گی کہ اُنہیں برطانیہ سے خصوصی اُنس تھا۔ برعظیم میں برطانوی راج کی یادیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس نے جو ادارے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر بنا رکھے تھے۔ اُن کی افادیت کے قائل ہیں۔ اندازِ فکر جاگیر دارانہ ہے اور صرف خاص حد تک جمہوریت کے قائل ہیں۔ مثلاً اُنہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا۔ کہ برطانوی راج میں جو نمبردار، ذیل دار، سفید پوش اور کرسی نشین تھے۔ اُن میں سے صرف نمبردار باقی رہ گئے۔ ان کے نزدیک یہ چاروں طبقات حکومت کے استحکام کے لئے ضروری تھے۔ وہ زرعی اصلاحات پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ مشرقی پاکستان میں جاگیر داری نظام کی تنسیخ پر اظہارِ تاسف فرمایا۔ برطانوی جمہوریت کے حامی

تھے۔ لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ ایشیا میں جہاں اس کی آزمائش ہوئی، زبان کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ بالغوں کے حقِ رائے دہی کے خلاف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ آزادی سے پہلے ووٹروں کے لئے جو اوصاف مقرر تھے۔ وہ قائم رہیں اور اس پر مستزاد برقعہ پوش عورتوں کو ووٹ کا حق دینے کے خلاف تھے۔ محض اس بنا پر کہ جعلی ووٹ بھگتانے آسان ہو جاتے ہیں۔ ملک صاحب آزادیٔ صحافت کے مخالف تھے۔ اور اُردو اخبارات سے اُنہیں بہت شکایت تھی۔ اُن کا ارادہ تھا کہ صحافت کے خلاف زیادہ سخت گیرانہ قانون نافذ کیا جائے۔ اس کے لئے منصوبہ بنا رہے تھے کہ فوجی انقلاب نے بوریا بستر گول کر دیا۔ ملک صاحب کے نظریات میں حیرت کا کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ وہ بہت پُرانے سیاستدانوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور برطانیہ نوازی اور رجعت پسندی اور پُرانے نظام کو برقرار رکھنے کی آرزو اُن کی گھٹی میں شامل تھی اور اس اندازِ فکر سے انحراف اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کو میں نے کئی بار دیکھا۔ کئی بار سنا۔ اُن کی ایک پریس کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ لیکن کسی خصوصی بالمشافہ ملاقات کا موقع نہ ملا۔ لیکن "نصف ملاقات" کم از کم چھ مرتبہ ہوئی۔ کیونکہ ان سے خط و کتابت رہی میں نے دس خط لکھے۔ اُنہوں نے چھ خطوط کا جواب دیا۔ خطوط کا یہ تبادلہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کے عرصے میں ہوا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ برعظیم کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری۔ اُن کی عمر اکسٹھ باسٹھ برس کی تھی میں اٹھارہ انیس سال کا ایک ناپختہ سیاسی کارکن تھا۔ اس کے باوجود اُنہوں

نے ہمیشہ واپسی ڈاک خط کا جواب دیا۔ ایک دفعہ جواب میں دس دن کی تاخیر ہوئی تو انہوں نے معذرت کی۔ اور کہا کہ میں علالت کی وجہ سے جلد جواب نہ دے سکا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ، کہ میں نے دو خطوں میں ان پر نکتہ چینی کی اور اُنہوں نے بکمال شفقت اور محبت کے ساتھ اپنی پوزیشن واضح کی۔
بڑے بڑے لوگ قائداعظم سے خط و کتابت چاہتے تھے۔ اور اُن کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ لیکن جہاں تک نوجوانوں کا تعلق تھا قائداعظم اُن سے پیار کرتے تھے۔ اور اُن کی آواز پر کان دھرتے تھے اور میں بھی انہی نوجوانوں میں شامل تھا۔

قائداعظم کے لکھے ہوئے دیمک زدہ خطوط تو میرے پاس موجود تھے لیکن جو خطوط میں نے لکھے۔ ان کی نقول موجود نہیں تھیں، کیونکہ ٹائپ رائٹر تو موجود نہیں تھا۔ میں ہر خط ہاتھ سے لکھ کر بھیجتا تھا اس لئے نقول رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حکومت پاکستان نے قائداعظم کی دستاویزات کو ترتیب دیا اور ان کی فہرست چھاپی تو معلوم ہوا کہ میرے تمام خطوط محفوظ ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی عکسی نقول حاصل کر لیں۔ انہی کی بنا پر اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ خط و کتابت کے بعض پہلو پیش کر سکوں۔ اس سلسلے میں دو تین خطوط اور اُن کے جواب درج کرنا کافی ہوگا پہلے میرا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جو ۲۹ اگست ۱۹۳۸ء کو بھیجا:

"کیا میں آپ سے چند اہم مسائل پر تبادلہ خیالات کر سکتا ہوں؟ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستگی کی بنا پر مسلم طلبہ کے ساتھ میرا گہرا رابطہ ہے۔ میری بہترین مساعی اس بات پر مرتکز رہی ہیں، کہ اُنہیں مسلم لیگ کے وجود کے جواز کا یقین

دلاؤں وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور آپ کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہیں لیکن جو چیز اُنہیں بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ آپ کی مجلسِ عاملہ میں خطاب یافتگان کی موجودگی ہے وہ کہتے ہیں۔ اور میں اُن سے بڑی حد تک اتفاق کرتا ہوں کہ اگر مسلم لیگ نے برطانوی سامراج کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز کیا۔ تو یہ خطاب یافتگان اس میں کبھی حصّہ نہیں لیں گے۔"

"حکومتِ برطانیہ آج کے اہم سیاسی مسائل پر کانگرسی رہنماؤں سے ہمیشہ مشورہ کرتی ہے لیکن مسلم لیگی رہنماؤں سے مشورہ نہیں
"یہ بات میرے ضمیر کے خلاف ہے کہ ان امور کو

کرتی۔ حکومت کا طرزِ عمل ہمارے حق میں معاندانہ ہے۔ اس کے باوجود وہ عناصر لیگ پر غالب ہیں۔ جن کے حکومتِ برطانیہ کے ساتھ تعلقات ابدی نوعیت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ یا تو خطابات ترک کر دیں۔ یا لیگ سے نکل جائیں۔

"مزید برآں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کافی ترقی پسند عناصر پر مشتمل نہیں ہے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی کا سہرا مولانا ظفر علی خان کے سر ہے۔ اس کے باوجود اُنہیں مجلسِ عاملہ میں نہیں لیا گیا۔ یہی بات مولانا حسرت موہانی پر صادق آتی ہے۔ مسلمان عوام کی کوئی جماعت اُس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک ڈائریکٹ ایکشن پر اُس کا پختہ اعتقاد نہ ہو۔ اور اس معاملے میں یہی دو شخصیتیں لیگ کی مددگار ہو سکتی ہیں۔

اخبارات میں لاؤں یا پلیٹ فارم کے ذریعہ سے ان کا اعلان کروں۔ ایک سچے اور مخلص لیگی کی حیثیت سے مجھے آپ کے پاس آنا چاہیئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اوّل و آخر لیگی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ سے ملتجی ہوں کہ اس خط کا جواب دیں۔ اور جو مسئلہ میرے ذہن کو مختل کر رہا ہے۔ اُس پر میرا اطمینان کریں۔

"میں آپ سے اُس تحریکِ پاکستان کے بارے میں رائے بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں جس کا اِن دنوں پنجاب کے اخبارات میں بڑا چرچا ہے۔ اور جو مجھے نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ اگر آپ کہیں۔ تو میں جواب شائع نہیں کروں گا۔"

اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے ۹ ستمبر کو جو خط لکھا۔ وہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"مجھے آپ کا ۲۹ اگست ۱۹۳۸ء کا خط مل گیا تھا۔ علالت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ آپ نے جو تجاویز پیش کی ہیں۔ وہ میں نے نوٹ کر لی ہیں۔ اور ان کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے یہ توقع نہیں کریں گے کہ میں ان مسائل پر خط و کتابت میں بحث کروں۔ میرے نزدیک ابھی مسلمانوں کو سیاسی زبان سیکھنی ہے اور کسی قدر صبر سے کام لینے کی بھی تربیت حاصل کرنی ہے۔ اب مجھے کامیابی کی کچھ اُمید ہے۔ کیونکہ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ ان میں عزتِ نفس اور

خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے لیکن مکمل طور پر منظم ہونے میں ابھی کچھ اور وقت لگے گا۔"

اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ترکِ خطابات، ڈائریکٹ ایکشن، مجلسِ عاملہ کی تطہیر اور پاکستان ۔ یہ تمام معاملات اُن کے زیرِ غور ہیں لیکن انتظار ضرور کرنا پڑے گا۔

اُس زمانے میں ملک برکت علی مرحوم کی صوبہ مسلم لیگ معطل ہو چکی تھی اور سر سکندر حیات خان کی صدارت میں ایک مشترکہ تنظیمی کمیٹی بن چکی تھی لیکن یہ دونوں ادارے متوازی جماعتوں کا رُوپ لے چکے تھے اور ان کی کشاکش سے لیگ کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس پر ۳ر فروری ۱۹۳۹ء کو میں نے یہ خط لکھا :-

"مودبانہ عرض ہے کہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ہمیشہ سے مسلم لیگ کے کاز کی حمایت کرتی رہی ہے ۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جماعت نے مسلم لیگ کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے بہت کام کیا ہے ۔ ہمارے صوبے میں دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں ۔ ایک کانگرس، دوسری مجلس احرار ۔ ان دونوں جماعتوں کی مشترکہ سعی سے جنوری کے وسط میں ایک نام نہاد آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس ہوئی ۔ اگرچہ مسلم طلبہ نے اس کا مکمل مقاطعہ کیا لیکن اس کے باوجود یہ جماعتیں کہتی ہیں کہ مسلم طلبہ کانگرسی ہو رہے ہیں کیونکہ ساری تقریروں میں یہی کہا گیا تھا ۔ کہ کانگرس کے لئے کام کیا جائے ۔

"ہماری پُشت پر کوئی سیاسی جماعت موجود نہیں حتّٰی کہ صوبہ مسلم لیگ کا بھی کوئی وجود نہیں ۔ اگر ہمارے صوبے میں ایک

مضبوط لیگ ہوتی۔ تو وہ ہمارے لئے حمایت کا سرچشمہ ہوتی۔ تنظیمی کمیٹی کے صدر سردار سکندر حیات خان کے لئے ہمارے دل میں بہت احترام موجود ہے۔ لیکن میں بڑے افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُنہوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اور اب مجھے اجازت دیجئے کہ مسلم لیگ کے اُس گروپ کے بارے میں کچھ بتاؤں جس کی قیادت ملک برکت علی کے ہاتھ میں ہے۔ اس گروپ کے ایک رکن جناب غلام رسُول بیرسٹر نہایت غیر ذمہ دار آدمی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اُنہیں لیگ کا وجود ہی پسند نہیں۔ پچھلے دنوں اُن سے کچھ ملاقاتیں ہوئیں۔ میرا فرض ہے کہ اُن کے چند الفاظ آپ تک پہنچا دوں۔ وہ کہتے تھے۔ ہم اُس لیگ کی حمایت نہیں کرنا چاہتے جو جناح اور سکندر کی لیگ ہے حقیقت میں ہم فرقہ دار جماعتوں ہی کے قائل نہیں ہیں۔ اگر مسٹر جناح نے پٹنہ میں ہمارے خلاف فیصلہ کیا۔ تو ہم سب مستعفی ہو کر کانگرس میں شامل ہو جائیں گے۔

"میرا کسی دھڑے سے تعلق نہیں ہے لیکن مجھے یہ پوچھنے کی آزادی دیجئے گا کہ آیا ایسے لوگ مسلم لیگ کا کام چلا سکتے ہیں؟ میرے نزدیک سر سکندر بھی قصور وار ہیں کہ وہ لیگ کے تنظیمی کام سے غافل ہیں۔ ان حالات میں لیگ کے کاز کی حمایت ہمارے لئے بہت کٹھن ہو رہی ہے۔ کیا آپ ازراہِ کرم اس خط کا جواب عنایت فرمائیں گے؟ مجھے آپ سے یہ بھی توقع ہے کہ آپ سر سکندر اور اُن کے مخالف گروہ، دونوں کو انتباہ کریں گے۔ کہ وہ سنجیدگی

کے ساتھ لیگ کی تنظیم کا کام شروع کر دیں۔"

قائد اعظم نے اس کے جواب میں ۹ فروری کو یہ خط لکھا :-

"مجھے آپ کا ۳ فروری ۱۹۳۹ء کا خط مل گیا۔ اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں۔ بدقسمتی سے پنجاب پورے طور پر متحد نہیں ہے۔ لیکن حوصلہ نہ ہاریئے۔ ہمارا مقصد صحیح اور انصاف پر مبنی ہے۔ کوئی کام بھی مشکل یا کٹھن نہیں ہوتا۔ ہمیں آل انڈیا مسلم لیگ کا کام کرنا چاہیئے۔ اور اس کی حمایت کرنی چاہیئے جو معلومات آپ نے مہیا کی ہیں۔ وہ میں نے نوٹ کر لی ہیں پنجاب میں اس وقت جو حالت پیدا ہو چکی ہے مجھے بڑے دکھ کے ساتھ اس کا احساس ہے۔ اور میں اسے درست کرنے کے لئے پوری ہمت سے کام لے رہا ہوں۔"

دوسری عالمی جنگ کے آغاز سے پہلے کا ذکر ہے کہ قائد اعظم نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں فوجی بھرتی کے قانون (آرمی بل) کی حمایت کی تو کانگرس نواز مسلم طلبا کی نام نہاد آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائد اعظم کو مذمّت کا برقیہ بھیجا۔ یہ اگست ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ میں نے انہیں اس مسئلے پر پوری تائید و حمایت کا پیغام بھیجا۔ اس پر قائد اعظم نے سیسل ہوٹل شملہ سے یہ خط بھیجا :-

"آپ کے خط کے لئے بہت بہت شکریہ۔ میری تقریر کا مکمل متن سول اینڈ ملٹری گزٹ اور دوسرے اخباروں میں چھپ چکا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اسے احتیاط سے پڑھیں گے۔ تائید کے لئے میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا

کرتا ہوں۔"

اس پر میں نے ۲۱ راگست ۱۹۳۸ء کو انہیں ایک خط میں لکھا کہ ہم نے آپ کی حمایت تو کر دی ہے اور ہم آپ کی پشت پر ہیں لیکن :-

"میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہم حکومت پر یہ بات واشگاف کر دیں کہ ہندوستانی فوج کو کسی صورت میں برطانوی سامراجی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ حکومت کو چاہیئے کہ فوج کو فلسطین میں نہ بھیجے۔ جہاں مسلمانوں کو کچلا جا رہا ہے۔ یہی نہیں حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ وہ سرحدی ہنگاموں کے سلسلے میں فارورڈ پالیسی کو ترک کر دے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری معروضات پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔"

عبدالمجید قرشی اس بات کی جیتی جاگتی مثال تھے کہ اکیلا اور بے آسرا آدمی بھی چاہے، تو محض خلوص اور دیانت کے بل بوتے پر بڑے بڑے اداروں کے برابر قوم کی خدمت کر سکتا ہے۔ وہ سیدھے سادھے آدمی تھے۔ کھدّر کی دھوتی اور کرتہ پہنتے تھے۔ ضروریاتِ زندگی محدود تھیں۔ اس صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز میں وہ سیرتِ رسولؐ کی اشاعت کے لئے میدان میں نکلے۔ پہلے پٹی (ضلع قصور) سے ایک پندرہ روزہ اخبار "ایمان" جاری کیا۔ سفید کاغذ، اعلیٰ درجے کی کتابت، عمدہ طباعت اور مواد کے لحاظ سے بڑے بڑے دینی رسائل پر بھاری۔ پھر سیرت کمیٹی قائم کی۔ اور پانچ سال کے اندر اندر کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ سیرت نبوی کا تئیس زبانوں میں ترجمہ شائع کر کے بیس لاکھ کتابچے مفت تقسیم کرا دیئے۔ ملک

کے اندر اور باہر یوم النبیؐ کے جلسوں کا نظام قائم کر دیا۔ سات ملکوں میں اشاعتِ سیرت کے مبلغ بھیجے۔ امیر شکیب ارسلان کی کتاب "اسبابِ زوالِ امّت" اور علامہ رشید رضا مصری کی "حقیقتِ دین" کی ہزار ہا کاپیاں چھاپ کر مفت تقسیم کر دیں۔ اصلاحِ امّت کے لئے پانسو مضامین کئی زبانوں میں منتقل کر کے اُن کی آٹھ ہزار کاپیاں دنیا بھر کے اسلامی اخبارات کو بھیج دیں۔ پچیس ہزار پوسٹر، ستّر ہزار ہینڈ بل اور پندرہ ہزار متفرق رسائل شائع کئے۔ سات ہزار مساجد میں اٹھہتر ہزار خطباتِ جمعہ و عیدین تقسیم کرائے۔ سیرت کمیٹی کی سوا دو سو شاخیں تھیں۔ جن کے ساتھ سوا دو ہزار جامع مسجدیں ملحق تھیں۔ ان سب میں ہر نمازِ جمعہ کے موقع پر سیرت کمیٹی کے مرتبہ خطبات پڑھے جاتے تھے۔

عبد المجید قرشی کا طریق کار یہ تھا کہ چندہ نہیں مانگتے تھے۔ اپنی گرہ سے پیسے خرچ کر کے سیرتِ نبوی پر ایک کتابچہ چھاپتے۔ اور لوگوں سے کہتے۔ کہ وہ اِسے بڑی تعداد میں خرید کر مفت تقسیم کریں یا کرائیں۔ اس سے جو آمدنی ہوتی۔ اس سے ایک اور کتابچہ چھاپ لیتے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ "ایمان" کا سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ غربا سے صرف دو روپے لئے جاتے تھے۔ اور اخبار کی آمدنی اخبار ہی پر صرف ہوتی تھی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ قوم سے چندہ مانگنے کی جگہ سیرت کمیٹی نے اپنے سرمائے سے آٹھ ہزار روپے قوم کے لئے وقف کئے اور تین ہزار روپے مفتیٔ اعظم فلسطین کو بھیجے۔

عبد المجید قرشی خاموش کارکن تھے۔ تقریریں نہیں کرتے تھے۔ اپنی تشہیر کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بس ایک ہی دُھن تھی کہ سیرتِ رسولؐ زیادہ

سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ اس کے بعد تحریکِ تبلیغِ قرآن کا بھی آغاز کیا۔ اتنے میں سیاسی سرگرمیاں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر اس طرح چھاگئیں۔ کہ سیرت کی تحریک پسِ پُشت پڑ گئی۔ بہر حال عبدالمجید قرشی بدستور مصروف رہے اس نیک دل کارکن کو مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اسے "ایمان فروش" بھی کہا گیا۔ اس پر قومی سرمایہ خود صرف کرنے کا الزام بھی لگا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کا دامن ہر قسم کی آلائشوں سے پاک تھا۔ پاکستان بننے کے چند مہینے بعد لاہور میں "زمیندار" کے دفتر کے سامنے ایک مکان سے اُن کی نعش برآمد ہوئی اور وہ بھی اس صورت میں کہ رسّے سے بندھے ہوئے تھے۔ افسوس قاتلوں کا سُراغ نہ ملا۔

عبدالمجید قرشی (کشمیری) تحریکِ کشمیر کے اُن سالاروں میں تھے جنہوں نے اپنے مقصد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے گُریز نہ کیا۔ لیکن جن کے کردار کی پوری تصویر کشی کے لئے تاریخ کسی غیر جانبدار مورّخ کی منتظر ہے۔ ڈوگرہ شاہی کے دور میں اُنہوں نے صحافت اور سیاست کے دوائر میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ قید وبند کے مصائب جھیلے۔ شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس کو نازک مرحلوں پر قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد تحریکِ حریت کشمیر نے جو نئی کروٹ لی۔ اس میں بھی پیش پیش رہے۔ "ترجمانِ کشمیر" کی ادارت فرماتے رہے اور ۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اُنہوں نے نہ دولت جمع کی، نہ املاک حاصل کیں، نہ قیادت کا تاج پہننے کی کوشش کی۔ اُن کی ابتدا سیاسی کارکن کی حیثیت سے ہوئی اور انتہا بھی اسی حیثیت سے رہی۔ اُن کا شعار خدمت تھا بے لوث خدمت۔

والدِ مرحوم مولانا عبد المجید سالکؔ سے اُن کے مراسم کی ابتدا تقریباً چالیس سال قبل اُس وقت ہوئی جب ڈوگرہ شاہی کے خلاف کشمیر کے مظلوم اور عوام کی جد وجہد اپنے اوّلین مرحلے میں تھی۔ عبد المجید قرشی روزنامہ "انقلاب" کے نامہ نگار خصوصی تھے۔ اُنہوں نے ڈوگرہ شاہی کی بے انصافیوں اور دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا۔ تو ڈوگرہ شاہی نے ہر ممکن کوشش کی۔ کہ یہ معلوم کیا جائے کہ نامہ نگار کون ہے۔ اس کام کے لیے سپیشل سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر مقرر کیا۔ بعض سرکار پرست مسلمانوں کی خدمات بھی حاصل کیں جنہوں نے کبھی کسی کا نام لے دیا کبھی کسی کا۔ اور اس طرح بہت سے مخلص کارکن زیرِ عتاب آ گئے۔ عبد المجید قرشی اور سالکؔ مرحوم کے درمیان یہ مفاہمت ہوئی کہ قرشی مرحوم جو معلومات فراہم کریں گے وہ مصدقہ اور صحیح ہوں گی اور سالکؔ ان معلومات کی اشاعت کریں گے۔ نامہ نگار کا نام صیغۂ راز میں رکھیں گے اور اُن کے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودات کتابت کے بعد نذرِ آتش کر دیں گے تاکہ کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ اس کے بعد قرشی صاحب نے زیادہ کھُل کر لکھنا شروع کیا۔ ڈوگرہ شاہی بہت سیخ پا ہوئی۔ اُس نے ایک ضمیر فروش مسلمان کارکُن کی خدمات حاصل کیں۔ کہ وہ نامہ نگار کا نام معلوم کرے۔ یہ شخص والدِ مرحوم سے ملا۔ "انقلاب" کی خدمات کا اعتراف کیا۔ نامہ نگار خصوصی کی تحریروں کو سراہا اور باتوں باتوں میں اس کا نام معلوم کرنا چاہا۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو والدِ مرحوم کو ایک بڑی رقم کا لالچ دیا۔ اس پر والد نے کہا۔ ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ آپ کو اس مشن پر بھیج رہے ہیں۔ اُنہیں ہمارا یہ پیغام پہنچا دیجیے۔ کہ اگر حکومت کرنی ہے تو مسلمانوں سے انصاف کریں۔ جب انصاف ہو گا تو نامہ نگار کا نام معلوم کرنے کی

ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے بعد بھی جب عبدالمجید قریشی کے مضامین چھپتے رہے اور اُن سے ریاست کے مسلم عوام میں سیاسی شعور بڑھنے لگا تو حکومت نے ریاست میں انقلاب کا داخلہ بند کر دیا۔ اس پر والد مرحوم نے "کشمیری مسلمان" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تو اس اخبار کا داخلہ بھی بند ہو گیا۔ اس پر سالک مرحوم نے "مظلوم کشمیر" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اُس کا داخلہ بھی بند ہو گیا تو "مکتوبِ کشمیر" کے نام سے ایک پوسٹر نما اخبار جاری کیا۔ جو مخلص کارکنوں کی بدولت راتوں رات ریاست کے شہروں کے در و دیوار پر چسپاں ہو جاتا تھا۔ اس طرح عبدالمجید سالک اور عبدالمجید قریشی کے تعاون کی بدولت سیاسی شعور کی تخلیق کا کام جاری رہا۔

مولانا قریشی نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جموں میں ایک ریڈنگ روم قائم کر رکھا تھا جس میں اسلامی جرائد منگوائے جاتے تھے۔ وسائل محدود تھے۔ لیکن اُن کی ہمّت اور بے پایاں خلوص کی بدولت یہ ریڈنگ روم جاری رہا۔ اور اس نے تحریکِ حریتِ کشمیر کے لئے ایک مرکز کا کام بھی دیا۔ جہاں کارکن جمع ہوتے۔ تبادلۂ خیالات کرتے اور کام کا طریقہ طے کرتے۔ ۱۹۳۲ء میں مرحوم نے "پاسبان" کی ادارت سنبھالی۔ جو تحریکِ کشمیر کا اوّلین ترجمان تھا۔ مسلم کانفرنس قائم ہوئی تو اُنہوں نے شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس سے بھرپور تعاون کیا۔ کئی بار جیل میں ٹھونسے گئے۔ لیکن اپنے موقف سے کبھی سرِ مُو انحراف نہ کیا۔ آزاد کشمیر میں اُن کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن اُنہوں نے پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ تاوقتیکہ معبودِ حقیقی کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔

شفاءالملک حکیم محمد حسن قرشی طبیب بھی تھے۔ ادیب بھی۔ کسی قدر خطیب بھی اور ملنے والوں کے حبیب بھی۔ جہاں تک علم طب کا تعلق ہے۔ وہ محض مطب نہیں کرتے تھے۔ علمِ طب میں تحقیق بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بہت سی کتابیں لکھ ڈالیں۔ جن سے اطبا فیض پاتے رہے اور پاتے ہیں۔ وہ کافی عرصہ طبیہ کالج کے پرنسپل رہے اور اس وقت اُن کے ہزارہا شاگرد مطب کرتے ہیں۔ اُن کے ادیب ہونے کا انکشاف اُس وقت ہوا۔ جب اُنہوں نے علامہ اقبال کی زندگی کے آخری لمحات پر مقالہ لکھ کر سب کو چونکا دیا۔ علامہ اقبال کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے اور اُن کی زندگی کے آخری دنوں میں تو بہت قریب رہے۔ اور یونانی ادویات سے اُن کے عوارض میں کمی کرتے رہے۔ حکیم صاحب مجلسی تقریبات میں حصہ لیتے رہے۔ خطابت فرماتے تھے۔ لیکن ہلکی پھلکی، آہستہ رَو اور گہرائی سے بھرپور۔ پھر وہ دوستوں کے دوست تھے۔ جس کے ساتھ ایک بار دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ اُس سے خوب نباہ کیا۔

اُن کی وضعداری کے کیا کہنے تھے؟ مہر و سالکؔ کے ساتھ برسوں پُرانے روابط تھے۔ والد کی وفات کے بعد بھی مجھ پر بے حد شفقت فرماتے رہے۔ یہاں تک، کہ جب کبھی مولانا مہر کے ہاں آئے۔ غریب خانے کو بھی فراموش نہ کیا اور چند لمحات میرے ساتھ گزارے۔ میرے لئے یہ مختصر ملاقاتیں باعثِ فخر ہیں۔ وہ، جسے تبادلۂ خیالات کہتے ہیں۔ مجھ سے کبھی نہ ہوا کیونکہ ایک حجاب حائل تھا۔ وہ بزرگوں کے دوست تھے اور میرے دوست نہیں بزرگ تھے۔ بہر حال کبھی کبھی میرے ذاتی مسائل پر گفت گو فرما لیتے تھے جب کبھی طبی مشورے کے لئے گیا۔ نسخے کے نیچے "بلا قیمت"، لکھ دیا کیونکہ اُنہیں

یہ گوارہ نہیں تھا کہ ابنِ سالک قومی دواخانے میں ادویات کی قیمت ادا کرے۔

ہماری بزرگ شخصیات کو اتحاد عالمِ اسلامی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اور حضرت شفاء الملک اس لگاؤ میں پیش پیش تھے۔ موتمر عالمِ اسلامی کی پنجاب شاخ کے صدر تھے۔ مفتئ اعظم امین الحسینی سے اُن کے گہرے تعلقات تھے جب مفتئ اعظم مسلم سربراہ کانفرنس کے سلسلے میں لاہور آئے۔ تو حکیم صاحب صاحبِ فراش تھے۔ چنانچہ مفتئ اعظم بہ نفسِ نفیس اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دعا فرمائی۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بھی حکیم صاحب نے بہت خدمات سرانجام دیں۔ وہ سیاسی لیڈر نہیں تھے۔ اس لئے جلسوں، جلوسوں میں تو نہ گئے لیکن خاموشی کے ساتھ تحریک کے کارکنوں کے لئے بڑا سہارا بنے رہے

ان کے دو صاحبزادوں کے ساتھ میرا دیرینہ تعلق ہے۔ ایک آفتاب قرشی۔ دوسرے ریاض قرشی۔ دونوں مطب کرتے ہیں۔ آفتاب قرشی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ اُن کا گھر لیگی کارکنوں کا مرکز تھا۔ موصوف مجلسی سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ جلسوں سے خطاب کرتے ہیں۔ اتحاد عالمِ اسلامی کے لئے ٹھوس خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ اور طبی تحقیق بھی فرماتے ہیں۔ گویا حضرت شفاء الملک کے حقیقی جانشین ہیں ریاض قرشی "مشیر الاطباء" کے مدیر ہیں اور حکیم صاحب کی مطبوعات کی اشاعت کا فرض بھی انجام دیتے ہیں۔

ملک لال دین قیصر زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن پنجابی زبان کے نہایت اعلیٰ شاعر تھے اور سیاسیات میں اتنا درک حاصل تھا کہ علامہ اقبال، قائداعظم اور میاں فضل حسین جیسے ذی وقار سیاست دان اُنہیں مشورے کے

لئے بلایا کرتے تھے۔ جب ۱۹۳۵ء کا آئینِ حکومتِ ہند نافذ ہوا اور عام انتخابات کی آمد آمد تھی تو قائدِ اعظم کی خواہش تھی کہ پنجاب کے مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے انتخابات لڑیں۔ یہی آرزو علامہ اقبال کی تھی۔ لیکن میاں فضل حسین چاہتے تھے کہ اتحاد پارٹی کو دوبارہ منظم کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے پارٹی کی از سرِ نو تنظیم شروع کر دی۔ ان دنوں ملک لال دین قیصرؔ نے قائدِ اعظم اور میاں فضل حسین کے درمیان ملاقات کا بندوبست کیا اور اس میں خود بھی شریک ہوئے۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

ملک لال دین قیصر پُرانے سیاسی کارکن تھے۔ اور وہ بھی اتنے بے لوث۔ کہ کبھی کسی منصب کی آرزو نہ کی۔ محض کام کو شعار بنایا اور ضرورت پڑنے پر جیل جانے سے بھی گریز نہ کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز تحریکِ خلافت سے ہوا۔ مسلمانوں کے علیحدہ حقوق کے لئے جد و جہد شروع ہوئی۔ تو اس میں پیش پیش رہے۔ مغل پورہ انجنیئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کیپٹن ڈیکر کیخلاف اہانتِ رسُول کے سلسلے میں ایجی ٹیشن ہوئی تو قیصرؔ اس کے ہراول دستے کی قیادت فرما رہے تھے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو آبادی کے مطابق سیاسی نیابت دلانے کے لئے "چھپن فی صدی تحریک" کے تو وہی روحِ رواں تھے نہرو رپورٹ کے خلاف اُنہوں نے جہاد کیا۔ شہید گنج کی تحریک میں وہ شامل ہوئے خاکساروں کی اعانت اُنہوں نے کی۔ تحریکِ پاکستان میں بھی دامے، درمے قدمے اور سخنے شریک رہے۔

افسوس، اُن کا مجموعۂ کلام مرتب نہ ہو سکا۔ ہو جاتا تو اُنہیں پنجابی شاعری کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہوتا۔ تحریکِ خلافت سے پہلے "سیدل" تخلص کرتے تھے۔ قومی تحریکوں میں حصّہ لیا تو قیصرؔ کا تخلص اپنا لیا۔

اُن کے بعض گیت تو اس طرح زبان زدِ عام ہوئے۔ کہ عملاً لوک گیت بن گئے۔ تحریکِ خلافت کے دور میں "مصطفےٰ کمال پاشا دے تیریاں دور بلائیں" کا گیت پنجاب کے در و دیوار میں گونجتا رہا۔ رومانی گیت بھی لکھے اُنہیں مجھ سے بہت پیار تھا۔ جب کوئی نئی چیز لکھتے۔ مجھے سُناتے۔ میرا ان کا ربط اُس وقت ہوا۔ جب میری خالہ امت اللہ خانم اُن سے بیاہی گئی۔ ایک بچّہ پیدا ہوا۔ ملک اقبال قیصر۔ جو اس وقت کاروبار میں مصروف ہیں لیکن ایک سال بعد خالہ کا انتقال ہو گیا۔ بہر حال ملک لال دین قیصرؔ نے آخری دم تک ہمارے خاندان سے محبت کا رشتہ قائم رکھا۔ اور اکثر ہمارے گھر آتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اُن کی خواہش تھی کہ ایک ہفت روزہ جاری کریں۔ مجھے اس کی ادارت سونپنا چاہتے تھے لیکن میں کسی زیادہ محفوظ ملازمت کا قائل تھا۔

قیصرؔ کس قسم کے قومی کارکن تھے؟ اس کا اندازہ والدِ مرحوم کی اس تحریر سے ہوتا ہے کہ "ملک لال دین قیصر لاہور میں ہر قسم کے قومی کارکنوں اور رضاکاروں کے کمانڈر سمجھے جاتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی جگہ مسلم حقوق کی حفاظت کے لئے رضاکاروں کی ضرورت ہوئی تو قیصرؔ نے راتوں رات شہر کے مختلف حصّوں میں گھوم پھر کر صبح ہونے تک دو ہزار نوجوانوں کا ایک لشکر بھرتی کر لیا۔"

کالی ناتھ رائے کھلنا (بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئے۔ لیکن صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ تو لاہور میں۔ اور وہ بھی اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ پینتیس ۳۵ سال تک اداریہ نگاری فرماتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں لاہور آئے اور انگریزی زبان کے ایک ہفت روزہ "دی پنجابی" کی ادارت پر فائز ہوئے چھ سال بعد

روزنامہ "ٹریبیون" کے ایڈیٹر بنے۔ اور ۱۹۴۵ء تک اس عہدے پر فائز رہے
اُن کے ساتھ میرے مراسم کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال ایک بار بالی جی
کی مدد سے اُنہیں ملا۔ اور اُن سے چند منٹ کے لئے اشیرباد لی۔ کالی ناتھ رائے
اپنی قسم کے واحد ایڈیٹر تھے۔ نہ کسی پریس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ نہ کسی
مجلسی تقریب میں نظر آئے۔ نہ سیاسی یا مجلسی رہنماؤں سے کوئی راہ و رسم رکھی۔
نہ نجی تعلقات کا دائرہ وسیع کیا۔ گھر سے دفتر آتے اور دفتر سے گھر چلے جاتے تھے
اور اس کے علاوہ کوئی اور شغل نہیں تھا۔ میں نے ایک سینئر صحافی سے ان کی
کم آمیزی یا عدم آمیزی کا سبب پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ کالی ناتھ رائے ایڈیٹر
کو اُس زمانے کے ہائی کورٹ جج کی طرح سمجھتے تھے۔ جس طرح جج انصاف کے
عمل میں غیر جانب دار رہنے کے لئے مجلسی زندگی سے دُوری کو ضروری خیال
کرتے تھے۔ اُسی طرح کالی ناتھ رائے محسوس کرتے تھے۔ کہ ایڈیٹر کو بھی مجلسی
زندگی سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے۔ تاکہ اُس کی رائے کسی سے متاثر نہ ہو

کالی ناتھ رائے زمانے کی روش کے مطابق طویل اداریئے لکھتے
تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کا کوئی اداریہ دو کالم سے کم میں نہیں
سماتا تھا۔ اور جب کوئی بہت اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو پورے صفحے کا اداریہ
لکھ دیتے اور جب مہاتما گاندھی اور سی۔ پی کے کانگرسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر
کھارے کے درمیان ایک آئینی مسئلے پر کشمکش ہوئی۔ تو کالی ناتھ رائے
نے گاندھی جی اور کانگرسی ہائی کمان کے نقطۂ نگاہ کی مذمت میں دس دن
تک پورے صفحے کے اداریئے لکھے۔ ویسے اُن کی تحریر
میں اعتدال اور توازن ہوتا تھا۔ اور جوش و خروش نہیں، استدلال
نمایاں ہوتا تھا۔

مہاشہ کرشن اپنے عہد میں پنجاب کے سب سے بڑے ہندو اخبار نویس تھے۔ ۱۹۱۹ء میں "پرتاپ" جاری کیا۔ جو لاہور کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ تھا۔ ادبی اور لسانی اعتبار سے اس کا پایہ بلند نہیں تھا لیکن فنی اعتبار سے اعلیٰ درجے کا اخبار تھا۔ زبان سادہ، خبروں کی بہتات، عوام پسند مزاحیہ کالم اور سب سے بڑھ کر مہاشہ کرشن کے اداریے، اداریہ نگاری میں موصوف کو ہندو صحافت میں وہی مقام حاصل تھا جو اُردو صحافت میں غلام رسُول مہر کو حاصل تھا۔ اُن کے اداریوں میں گہرائی بھی تھی۔ گیرائی بھی۔ استدلالی انداز بھی تھا۔ اور کہیں کہیں جذباتیت کے چھینٹے بھی۔ وہ فرقہ پرست تھے مسلمانوں کے کٹّر مخالف تھے مسلم لیگ اور پاکستان کے تصور سے متنفّر تھے لیکن یہ تو پالیسی کی بات ہے۔ ہم نے تعریف کی۔ توفنّی پہلوؤں کی!

ایک بات میں کالی ناتھ رائے سے بہت ملتے جلتے تھے اور وہ بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی ریت۔ وزیروں، امیروں اور اعلیٰ افسروں کی صحبت سے احتراز، مجلسی تقریبات میں زیادہ شرکت سے گریز۔ آن پر کھیلنا اُنہیں گوارا نہیں تھا۔ بس ایک بار قدم ڈگمگا گئے اور وہ اولاد کی خاطر۔ اُن کے دو بیٹے تھے، ویریندر اور نریندر۔ دونوں اخبار ہی سے وابستہ تھے۔ ویریندر کو قومی مسائل میں دسترس حاصل تھی۔ نریندر کو بین الاقوامی مسائل میں۔ یہ دونوں اب بھی سرحد کے اُس پار "پرتاپ" ہی سے وابستہ ہیں۔ ہاں تو میں قدم ڈگمگانے کی بات کر رہا تھا لاہور میں ایک نوجوان ہری کشن نے دہشت انگیزوں سے اثر قبول کرتے ہوئے گورنر کو گولی کا نشانہ بنانا چاہا۔ گورنر تو بچ گیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل مارا گیا حکومت نے سازش کا مقدمہ بنایا۔ خوش حال چند خورسند کے فرزند رنبیر اور

مہاشہ کرشن کے نورِ نظر ویریندر کو بھی دھر لیا۔ رنبیر کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا لیکن ہائی کورٹ میں اپیل پر بری ہو گئے۔ ویریندر کا اس سازش میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ بس اتنی بات تھی کہ انھوں نے بعض محفلوں میں محض دوسروں پہ رعب ڈالنے کی خاطر یہ کہا تھا کہ ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں۔ سو ویریندر کی رہائی کے لئے مہاشہ کرشن کو اپنی روش سے ہٹ کر اربابِ اقتدار سے سفارش کرنا پڑی۔

ہندو اور مسلمان اخباروں میں محاذ آرائی کی کیفیت مستقل تھی۔ کبھی کبھی زیادہ شدت بھی آجاتی۔ لیکن ہندو اور مسلمان اخبار نویسوں کے مجلسی تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور جب کسی پر حکومت کی طرف سے ابتلا آتی۔ تو سب ایک ہو جاتے۔ میں نے یہ تو سُن رکھا تھا کہ سر سکندر کے زمانے میں کوئی ہندو یا مسلمان اخبار تادیب کی زد میں آتا۔ تو والدِ مرحوم ہی وفد لے کر سر سکندر کے پاس جاتے اور معاملات سلجھا آتے۔ لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ مہاشہ کرشن نے بھی ایک بار "انقلاب" کی مدد فرمائی۔ اس لئے یہ واقعہ شورش کاشمیری کی زبانی سُنیے۔ "نورتن" میں لکھتے ہیں: "۱۹۴۶ء میں روزنامہ انقلاب پر حکومت کی طرف سے کوئی افتاد آئی تو مجھے یاد ہے کہ وہ (مہاشہ کرشن) ایڈیٹروں کی میٹنگ میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ دفتر انقلاب ہی میں منعقد ہوئی۔ مہاشہ جی نے حکومت پر نکتہ چینی کی اور انقلاب کو اس کی آزادی کے مسئلے میں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ واضح رہے کہ انقلاب اور "پرتاپ" میں بعد المشرقین تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے افکار و نظریات کے سخت مخالف تھے۔ بلکہ خیالات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے تھے۔

اُستاد کرم امرتسری کی صورت سے آشنا ہوں۔ ایک آدھ بار کلام بھی سُنا۔ لیکن گفت گو کا موقع نہیں ملا۔ البتہ حضرت صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کی زبانی ان کے بارے میں کچھ سُن رکھا تھا۔ کہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اُن کا کلام سنتے سُنتے کہا اُستاد : کبھی غالب کے اس شعر کا مضمون باندھا ہے کہ ؎

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس پر اُستاد نے جواب میں یہ رباعی پیش کر دی ؎

پانی وانگ سی بخت، جماؤ نداکیہ
ایس کم بخت نوں لگدی جاگ نہیں سی
کنداں نال ہُندے گھر عاشقاں دے
کوٹھی کوئی محل کوئی باگ نہیں سی
شبو، موتیا، نرگس، گلاب کتھّے
میرے گھر وچ تے سُکّا ساگ نہیں سی
جس دن اوہ آئے، کرم، گھر میرے
خالی گھڑا سی جلدا چراغ نہیں سی

اس پر اقبال نے کہا۔ آپ تو پنجابی کے غالب ہیں۔ استاد کرم نے ایسے گیت لکھے۔ جو لوک گیت کا روپ لے کر پنجاب کی فضاؤں میں لہرائے۔ اُنھوں نے کافیاں اور نعتیں بھی کہیں، جن سے عوام نے روحانی فیض اخذ کیا اور مختلف سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر ایسی قومی نظمیں بھی لکھیں۔ جنھوں نے عوام کے جذبات کو برمایا اور تڑپایا۔ طرّہ یہ کہ آزاد شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور اُردو کلام راگ بھیم، راگ درباری اور

راگ بھیروں میں لکھا۔ ۱۹۵۸ء میں انتقال کیا اور پندرہ سال بعد میجر عبدالکریم خان ریٹائرڈ نے "کرم پھلواری" کے نام سے اُن کا بکھرا ہوا کلام یکجا کر دیا

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی بہت بڑے ادیب تھے۔ مدتوں پنجاب میں اُردو تحریک کے قائد رہے کہ اُردو زبان وادب سے اُنھیں بے پناہ لگاؤ تھا۔ تعصب نام کو نہیں تھا۔ علم وادب ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں مجھے "اُردو کے ہندو شعرا" پر ایک کتاب لکھنا تھی۔ اُن سے خط وکتابت ہوئی اور اُنھوں نے ازراہ شفقت رہنمائی فرمائی۔ میں نے اُنھیں ایک ایسے وقت پہ دیکھا جب وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور سہارا لے کر چلتے تھے۔ بڑھاپے میں اُنھیں ایک بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ یہ، کہ اُن کے جواں سال صاحبزادے پنڈت پیارے لال دتاتریہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ لاہور کے مشہور انگریزی روزنامہ "ٹریبیون" میں کام کرتے تھے۔

پنڈت کیفی محقق بھی تھے۔ لسانیات میں خصوصی درک رکھتے تھے اور اُنھوں نے کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ لیکن میرے نزدیک اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا۔ کہ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اُردو تحریک کا دامن نہ چھوڑا۔ مسلم لیگ کی نشاۃِ ثانیہ کے دوران میں جب اُردو تحریک نے سیاسی رنگ لے لیا۔ تو اُن دنوں بھی اُنھوں نے انجمنِ اُردو پنجاب کی قیادت قبول فرمائی۔ بلکہ سر شانتی سروپ بھٹناگر جیسے نامی گرامی سائنس دان اور دوسرے ہندو اہلِ علم کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں پنجاب کے تمام ہندو اخبارات اُردو میں نکلنے کے باوجود اُردو زبان کے

خلاف زہریلے پروپیگنڈے میں مصروف رہے۔ لیکن پنڈت کیفی اس سے بالکل متاثر نہ ہوئے اور اُردو زبان کے حق میں کام کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد دہلی چلے گئے اور مولانا عبدالحق کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے کیونکہ پنجاب میں بھی وہی بابائے اُردو کے دست و بازو تھے۔

•

خالد لطیف گابا کی کہانی سُننے کے قابل ہے۔ وہ پنجاب کے ایک لکھ پتی تاجر ہرکشن لال گابا کے فرزند تھے۔ ہرکشن لال گابا کسی زمانے میں وزیر بھی رہے تجارت کا ذوق پیدا ہوا، تو خوب اُبھرے جس کاروبار میں ہاتھ ڈالا، پوبارے ہو گئے اور پھر زوال آیا۔ تو اس تیزی کے ساتھ۔ کہ سارا کاروبار ٹھپ ہو گیا قرض سے بال بال بندھ گیا۔ دیوالیہ ہو گئے۔ اور سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا کہ توہینِ عدالت کے مرتکب ٹھہرائے گئے۔ معافی مانگ لیتے تو رہا ہو جاتے لیکن وہ اکڑ گئے اور قید کاٹ لی۔ آخر میں بڑی بے بسی کے عالم میں انتقال کر گئے۔

خالد لطیف گابا کا اصل نام کنہیا لال گابا تھا، حسن آرا نامی ایک مسلمان خاتون کے شوہر تھے۔ بیرسٹر تھے اور بڑے نمایاں مصنف تھے بضف صدی پہلے کی بات ہے۔ ایک امریکی عورت مسز میو نے "مدر انڈیا" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندوستانیوں کو اتنا رگڑا کہ ہمالہ سے لے کر راس کماری تک خاص طور پر ہندو چلّا اُٹھے، کیونکہ اصل حملہ انہی پر ہوا تھا خالد لطیف گابا نے "مدر انڈیا" کے جواب میں "انکل سام" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جس میں امریکی تہذیب کے تمام مکروہ پہلو بے نقاب کر دیئے یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد گابا نے ایک کتاب لکھی "ہز ہائی نس"

اس میں برعظیم کی دلیسی ریاستوں کے نظام کا پردہ چاک کیا اور بڑے بڑے راجاؤں، مہاراجاؤں کی بدعنوانیوں کا تذکرہ کیا۔ اُن کی عیاشیوں کا حال لکھا ایک تو موضوع دلچسپ تھا۔ دوسرے گابا کا تیکھا اور شوخ اسلوبِ نگارش سونے پر سہاگہ ہوگیا اور یہ کتاب بھی پسند کی گئی۔

اب حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ کنہیالال گابا (کے ایل گابا) نے اسلام قبول کرلیا۔ اور ان کا اسلامی نام خالدلطیف گابا رکھا گیا۔ گویا پہلے بھی کے۔ ایل۔ گابا تھے۔ اب بھی کے ایل گابا رہے۔ قبولِ اسلام کی تقریب مولوی محمد علی صدر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے مسکن پر ہوئی۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان۔ علامہ عبداللہ یوسف علی اور دوسرے مسلمان زعما بھی شریک تھے۔ چند دن بعد اہالیانِ لاہور کی طرف سے خالدلطیف گابا کو ایک عصرانہ دیا گیا۔ تو اُن کی بیگم حسن آرا نے ایک نمایاں شخصیت سے کہا "دیکھا! ہم نے شوہر کو آخر دائرہ اسلام میں لے آتے"۔ اس پر اس شخصیت نے کہا۔ "اس کا کریڈٹ تمہیں نہیں ملتا۔ کیونکہ تم اس قابل ہوتیں تو موصوف عرصہ پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہوجاتے"۔

خالدلطیف گابا نے پیغمبر صحرا PROPHET OF THE DESERT کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بہت پسند کی گئی۔ پنجاب کے مسلمان ان کے اتنے دالہ و شیدا تھے۔ کہ جب مرکزی اسمبلی کی ایک مسلم نشست خالی ہوئی تو اُنہیں اس کے لئے امیدوار بنالیا۔ مقابلے میں ایک سفیدریش بزرگ قومی رہنما خان بہادر حاجی رحیم بخش تھے۔ اُنہیں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا ٹکٹ بھی حاصل تھا لیکن مسلمانوں نے اُنہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ خالدلطیف گابا نے بھی عوام کے جذبات کو اُبھارنے میں کچھ دلچسپ اقدامات فرمائے۔ وہ

محلّے محلّے میں گئے۔ اور خاص طور پر مسلمان خواتین سے خطاب کرتے ہوئے کہا "بہنو! میں نے حلقہ بگوش اسلام ہو کر اپنے سارے دنیاوی رشتے ناطے توڑ ڈالے ہیں۔ اب آپ ہی میری بہنیں ہیں۔ آپ ہی میری مائیں ہیں۔ چاہو تو خدمت لے لو۔ چاہو تو ٹھکرا دو۔" سُنا ہے کہ عورتیں اس پر رو دیتی تھیں۔ صدقے واری ہوتی تھیں اور اس طرح رائے عامہ اُن کے حق میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ پولنگ کا دن آیا۔ تو خان بہادر حاجی رحیم بخش نے اپنے کیمپوں میں نان مچھلی کے لنگر کھول دیئے۔ اس پر یہ نعرہ خود رو پودے کی طرح اُبھر آیا:

مچھلی کھاؤ بابے دی
پرچی دیو گابے دی

مطلب یہ، کہ مچھلی بابے رحیم بخش کی کھاؤ۔ لیکن پرچی گابا کو دو۔ چنانچہ ایک ایسی لہر چلی کہ خالد لطیف گابا بہت بڑی اکثریت کے ساتھ ممبر چُن لیے گئے اور اس کا سارے برِ عظیم میں چرچا ہوا۔

۱۹۳۷ء میں ہم نے حبیبیہ ہال میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے حق میں پہلا پبلک جلسہ کیا۔ تو اُس میں خالد لطیف گابا بھی موجود تھے اور انہوں نے ایک دلپذیر تقریر فرمائی۔ میں اُن سے کبھی کبھی ملتا تھا۔ ایک دفعہ برکت علی اسلامیہ ہال میں اُنہوں نے میری صدارت میں بھی ایک جلسے سے خطاب فرمایا۔ وہ کم گو آدمی تھے۔ سنجیدہ طبیعت پائی تھی۔ اور بہت مخلص تھے یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ وہ تحریکِ پاکستان سے الگ تھلگ رہے کیونکہ وہ متحدہ ہندوستان کے قائل تھے لیکن ۱۹۷۴ء میں اُس کا یوں مداوا ہوا کہ اُنہوں نے "دبی دبی صدائیں" کے نام سے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی

جس میں مستند اعداد و شمار کی بنا پر یہ ثابت کر دیا کہ نہ ہندوستان ایک سیکولر مملکت ہے۔ نہ وہاں مسلمانوں کو برابر شہری حقوق حاصل ہیں۔ بلکہ اُن سے مسلسل بے انصافیاں اور دھاندلیاں ہو رہی ہیں۔ ستائیس سال کے عرصے میں انڈین یونین میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتی۔ اس کی ساری دردناک داستان نہایت شرح و بسط سے قلمبند فرما دی۔ یہ کتاب اصلاً بمبئی میں چھپی اور ۱۹۷۵ء میں پاکستان فاؤنڈیشن نے اس کا ایک پاکستانی ایڈیشن چھاپ دیا۔ اس کتاب نے ہندوؤں کے اس الزام کو آخری اور قطعی طور پر باطل ثابت کر دکھایا کہ وہ مسلمان ہوئے۔ تو سیاسی مقاصد کے لئے! ۱۹۷۶ء کے آغاز میں خالد لطیف گابا پاکستان آئے۔ لوگوں نے اُنہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور اُنہوں نے بھی پاکستان کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا۔

حاجی لق لق کا اصل نام ابوالعلا چشتی تھا۔ شاعر تھے۔ ادیب تھے لیکن نام پایا۔ تو مزاحیہ کالم نویسی میں۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ سالکؔ اور حسرتؔ کے بعد قیامِ پاکستان سے پہلے اگر کسی نے جان دار مزاحیہ کالم لکھے تو حاجی لق لق نے۔ انہوں نے مختلف اخباروں میں کام کیا لیکن زیادہ تر عرصہ "زمیندار" میں گزارا۔ اُن کے مزاح میں ادبی رنگ تو ناگزیر تھا کہ ایک تو وہ خود ادیب تھے، دوسرے اُس زمانے میں مزاحیہ کالم کی یہ پُرانی ریت چلی آتی تھی لیکن اس پر مستزاد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا مزاح عوام کی سمجھ سے بالا نہیں تھا۔ گویا جس چیز کو مجید لاہوری نے بھرپور انداز میں اختیار کیا۔ اس کا آغاز حاجی لق لق کے ہاتھوں ہوا۔ اُن سے میری کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی "زمیندار" کے دفتر میں۔ کبھی مجلسی تقاریب میں تھوڑی بہت خط و کتابت بھی رہی۔

حاجی لق لق نے ایک مزاحیہ ہفت روزہ بھی جاری کیا جس کا نام "لقلقہ" تھا۔ اس میں مزاحیہ مضامین، نظمیں اور کارٹون دیئے جاتے تھے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چلا کیونکہ ایک تو درم و دام کا مسئلہ تھا، دوسرے حاجی لق لق بیشتر اخبار نویسوں کی طرح محض اخبار نویس تھے، تاجر نہیں تھے۔ ساری عمر عسرت میں کٹی۔ جس کی ایک وجہ شراب نوشی بھی تھی۔ اس سلسلے میں ایک قصہ یار لوگوں میں مدتوں مشہور رہا۔ کہتے ہیں، ایک شراب خانے میں خود فراموشی کے عالم میں حاجی صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ایک روزنامہ جاری کرنا ہے۔ آؤ۔ اخراجات کا حساب کر لیں۔ جب رقم پندرہ ہزار روپے ہو گئی، تو حاجی لق لق کو غصہ آیا۔ اُنہوں نے ساتھی کو بُری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ کہ تم نے میرے پندرہ ہزار روپے برباد کر دیئے۔ اس پر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع ہوا۔

مجاہد کاظمی کہہ لیجیئے یا مجّی بھائی۔ پاکستان کی وزارتِ اطلاعات کے افسر تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ڈرامے بھی لکھتے تھے اور طرّہ یہ کہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھتے تھے اور مستقبل کا حال بتا دیتے تھے۔ خدا جانے، یہ فن اُنہوں نے کہاں سے سیکھا لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس کے لئے ہمیشہ تیار نہیں ہوتے تھے۔ اور اس کے لئے ایک خاص قسم کا موڈ درکار تھا۔ خان محمد علی خان آف ہوتی ٹرین میں ہم سفر تھے، مجاہد کاظمی انہیں نہیں جانتے تھے۔ باتیں بے تکلفی تک پہنچیں تو اُنہوں نے خان موصوف کو بتایا کہ وہ وزیر بن جائیں گے۔ چنانچہ چند مہینے بعد وہ وزارت پر فائز ہو گئے۔ جن دنوں مولانا کوثر نیازی محض خطیب اور سیاسی کارکن تھے۔ مجاہد کاظمی

نے اُن کی آنکھیں دیکھ کر کہا کہ گورز ہی سے کم عہدہ قبول نہ کریں۔ حالانکہ اُن دنوں عہدے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں لیکن اُن کا تذکرہ کیا کروں۔ کہ یہ تو اُن کی زندگی کا صرف ایک پہلو تھا۔

اُن سے میرا رابطہ بورڈ آف فلم سنسر میں ہوا۔ درمیانہ طبقے کے حجابات ملاحظہ ہوں۔ کہ ہم اپنی غربت دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ وہ فلم سنسر شو کے وقت سگریٹ کیس آگے بڑھاتے۔ میں سگریٹ اٹھاتا۔ اور پی لیتا۔ اکثر خیال آیا کہ میں بھی سگریٹ پیش کروں لیکن پھر حجاب دامن گیر ہوا۔ کہ میں وڈ بائن سگریٹ پیتا ہوں۔ وہ شاید اتنا گھٹیا سگریٹ پسند نہ فرمائیں۔ ایک دن میں نے ڈبیا سے سگریٹ نکالا اور سلگا کر پینے لگا۔ کہنے لگے یار اکیلے اکیلے پیتے ہو؟ میں نے کہا۔ اتنا گھٹیا سگریٹ ہے کیا پیش کروں؟ کہنے لگے کون سا سگریٹ ہے۔ میں نے کہا وڈ بائن۔ بولے۔ تو میں کون سا تھری کاسل سگریٹ پیتا ہوں۔ فوراً سگریٹ کیس کھولا اور کہا لو خود دیکھ لو۔ میاں! سگریٹ کیس اس لئے رکھا ہوا ہے کہ اپنی غریبی پر پردہ ڈالے رکھوں۔ چنانچہ اس کے بعد سگریٹوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اُنہیں شراب نوشی کی عادت تھی اور وہ بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ پارٹیوں میں تو اتنی پی جاتے تھے کہ بہک بھی جاتے تھے۔ لیکن گھر میں ہر شام کوئی آٹھ بجے دو پیگ باقاعدگی سے پیتے تھے۔ میں نے ایک بار پوچھا شراب پر کتنی رقم صرف ہو جاتی ہے۔ بولے۔ کوئی اعلیٰ شراب نہیں پیتا۔ اس لئے ڈھائی سو روپے ماہانہ خرچ آتا ہے۔ میں نے کہا۔ یہ بھی اسراف ہے اور ضیاعِ صحت کا ذریعہ۔ بولے۔ میرے ہاں اولاد نہیں ہے اور میری تفریح کا یہی سامان ہے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ شراب فرار کا وسیلہ بنی ہوئی ہے

اُن کی بیوی سلمیٰ بھی بہت خوش مزاج خاتون تھیں۔ افسوس مجاہد کاظمی

سرطان کے مرض سے اللہ کو پیارے ہوتے۔ تو کراچی میں۔ اور ہم اپنی بھابی سے تعزیت بھی نہ کر سکے۔ اس جوڑے میں بڑا پیار تھا۔ اور شگفتگی اور خوش مزاجی اور خوش گفتاری میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ ہم اُن کے ہاں جاتے۔ تو وہ سر پہ اُٹھا لیتے۔ وہ ہمارے ہاں آتے تو جملہ اہل خانہ ارد گرد جمع ہو جاتے۔ مجاہد کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ چنانچہ جن خاندانوں سے اُن کا رابطہ تھا وہاں کے بچے خاص طور پر اُن کے معتقد تھے۔ اس کا سبب بھی یہی تھا کہ اُن کے ہاں اولاد نہیں تھی اور وہ اپنا پیار دوسروں کے بچوں پر نچھاور کر دیتے تھے۔ مجاہد وزارتِ اطلاعات کے بہت سینئر افسر تھے لیکن حسنِ کارکردگی کے باوجود افسرانِ بالا کو زیادہ پسند نہیں تھے۔ اس لئے دنیاوی اعتبار سے وہ ایسے عہدوں پر نہ پہنچے جن کے وہ حق دار تھے۔ افسوس ۱۹۷۳ء میں انتقال کر گئے۔ اور اُن کے انتقال کے بعد میں نے وڈ بائن سگریٹ چھوڑ کر نئے سگریٹ کی عادت ڈال لی۔ خدا جانے کیوں؟

مجید لاہوری میرے دوست تھے۔ اور والد مرحوم کے نیاز مند۔ گوجرانوالہ اور لاہور کی محفلوں میں اپنے کلام سے اہلِ ذوق کو آسودہ خاطر کرتے رہے لیکن اُن کے اصل جوہر اُس وقت کھلے۔ جب پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی پہنچے اور "جنگ" کا مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اُن سے پہلے صحافتی مزاح نگاری خواص کے لئے ہوتی تھی۔ یعنی ایسے لوگوں کے لئے، جنہیں ادب میں خصوصی درک حاصل ہوتا تھا۔ مجید لاہوری ادیب تو تھے۔ لیکن اُن کا مزاح عوام کے لئے ہوتا تھا۔ وہ عامی آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی کرتے تھے اور بڑی سے بڑی شخصیت پر طنز کے نشتر چلانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مزاح کو قبولِ عام کا درجہ عطا ہوا۔ کالم نویسی کے پہلو بہ پہلو اُنہوں نے مزاحیہ شاعری میں بھی

بڑا نام پیدا کیا۔ یہ بھی عوامی نوعیت کی تھی۔ اور اس قدر سادہ تھی کہ عام خواندہ لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ مزاحیہ شاعری کا مجموعہ "کانِ نمک" کے نام سے موجود ہے۔ اس سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر، مستند ہے میرا فرمایا ہوا

چیختے ہیں مفلس و نادار آٹا چاہیئے
لکھ رہے ہیں ملک کے اخبار آٹا چاہیئے
مُرغیاں کھا کر گزارہ آپ کا ہو جائے گا
ہم غریبوں کو تو اے سرکار آٹا چاہیئے

کیا ہوا جمہور کو روٹی اگر ملتی نہیں
تو ڈنر اور لنچ اُڑا جمہوریت کے نام پر

ستارہ ڈانس میں لاکھوں روپے کما لائی
جنابِ شیخ کو چندے میں ایک "آنہ" ملا

چڑھ گیا بازار میں کپڑے کا بھاؤ
بے کفن مُردہ دبانا ہی پڑا

زباں پہ تو ہے نام جمہوریت کا
چھُری سیفٹی ایکٹ کی چل رہی ہے

ہائے کیا صورتِ حالات نظر آتی ہے
بزمِ جاناں بھی حوالات نظر آتی ہے
جن پہ تھی چشمِ عنایات مری جان کبھی
ان پہ اب چشمِ عتابات نظر آتی ہے

افسر بنے ہوئے ہیں، لیڈر بنے ہوئے ہیں
جو کھیلتے تھے گُلّی ڈنڈا تری گلی میں

چینی کی طرح تُو تو پہلو سے ہوا غائب
اے دل ترا مدت سے پیغام نہیں ملتا

کالم نویسی اور شاعری کے ساتھ ساتھ مجید لاہوری نے مزاحیہ صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھ دیا۔ اور "نمکدان" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا۔ کسی زمانے میں، بلکہ پچھلی صدی میں، پنچ اخباروں کا بڑا غلغلہ تھا۔ اور "اودھ پنچ" نے تو بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے بعد یہ صنف عنقا ہو گئی۔ پاکستان بننے سے چند سال پہلے چراغ حسن حسرت نے لاہور سے "شیرازہ" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ جو پنچ اخباروں سے بالکل مختلف تھا کیونکہ اس میں پھکڑ بازی نام کو نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال یہ اخبار پورے کا پورا مزاحیہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں سنجیدہ علمی مضامین بھی چھپتے تھے۔ مجید لاہوری کا "نمکدان" اس سے مختلف تھا۔ ایک تو یہ کاملاً مزاحیہ اخبار تھا۔ دوسرے، اس میں اعلیٰ درجے کے کارٹون بھی چھپتے تھے۔ مزاحیہ شاعری اور مزاحیہ کالم نویسی بھی ہوتی

تھی۔ مضامین بھی سب کے سب مزاحیہ ہوتے تھے۔ جتنی دیر مجید لاہوری زندہ رہے "نمک دان" کسی نہ کسی طرح نکلتا رہا۔ اُن کے بعد جناب شفیع عقیل نے اسے جاری رکھنے کی کوشش فرمائی لیکن ناکام رہے۔

والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالکؔ نے مجید لاہوری کے بارے میں چند سطور میں گویا کوزے میں دریا بند کر دیا۔ لکھتے ہیں: "اُن کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کے مختلف عوامل تھے۔ ایک اُن کی دلکش اور دلفریب شخصیت۔ دوم اُن کا خلوص اور نیک نیتی، سوم اُن کے بیان کی سادگی۔ چہارم غریب طبقوں سے اُن کی مخلصانہ ہمدردی۔ پنجم دولت مند اور ذی اقتدار طبقوں پر اُن کی بے پناہ طنزیہ تنقید"

مسٹر گزٹ اصل میں ایک ہفت روزہ کا نام تھا جو نصف صدی پہلے لاہور کے علاقہ ہیرا منڈی سے نکلتا تھا۔ ایڈیٹر کا نام علی بخش تھا لیکن لوگ انہیں مسٹر گزٹ کے نام سے پکارتے تھے۔ نپلے دُبلے، سفید مونچھیں، سفید بال۔ ایک دفعہ والد مرحوم کے ساتھ بادشاہی مسجد میں نمازِ عید ادا کرنے کے بعد لوٹ رہا تھا کہ علی بخش مل گئے۔ والد نے اُن سے تعارف کرایا۔ یاد نہیں کہ کیا باتیں ہوئیں البتہ "مسٹر گزٹ" ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ چھوٹے سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھا اور عام طور پر اس میں ڈپٹی کمشنر بہادر، اسسٹنٹ کمشنر بہادر، نائب تحصیلدار بہادر اور تحصیلدار بہادر اور دوسرے افسر بہادر لوگوں کی شان میں مدحیہ شذرات درج ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں ہر سرکاری افسر کے عہدے کے ساتھ بہادر کا لفظ ضرور چسپاں ہوتا تھا تاکہ اُن کا رعب اور دبدبہ قائم رہے۔ ایک عرصہ بعد والد نے بتایا کہ علی بخش افسر حضرات سے ایک

ایک دو دو روپے نذرانے کے طور پر وصول کر لیتے تھے۔ اور اُن کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ یہ بھی تھا کہ کسی طوائف کے کوٹھے پر پہنچ جاتے۔ طوائف خوش ہوتی کہ صحافی نے قدم رنجہ فرمایا ہے اور ازبسکہ اُن کا رابطہ بڑے افسروں سے تھا اس لئے طوائف اُن کی خوب آؤ بھگت کرتی، پان کھلاتی۔ دو بول ہنسی کے ہوتے اور اس کے بعد ایک آدھ روپیہ نذر کر دیتی۔ آدابِ محفل کی پابندی تو پرانی طوائفوں پر ختم تھی۔ اس لئے علی بخش خوش خوش لوٹتے۔ کہ جنتِ نگاہ، فردوسِ گوش اور قوت لایموت کا سامان بیک وقت فراہم ہو جاتا۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام خدا جھوٹ نہ بلوائے، تو مسٹر گرنٹ کے باقیات اب بھی موجود ہیں لیکن ایسی باتوں کا تذکرہ خطرناک ہے۔

افسوس! بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

مشتاق سنیاسی میرے ماموں اور خسر تھے۔ اصل نام عبداللطیف اور تخلص مشتاق تھا۔ سنیاسی اس لئے کہلاتے تھے کہ بعض نادر جڑی بوٹیاں حاصل کر کے جنسی امراض کے علاج کی دوائیاں بنائیں جو موثر ثابت ہوئیں اور سنیاسی شفاخانہ چل نکلا۔ یُوں بھی انہیں تصوف سے بہت شغف تھا۔ عنفوانِ شباب میں ہم زاد کو قابو کرنے کی سعی میں مصروف رہے۔ پھر پیر سید جماعت علی شاہ کے مُرید بنے اور حُسنِ ارادت میں اس کمال کو پہنچے کہ مُرشد انہیں خلافت کا اعزاز دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بہر حال بنتالیس سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مشتاق مرحوم شاعر بھی تھے۔ بٹالے میں ایک ادبی حلقہ بنا رکھا تھا جہاں اپنا کلام سُناتے۔ دوسروں کا سُنتے۔ حضرتِ رسا رام پوری کے شاگرد تھے اور

والدِ مرحوم کو بھی انہی سے شرفِ تلمذّ دلایا۔ مشتاق مرحوم کا کلام ناپید ہے۔ لیکن نصف صدی سے زیادہ پرانے کسی رسالے کا ایک پھٹا ہوا ورق ملا۔ تو اس میں یہ اشعار "حضرت مولانا مشتاق صاحب بٹالوی یادگارِ حضرتِ رسا مرحوم" سے منسوب تھے :

آرزو یہ ہے کہ ہم کوچہ جاناں میں رہیں
چھوڑ کر ہند کو یثرب کے گلستاں میں رہیں
اپنے گھر میں رہیں ہم یا کہ بیاباں میں رہیں
یا محمدؐ کہاں جا کر شبِ ہجراں میں رہیں
زندگی میں بھی رہیں حاضرِ دربارِ رسُولؐ
بعد مرنے کے بھی ہم کوچہ جاناں میں رہیں
نقشۂ احمدِ مرسل مرے دل میں کھنچ جائے
بن کے پتلی وہ مرے دیدۂ حیراں میں رہیں
ہجرِ احمدؐ میں کچھ ایسی ہوئی وحشت ہم کو
یہی جی چاہتا ہے جا کے بیاباں میں رہیں
آپ وہ ہیں کہ بہت آپ کو مومن سے ہے اُنس
آپ وہ ہیں کہ دلِ صاحبِ ایماں میں رہیں
شوقِ دیدارِ محمدؐ ہو زیادہ ہر دم
اسی حسرت میں رہیں ہم اسی ارماں میں رہیں
آپ کا کلمہ پڑھے جسم کا ہر بال حضورؐ
آپ جاں بن کے ہمارے تنِ بےجاں میں رہیں
مرضِ عشقِ محمدؐ نہ کمی پر ہو کبھی
چارہ گر جتنے ہیں سب میرے ہی درماں میں رہیں

بات تقدیر کی ہے قافلہ والو، ورنہ
ہم نہ جائیں کبھی اور جانے کے ساماں ہیں رہیں

ممتاز حسن اے ڈی اظہر اور حمید احمد خان کے ہم جماعت تھے۔ یہ تینوں گہرے دوست تھے اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ تینوں کا انتقال اُوپر تلے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہوا۔ اے ڈی اظہر سے میرا یارانہ تھا۔ حمید احمد خان میرے اُستاد تھے۔ اُن سے گہرے تعلقات تو رہے لیکن حُملۂ حجابات کے ساتھ۔ ممتاز حسن سے شناسائی خاصی دیر کے بعد ہوئی لیکن مختصر تعلق کے باوجود اُنہوں نے میرا دل موہ لیا۔ اور میں کون ہوں، ممتاز حسن نے تو ایک دنیا کا دل موہ رکھا تھا۔ کیا ادیب، کیا شاعر، کیا محقق، کیا معلّم۔ سبھی اُن کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ علمی ادارے اُن کے شرمندۂ احسان تھے اور کراچی کی ادبی محفلیں اُن کے دم قدم سے آباد تھیں۔ لاہور آتے تو یہاں بھی اہلِ علم اُن پر ٹوٹ پڑتے۔ اور پیاس تھی کہ بجھنے میں نہیں آتی تھی۔ اللہ اکبر۔ کتنی دلربا، کتنی پُرکشش شخصیت تھی اُن کی؟

اُن سے اوّلین رابطہ تب ہوا، جب اُنہوں نے نیشنل بنک میں بلا بھیجا۔ ڈپٹی مینجنگ ڈائرکٹر ادریس احمد مینائی بھی اُن کے پاس بیٹھے تھے جن سے مجھے پہلے ہی سے شرفِ نیازمندی حاصل تھا۔ ممتاز حسن صاحب نے کہا کہ نیشنل بنک آف پاکستان نے کراچی میں ایک کتب خانہ قائم کر رکھا ہے جس میں نوادر بھی اکٹھے کیے جا رہے ہیں، میں چاہتا ہوں "انقلاب" کے فائل اس میں رکھے جائیں۔ مہر صاحب نے اپنا سیٹ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کو دے رکھا ہے جس سے لاہور کے محقق استفادہ کرتے ہیں۔ آخر کراچی کے محققین نے

کیا قصور کیا ہے کہ اُنہیں ان فائلوں تک رسائی نہ ہو۔ میں جھٹ مان گیا چنانچہ معاملات طے ہو گئے اور "انقلاب" کے بائیس سالہ فائلوں کا ایک سیٹ نیشنل بنک کے حوالے ہو گیا۔ اُنہوں نے نہ صرف نئے سرے سے جلدیں بندھوائیں۔ بلکہ ہر صفحے کو کیمیائی عمل سے اس قابل بنا دیا کہ امتدادِ زمانہ اثر انداز نہ ہو سکے اور محقق بے کھٹکے فائلوں سے فیض پا سکیں۔

پروفیسر حمید احمد خان کے انتقال کے اگلے دن میں ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر ریڈیو پاکستان پہنچا۔ جہاں یوم پاکستان (۲۳ مارچ) کے سلسلے میں تحریکِ پاکستان پہ ایک مذاکرہ کی ریکارڈنگ ہونی تھی۔ اس میں کراچی سے ممتاز حسن صاحب کو، لاہور سے مجھے اور پنڈی سے ایک اور بزرگ کو (نام بھول گیا) بذریعہ ٹیلی فون حصہ لینا تھا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ لاہور اور کراچی کے درمیان تو ٹیلی فون کا رابطہ قائم ہو گیا لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے پنڈی سے رابطے میں کوئی آدھ گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔ اس دوران میں ممتاز حسن سے میری گفتگو ہوتی رہی۔ وہ پروفیسر حمید احمد خان کی وفات سے بہت غمگین تھے۔ مجھ سے پوچھتے رہے کہ وفات کیسے ہوئی کیونکہ مرضِ قلب کے حملے سے ایک گھنٹہ پہلے اُن سے میری گفتگو رہی تھی۔ ممتاز حسن کہنے لگے بھئی ہم لوگوں کا چل چلاؤ ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کا وجود باعثِ برکت ہے ایسی باتیں نہ کیجئے گا۔ پھر میرا حال پوچھتے رہے۔ علمی مشاغل کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ یہی اُن سے میری آخری ملاقات تھی۔

اس سے کوئی دو سال پہلے اُنہوں نے ایک ملاقات میں فرمائش کی کہ میں نے اقبال پر جتنے مقالات اُردو اور انگریزی زبان میں لکھے اُن کے تراشے بھیج دوں تاکہ وہ ان کی عکسی نقول نیشنل بنک کی لائبریری میں محفوظ

کرلیں۔ میں نے تراشے بھیج دیئے اور اس انتظار میں تھا کہ وہ خود ہی لوٹا دیں گے۔ لیکن تراشے نہ آئے۔ آخر میں نے خط کے ذریعے یاد دہانی کرائی۔ موت سے دس دن پہلے اُن کا جواب آیا۔ اس میں معذرت کی تھی اور لکھا تھا کہ نئے مکان میں آنے سے کاغذات درہم برہم ہو چکے ہیں۔ اب ترتیب کر رہا ہوں۔ جونہی تراشے ملے۔ بھیج دوں گا۔ لیکن دس دن بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ممتاز حسن سول سروس میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ آزادی سے پہلے اور فوراً بعد کے نازک مرحلوں میں اُنھوں نے پاکستان کی جو خدمات سرانجام دیں۔ جاننے والے اُن سے خوب واقف ہیں۔ سول سروس کی مصروفیات میں علم و ادب کی خدمت کے لئے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے کچھ افسروں نے وقت نکالا اور کام کیا۔ ممتاز حسن بھی انہی میں شامل تھے اور ریٹائر ہونے کے بعد تو اُن کی تمام ترمساعی علمی اداروں کے نشوونما اور ارتقا پر مرتکز رہیں۔ اقبال اکیڈمی (کراچی) اور ترقی اُردو بورڈ (کراچی) کے تو وہی بانی مبانی تھے۔ بہت سی کتابیں لکھیں، بہت سی لکھوائیں۔ اقبالیات میں تخصّص رکھتے تھے۔ ان جیسے اقبال شناس کم ملتے ہیں۔ لیکن موت کا کیا کیجئے کا کہ یہ سب پر آتی ہے۔ بہرحال ممتاز حسن نے علم و ادب کی جو قندیلیں روشن کیں وہ اُن کی یاد کو ہمیشہ قائم رکھیں گی۔

شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی سے ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہ میں پندرہ سال کا تھا جب اُن کا انتقال ہو گیا۔ بہرحال میں نے اُنھیں دو چار بار دیکھا ضرور ہے۔ سر پر لُنگی، تن پر اچکن، اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتی پہنتے

تھے ۔ رنگ سفید تھا اور اس پر سفید اور دراز ریش عجیب بہار دیتی تھی ۱۸۶۰ء
میں پیدا ہوئے ۔ دینی علوم میں دسترس حاصل کی اور وہ بھی اُس زمانے میں،
جب مولوی محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے نگران اور سرپرست تھے ۔
شیخ الہند محمود الحسن (اسیرِ مالٹا) اُن کے ہم مکتب بھی تھے اور دوست بھی۔ سر سید احمد
خان سے اُن کے گہرے مراسم تھے ۔ خط و کتابت تو چلتی ہی تھی ۔ لیکن کبھی کبھی
سر سید اُنہیں اپنے ہاں بُلا لیتے تھے اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ کئی کئی دن چلتا
تھا ۔ سر سید احمد خان پر اخبارات میں یورش ہوتی تو لبسا اوقات مولوی ممتاز علی
اُن کے حق میں سینہ سپر ہو جاتے تھے ۔ اس سے بھی دونوں کے درمیان قرب
بڑھا ۔ مولانا محمد حسین آزاد سے اُن کا اتنا یارانہ تھا کہ عزیزوں کا سا تعلق رکھا
بلکہ ایک موقع پر مولوی ممتاز علی زیادہ بیمار ہوئے تو آزاد نے انہی کے گھر
بسیرا کر لیا اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔

مولوی سید ممتاز علی کی زندگی کا بیشتر حصّہ خدمتِ نسواں میں بسر ہُوا ۔ اس
کے آغاز کی کہانی دلچسپ ہے ۔ سر سید احمد خان تعلیمِ نسواں کے حامی نہیں تھے
بلکہ حقوقِ نسواں کی بحث کو بھی پسند نہیں کرتے تھے ۔ ادھر مولوی صاحب نے
حقوقِ نسواں پر ایک کتاب لکھ ڈالی ۔ اور اس کا مسودہ سر سید کی خدمت میں پیش
کر دیا ۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مولوی صاحب کی زبانی سنیئے: "جس وقت میں
نے یہ کتاب سر سید کو دکھائی ۔ تو ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی تیسرا نہ تھا ۔
اندازاً گیارہ بجے کا وقت تھا ۔ سب لوگ اپنے اپنے دفتر کو چلے گئے تھے
میں نے قصداً یہ وقت اس لئے پسند کیا تھا ۔ کہ اگر سید صاحب غصّے
بھی ہوں ۔ تو کسی دوسرے آدمی کی موجودگی میں تو نہ ہوں ۔ سر سید نے اس
کتاب کو کھول کر کہیں سے پڑھا اور چیں بہ جبیں ہوئے ۔ پھر کسی دوسری جگہ

سے کھول کر پڑھا۔ تو چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور جب آپ نے اس کا کوئی تیسرا مقام پڑھا۔ تو ہاتھ کانپنے لگے۔ آخر ضبط نہ کر سکے۔ آپ نے کتاب کو بند کر کے لمبائی میں پھاڑ کر دو ٹکڑے کر ڈالے۔ اور پھر ایک ٹکڑے کو دوسرے پر رکھ کر اس کے پھر دو ٹکڑے کر دیئے اور آپ نہایت غضب آلود نگاہیں دیوار پر جمائے ایک آدھ منٹ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی بالکل بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور ڈر رہا تھا کہ میری کوئی حرکت ان کی توجہ کو ادھر مائل نہ کر دے۔ خدا کا شکر کہ خانساماں آ گیا اور اطلاع دی کہ میز پر کھانا حاضر ہے۔ سر سید تو اُٹھ کر غسل خانے کی طرف چل دیئے اور میں ردّی کی ٹوکری میں سے حقوقِ نسواں کے پھٹے ہوئے پُرزے اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بوجہ رنج کھانے میں بھی شریک نہ ہوا۔"

سر سیّد کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں مولوی سید ممتاز علی نے "تہذیبِ نسواں" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جس کی ترتیب اُن کی دوسری اہلیہ محمدی بیگم کے سپرد تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے اپنا پریس لگایا۔ دارالاشاعت پنجاب کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے "حقوقِ نسواں" چھاپی۔ اور اس کے بعد مطبوعات کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ زمانہ قدامت پسندی کا تھا اس لئے بے شمار لوگوں نے "تہذیبِ نسواں" پر ناک بھوں چڑھائی بلکہ گالیوں کا بھی طومار شروع کر دیا۔ بہرحال مولوی صاحب کا حوصلہ نہ ٹوٹا۔ اور اُنہوں نے اپنا مفید کام جاری رکھا۔ "تہذیبِ نسواں" نصف صدی سے زیادہ عرصہ جاری رہا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی بچوں کا ایک رسالہ "پھول" جاری کر دیا اور اسے بھی نصف صدی کی عمر میسّر آئی۔ دارالاشاعت پنجاب نے دو ہی چیزوں میں تخصص حاصل کیا۔ ایک عورتوں کے ادب، دوسرے بچوں کے ادب کی

اشاعت میں۔

مولوی صاحب نے "حقوق نسواں" کے بعد "زاد المعاد" لکھی "رد الملاحدہ" لکھی۔ اور جن دنوں والدِ مرحوم مولانا سالک اُن کے ادبی معادن اور "پھول" اور "تہذیب نسواں" کے مدیر مقرر ہوتے، تو "تذکرۃ الانبیا" "شیخ حسن" اور اردو ریڈریں وغیرہ لکھیں لیکن ان کا سب سے بڑا علمی اور دینی کارنامہ "تفصیل البیان" ہے جس پر کئی سال صرف ہوئے۔ یہ آیاتِ قرآنی کی ایک مبسوط فہرست ہے جو معانی و مطالب کے اعتبار سے مرتب کی تھی۔ آپ جس موضوع پر قرآنی آیات معلوم کرنا چاہیں، وہ اس کتاب میں یک جا مل جائیں گی۔ اس کتاب کی آخری جلد کو قریب قریب مکمل کر چکے تھے کہ معبودِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آگیا۔ لیکن اُن کے علمی کام جاری رہے جس کا سہرا اُن کے فرزند سید امتیاز علی تاج کے سر تھا۔

منظور قادر نے اپنے نامور باپ سر شیخ عبدالقادر کی بہت سی خوبیاں وراثت میں پائی تھیں۔ نہایت اعلیٰ پائے کے وکیل تھے اور بڑے بڑے مقدمات میں اُن کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ علم و ادب کے رسیا تھے اور علمی موضوعات پر انگریزی اور اُردو زبان میں خطابت میں کمال رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجے کی زبان، بچے تلے الفاظ، سلاستِ بیان، سنجیدگی، استدلال۔۔۔ یہ تھے وہ عناصر جن سے اُن کی خطابت عبارت تھی۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کی نظامت قائم ہوئی تو اُنہیں وزیرِ خارجہ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اور اس حیثیت سے اُنھوں نے بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی تو خطابت کے جوہر خوب کھلے۔ کہتے ہیں ۱۹۶۲ء کے آئین کی ترتیب میں اُن کا بہت ہاتھ تھا لیکن اتنی بات

ظاہر ہے کہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں اتنی خرابی نہیں تھی جتنی اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں پیدا ہوئی۔

منظور قادر لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے تو میں نے انہیں مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ اُنہوں نے ملاقات کی خواہش فرمائی تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور بعض علمی معاملات پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اس کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخری ملاقات اُن کی موت سے چند ہفتے پہلے اس وقت ہوئی، جب وہ لاہور میوزیم کی اس تقریب میں محض ایک سامع کی حیثیت سے شامل ہوئے جس میں سید امتیاز علی تاجؔ مرحوم کی کتب پیش کی گئیں۔ میں نے بیماری کا حال پوچھا تو بتانے لگے کہ کبھی کبھی تنفّس کی تکلیف ہوتی ہے اور خون آ جاتا ہے تو تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔

وقت کی پابندی اور وعدے کے پاس کا یہ عالم تھا کہ تنفّس کی شدید تکلیف کے دوران میں "شامِ ہمدرد" کی ایک تقریب سے خطاب کرنے آ پہنچے۔ بیٹھ کر خطاب فرمایا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ تکلیف بہت ہے اس کے فوراً بعد ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ اُنہیں مشورہ دیا گیا کہ تقریب میں شامل نہ ہوں، لیکن اُنہوں نے وعدے کی تکمیل پر اصرار فرمایا۔

محمد اسماعیل پانی پتی بہت پُرانے لکھنے والے تھے۔ اُن کی مضمون نگاری میری ولادت سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ یہ اس طرح معلوم ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "البلاغ" کے فائل کی ورق گردانی کی تو اس میں شیخ محمد اسماعیل صاحب کے مقالے بھی نظر آئے۔ بلا کے محنتی تھے۔ تاریخِ صحافت پر بھی بہت سے مضامین لکھے۔ کچھ کتابیں بھی لکھیں اور کچھ مرتب کیں۔ اُن کا یہ

کارنامہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ سر سید کے مکاتیب بھی مرتب کر لئے۔ اور کوئی پندرہ سولہ جلدوں میں سر سید کے تمام مقالات موضوعات کے اعتبار سے مرتب کئے۔ اور یہ صورت پیدا کر دی کہ سر سید پر تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ ضروری نہ رہا کہ "تہذیب الاخلاق" اور "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" کے فائلوں کی ورق گردانی کریں۔ ویسے بھی ان اخباروں کے مکمل فائل پاکستان میں موجود نہیں ہیں۔ شیخ صاحب سے میرا دیرینہ تعلق تھا۔ وہ میرے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ ایک بار اُنہوں نے کچھ ایسی گفت گو کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اب اتنی محنت نہیں کر سکتے۔ کہ قوُت لایموت حاصل ہو سکے۔ جوان بیٹے کی موت نے رہی سہی ہمّت بھی توڑ رکھی تھی۔ میں نے اُنہیں بتائے بغیر جناب قدرت اللہ شہاب کے نام خط لکھا کہ ایسے بزرگ کے لئے اگر حکومت کوئی وظیفہ مقرر کر دے تو یہ ایک کارِ ثواب ہوگا۔ شہاب صاحب نے چند دنوں کے اندر اندر ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر کے مجھے اطلاع دی۔ میں شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنہیں بتایا۔ اور مجھے خوشی ہوئی کہ وظیفے کی ادائیگی بھی جلد شروع ہو گئی۔ اس نیک کام کی وجہ سے اُن کے ساتھ رابطہ بڑھ گیا۔

چودھری محمد افضل پنجابی کے مشہور و معروف شاعر منشی مولا بخش کشتہ کے فرزند تھے اس لئے پنجابی ادب سے دلچسپی وراثت میں پائی۔ لیکن انجمن سازی کی جگہ ٹھوس کام کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ٹمپل روڈ پر پنجابی کالج کا آغاز کیا۔ جہاں لڑکیاں لڑکے پنجابی ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل کی تیاری کے لئے آنے لگے۔ چودھری محمد افضل کی ہمّت ملاحظہ ہو کہ اکیلے تدریس کے فرائض

انجام دیتے تھے۔ کبھی کبھی دوسروں کی مدد بھی لے لیتے تھے لیکن اصل بوجھ خود ہی برداشت کرتے تھے۔ کالج چل نکلا۔ تو پنجابی مطبوعات کا سلسلہ چلایا۔ درسی کتابیں بھی چھاپتے تھے اور عام کتابیں بھی۔ کالج کی وجہ سے کتابوں کی بنی بنائی منڈی مل گئی۔ اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اور "پنج دریا" کے نام سے پنجابی زبان کا ایک ماہ نامہ جاری کر دیا۔ اور اس کی ترتیب میں یہ خیال رکھا کہ ادبی رجحانات کا بھی غمّاز ہو۔ نئے اور پرانے دونوں قسم کے ادیبوں کی نگارشات کا حامل ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ طلبا اور طالبات کے لئے بھی مفید ہو۔ اس جوش میں آکر اُنہوں نے ایک بار میری ترتیب دی ہوئی کتاب "پنجابی ادب تے سالک" (مطبوعہ پنجابی اکیڈمی) پوری کی پوری "پنج دریا" کے ایک خاص نمبر میں چھاپ لی میں نے رائٹرز گلڈ میں شکایت پیش کر دی۔ عبدالمجید بھٹی صاحب تحقیقات پر مامور ہوئے۔ اُنہوں نے چودھری صاحب پر کوئی اڑھائی سو روپے تاوان ڈال دیا لیکن میں نے وہ رقم وصول نہ کی۔ کیونکہ شکایت سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ آئندہ کے لئے ایسی چیز کا سدِّباب ہو جائے اور اُن کے ساتھ تعلقات حسبِ سابق خوشگوار رہے۔ چودھری صاحب کے انتقال کے بعد یہ کاروبار اُن کے بیٹوں نے سنبھال لیا اور اس طرح اس خاندان کی تیسری نسل کی سرگرمیاں بھی پنجابی زبان و ادب کی پرورش پر مرکوز ہو گئیں

شیخ محمد اکرام سے پُرانی یاد اللہ تھی۔ پہلے غائبانہ، پھر بالمشافہ۔ ۱۹۳۶ء میں اُنہوں نے "غالب نامہ" شائع کیا۔ یہ اُن کی پہلی تالیف تھی۔ کتاب کے پہلے حصّے میں غالبؔ کے مفصّل سوانح درج تھے۔ دوسرے حصّے میں

کلامِ غالب کو تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کیا گیا۔ اُس زمانے میں مَیں کالج میں پڑھتا تھا۔ استاذی گرامی قدر پروفیسر حمید احمد خان کی نگرانی میں اس کتاب پر ایک مفصّل تنقیدی مقالہ لکھا جس میں جوانی دیوانی کے جوش میں آکر کچھ چوٹیں بھی کر دیں۔ ایک چوٹ سے مولوی عبدالحق نے بھی مزہ لے لیا۔ وہ سول سروس کے افسر تھے۔ مختلف مناصب پر فائز رہے۔ پاکستان بنا۔ تو مرکزی حکومت میں ناظمِ اطلاعات و نشریات مقرر ہوئے۔ اُن کی دعوت پر میں نے اُن کی انگریزی تالیف "پاکستان کا ثقافتی ورثہ" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) کے لئے پنجابی ادب پر ایک باب لکھا۔ دو تین سال بعد مری میں ہم دونوں کا ٹاکرا ہوا۔ میں نے اُنہیں مری کلب ہوٹل میں عصرانے پہ مدعو کیا۔ خوب گپ ہوتی رہی۔ اُنہوں نے ایک ملازمت کی پیش کش فرمائی۔ جو میں نے قبول نہ کی۔ اصل میں مَیں فری لانس صحافی تھا اور پابند زندگی کا قائل نہیں تھا۔ اُن کی زندگی کے آخری پچیس سالوں میں کم از کم درجن بھر مفصل نشستیں ہوئیں جن میں علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ ان کی کتابیں معلومات کا خزینہ ہیں "غالب نامہ" تو درمیانہ درجے کی تالیف تھی۔ "شبلی نامہ" بہت خیال افروز تھی۔ "آبِ کوثر" "رودِ کوثر" اور "موجِ کوثر" میں برِعظیم کے مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا ایسا تذکرہ موجود ہے جو آج کے نوجوانوں کے لئے خصوصی مطالعے کی چیز ہے

شیخ محمد اکرام سے راہ درسم تو تھی۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جب وہ کوئی لکھنے کا کام میرے سُپرد کرنا چاہتے۔ بات آگے نہیں بڑھتی تھی۔ جب "پنجابی ادب"، پر اُنہوں نے باب لکھوایا۔ تو مسودہ دیکھنے کے بعد ایک خط میں فرمائش پیش کی کہ پنجابی ادب پر اس انداز میں لکھا جائے کہ اس کے ڈانڈے پشتو، سندھی، بلوچی بلکہ بنگالی ادب سے بھی مل جائیں۔ میں نے جواب

دیا۔ کہ آپ کا محرک جذبہ قابل تحسین ہے۔ لیکن میں "آرڈر" کے مطابق چیزیں لکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لئے جو لکھ دیا، لکھ دیا۔ اب اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا اس کے بعد تین چار ایسے مواقع آئے کہ اُنہوں نے مجھ سے کچھ لکھوانا چاہا۔ لیکن وہ علمی مسائل میں بھی "لائن" دیتے تھے اور میرا موقف یہ تھا کہ میں بنیادی طور پہ محقق ہوں کسی مسئلے یا موضوع پر لکھتا ہوں۔ تو پہلے مستند حقائق جمع کرتا ہوں پھر غیر جانبداری کے ساتھ اُنہیں ترتیب دیتا ہوں اور جو تصویر اُبھرے وہ پیش کر دیتا ہوں۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ پہلے ایک تصویر ذہن میں رکھ لوں اور اس کے بعد حقائق کو اس تصویر کے سانچے میں ڈھالتا چلا جاؤں۔ چنانچہ کوئی بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ FUSSY قسم کے آدمی ہیں اور میں نے کوئی تحریر اپنے ذمے لی تو مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ ویسے شیخ صاحب کے اہل علم ہونے میں کوئی کلام نہیں اور یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ سول سروس کی مصروفیات کے ہجوم میں وہ اتنا وقت نکالنے میں کامیاب ہوئے کہ چند مفید کتابیں لکھ ڈالیں۔

مولانا محمد اکرم خان مسلم بنگال کے سب سے پُرانے، سب سے مخلص رہنما تھے۔ ۱۹۶۸ء میں سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ برعظیم کی اسلامی صحافت کی تاریخ میں اُنہیں ایسا مقام حاصل تھا۔ جو اس اعتبار سے بے نظیر ہے کہ وہ محمد علی، ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کے بھی ہم عصر تھے اور الطاف حسین اور حمید نظامی کے بھی۔ برعظیم کے مسلمانوں کی پوری سیاسی جدوجہد میں شامل رہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور تا دمِ مرگ شامل رہے۔ اس دوران میں مسلمانوں کی جو تحریک کُل ہند سطح پر اُٹھی۔ وہ اس کے

ہراول دستے میں شامل تھے ۔مسلم لیگ میں بڑے بڑے مناصب پر فائز رہے بنگال صوبہ مسلم لیگ کی صدارت ہمیشہ اُنھی کے سپرد رہی ۔کیونکہ وہ سب سے سینئر اور سب سے زیادہ واجب الاحترام سمجھے جاتے تھے ۔مرکزی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے اہم رکن رہے ۔پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان میں جو لسانی جھگڑا اُٹھا ۔اُس سے بالا رہے ۔کیونکہ اُن کا نقطۂ نگاہ قومی تھا ۔صوبائی نہیں تھا ۔

سیاست کے ساتھ ساتھ صحافت سے عمر بھر وابستہ رہے ۔ ۱۹۰۵ء میں کلکتے سے "محمدی" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا ۔جو اب بھی قائم ہے ۱۹۳۶ء میں دو روزنامے جاری کئے ۔اُردو میں "زمانہ" اور بنگلہ میں "آزاد" "زمانہ" بند ہو گیا ۔لیکن "آزاد" جاری رہا ۔پاکستان بنا تو اسے ڈھاکہ لے آئے لسانی جھگڑے کے دوران میں یہ اخبار عوامی غضب کا نشانہ بنا ۔لیکن مولانا نے اپنی پالیسی سے سرِمُو انحراف نہ کیا ۔اور وہ بدستور قومی نقطۂ نگاہ کی نشرواشاعت کرتے رہے ۔اُن کے انتقال کے بعد بھی "آزاد" جاری رہا ۔لیکن "بنگلہ دیش" بنا تو اس کے ساتھ ہی "آزاد" کا چراغ بھی گُل ہو گیا ۔

ڈاکٹر محمد عالم تحریکِ خلافت کی تخلیق تھے ۔خلافت کمیٹی اور کانگرس میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے ۔لیکن جب مسلمان من حیث القوم کانگرس سے الگ ہو گئے تو ڈاکٹر عالم بدستور کانگرس کے دامن میں پناہ لیتے رہے ۔ اُنہوں نے نہرو رپورٹ کی حمایت فرمائی اور مسلمانوں میں غیر مقبول ہو گئے ۔گاندھی جی نے نمک بنانے کی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی ۔تو اس میں حصّہ لیتے رہے اس کے بعد کانگرس سے روپیہ لے کر انٹی کمیونل لیگ بنائی اور "تریاق" کے

نام سے ایک روزنامہ جاری کر لیا۔ پیسہ ختم ہوا۔ تو نہ لیگ باقی رہی۔ نہ "تریاق"
مولانا ظفر علی خان نے تحریکِ مسجد شہید گنج شروع کی۔ تو اس میں شامل ہو گئے
اور اپنا وقار کسی قدر بحال کر لیا۔ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں مجلسِ اتحادِ ملت
کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ تو فوراً یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس پر
مولانا ظفر علی خان نے انہیں ڈاکٹر لوٹا کا خطاب دیا۔ آپ جانتے ہیں۔ لوٹا
بے پیندے کا ہو۔ تو کبھی اِدھر کو جھکتا ہے کبھی اُدھر کو۔ یہ خطاب چل نکلا۔ ڈاکٹر
عالم جدھر جاتے تھے۔ ان کے استقبال کو لوٹے تیار رہتے تھے۔ بس یوں سمجھ
لیجئے کہ ۱۹۶۸ء میں جو حالت چمچے کی تھی۔ وہ اُن دنوں لوٹے کی تھی۔ اسی خطاب
نے ڈاکٹر عالم کی سیاسی زندگی ختم کر کے رکھ دی۔ اور آخری دور میں انہوں نے
ملک خضر حیات کے کہنے پر مولوی ابراہیم علی چشتی کی تحریکِ رفاقت کی باتنخواہ
مشیری قبول کر لی۔

ڈاکٹر عالم کی زندگی کے آخری پر سکون دور میں میری اُن سے یاد اللہ
ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں سرکاری ہفت روزہ "ہمارا پنجاب" میں کام کرتا تھا
اور میرے دوست سجاد حیدر ریڈیو کے دیہاتی پروگرام کے انچارج تھے۔ ہم
دونوں کے افسر نے ہدایت جاری کی کہ ڈاکٹر عالم سے مل کر معلوم کریں کہ "ہمارا
پنجاب" اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام میں تحریکِ رفاقت کا چرچا کیسے ہو سکتا ہے
بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ڈاکٹر عالم نے سوچا کہ ہم دونوں سے اپنی پبلسٹی کرائیں
چنانچہ انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اور ہر دس منٹ کے بعد کہتے۔ کہ
تمہارے مفادات میرے ہاتھ میں بالکل محفوظ ہیں۔ پہلے تو ہم پریشان ہوئے
کہ ہمارے مفادات کون سے ہیں اور اُن کے ہاتھ میں کیسے محفوظ ہیں؟ لیکن
جب انہوں نے یہی فقرہ بار بار دہرایا تو اطمینان ہو گیا کہ یہ اُن کا تکیہ کلام ہے۔ جو

اُن کے نزدیک روغنِ قاز کا کام دیتا ہے۔ اس کے بعد اُن کے جی میں جب آتی ہمیں ٹیلی فون پر بلا بھیجتے اور ہم بھی تفننِ طبع کے لئے چلے جاتے، کہ اور کچھ نہیں، تو اپنے مفادات کی حفاظت کا راگ ہی سُنیں گے۔ اللہ اکبر۔ کہاں وہ دن تھے کہ جہاں ڈاکٹر عالم کھڑے ہوتے، ہزار ہا لوگ زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ اور کہاں یہ عالم تھا کہ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ انتقال فرمایا تو سیاسی کسمپرسی کا عالم یہ تھا کہ کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔

محمد علی کے ساتھ جوہر کا تخلص چسپاں کرنے کی روایت تو پاکستان بننے کے بعد شروع ہوئی۔ ورنہ ہم تو اُنہیں رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے نام سے جانتے تھے۔ اُن کی شاعری سے آگاہ تھے لیکن شاعری سے کہیں زیادہ اُن کی سیاست اور صحافت کو اہمیت دیتے تھے۔ مجھے اُن سے ملاقات کا دعویٰ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو اس وقت میرا سن دس سال سے زیادہ نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اُنہیں دو مرتبہ دیکھا۔ ایک بار دُور سے، ایک بار قریب سے۔ ایک بار جلوس میں، دوسری بار اپنے گھر میں، کہ اُنہیں اور بعض دوسرے رہنماؤں کو والدِ مرحوم نے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ ویسے میں اُن سے بخوبی آشنا ہوں۔ کیونکہ "دی کامریڈ" کے سارے فائل پڑھ رکھے ہیں۔ اور "ہمدرد" میں اُن کے قریب قریب تمام اداریوں کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ اور اُن کے بارے میں جو سوانحی کتب موجود ہیں۔ وہ بھی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اس لئے محسوس کرتا ہوں۔ جیسے برسوں اُن کی صحبت میں زندگی گزاری ہے۔

محمد علی لندن میں فوت ہوئے اور بیت المقدس میں دفن ہوئے

اس موقع پر مصر کے شاعر احمد شوقی پکار اُٹھا :

اے بیت المقدس کی سرزمین
تجھے مبارک ہو
کہ تیری آغوش میں ایک نیا مہمان آیا ہے
وہ تیرے لئے اجنبی نہیں
کہ اُس نے تیرے فرزندوں کی اعانت کی ہے
وہ مشرق کے عوام کے لئے ہر طاقت سے برسرِ پیکار رہا
اور اسلام اُس کا اوڑھنا بچھونا تھا
نیل کی لہریں اُسے یاد کریں گی
اور تُرک اس کی سچی تڑپ کو کبھی نہیں بھولیں گے
ہندوستان اسے ہمیشہ یاد رکھے گا
کہ وہ اس کے لئے موت تک بے قرار رہا

اس چھوٹی سی نظم میں محمد علی کا پُورا سیاسی کردار سمایا ہوا ہے۔ اُس کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ برِّعظیم کے مسلمان دو بڑی برادریوں سے منسلک ہیں۔ ایک برادری تینتیس کروڑ ہندوستانیوں کی ہے جس میں سات کروڑ مسلمان شامل ہیں۔ دوسری برادری دنیائے اسلام ہے جس میں پچیس تیس کروڑ انسان آباد ہیں۔ ہندوؤں پر صرف ہندوستان کی آزادی کا فرض عائد ہوتا ہے۔ ہم پر اس کے علاوہ دنیائے اسلام کی آزادی کا فرض بھی عائد ہے۔ اُنہوں نے ایک اداریے میں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا: "میرا ایک پاؤں ہندوستان میں ہے اور ایک پاؤں مذہب اسلام میں۔ تمہاری کاشی، تمہارا گیا اور تمہارا اجودھیا سب یہیں ہیں۔ میرا مکّہ، میرا مدینہ اور میرا بیت المقدس یہاں سے باہر ہے۔ میں ان

کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میں کعبہ اور کاشی، دونوں کی آزادی کے لئے لڑنے کو تیار ہوں؛" تحریکِ خلافت میں محمد علی نے جو حصّہ لیا۔ اس میں بھی دو مقاصد کارفرما تھے۔ اوّل: خلافتِ عثمانیہ کی حفاظت اور اُس کے وقار کی بحالی اور سامراجی تسلّط سے مسلمان قوموں کی نجات۔

دوم: ہندوستان کی آزادی۔ ان دونوں مقاصد کے لئے ترکِ موالات یا عدمِ تعاون کا حربہ استعمال کیا گیا۔ یعنی زندگی کے ہر دائرے میں انگریز سے عدمِ تعاون، تا آنکہ وہ حکومت کے ناقابل ہو جائے۔

ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے؟ یہ بھی سُن لیجئے اُنھوں نے "دی کامریڈ" میں یہ موقف اختیار کیا کہ ہندوستان میں کوئی متحدہ قومیت موجود نہیں۔ مسلمان ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہیں اس لئے ہندوستان کا مسئلہ کوئی فرقہ دار مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بین الاقوامی قانون کا بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ سب قومیں برابر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کی حیثیت یورپ کی چھوٹی طاقتوں کے برابر ہے اور مسلمان ان طاقتوں کی طرح تمام فرقہ وار تنازعات میں کامل برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کر رہے۔ اور اپنے مطالبے کو ایک ایسی نمائندگی تک محدود کرتے ہیں جو اُن کے وجود اور وقار کے تحفظ کے لئے کافی اور مؤثر ہو۔ یہ نمائندگی کس قسم کے ڈھانچے کے اندر ہو؟ اس بارے میں محمد علی نے کہا کہ ایک سچ مُچ کی متحدہ قومیت تو وجود میں نہیں آ سکتی۔ البتہ کینیڈا کی طرح کا ایک اتحاد ناممکن نہیں۔ لیکن یہ رومان اور شاعری کی تخلیق کی ہوئی محبت کی شادی نہیں ہو گی۔ اس شادی کا محرک جذبہ فریقین کی سہولت پر مبنی ہو گا۔ یہ نکاح اگر عزت سے کیا جائے۔ اور احترام کے ساتھ قائم رکھا

جائے تو اسے بُرا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ نکاح کی شرائط کیا ہوں؟ اس بارے میں محمد علی کے خطبات اور اداریئے جو "ہمدرد" میں لکھے گئے، ہماری رہنمائی کرتے ہیں وہ مسلمانوں کے حقوق کے سلسلے میں اسی قسم کے مطالبات کرتے تھے جو بعد میں "جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" میں لکھا۔ "اگر یہ تجاویز منظور ہوگئیں۔ تو ہندوستان کے پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور چھ میں اقلیت، وہ خود بھی انصاف کریں گے اور دوسروں سے بھی انصاف کی توقع رکھیں گے۔" یہی وہ نقطۂ نگاہ تھا جس کے لئے وہ آخری دم تک لڑتے رہے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے۔

محمد علی نے دنیائے اسلام کے مسائل میں مسلسل عملی دلچسپی لی۔ جنگِ طرابلس اور جنگ ہائے بلقان کے دوران میں ترکوں کے زاویۂ نگاہ کو نہایت مدلّل طریقے سے پیش کیا۔ ترکوں کے لئے چندہ فراہم کیا۔ میڈیکل مشن استنبول بھیجا مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ترکیہ کے جنگی تمسکات خرید کر جنگی مساعی کو تقویت دیں۔ ہندوستان میں ترکیہ کی صحیح خبروں کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ترک خبر رساں ادارہ قائم کرنے کی تحریک فرمائی۔ جب پہلی عالمی جنگ میں ترکیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تو محمد علی نے ترکوں کی حمایت میں ایک طویل اداریہ لکھا۔ جس کی بنا پر حکومت نے ایک بھاری رقم بہ طور ضمانت طلب کی۔ "کامریڈ" بند ہوگیا اور وہ خود نظر بند ہوگئے۔ جنگ کے بعد انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کے تحفّظ و بقا کے لئے تحریکِ خلافت کا پرچم بلند کیا۔ اُن کی اور دوسرے رہنماؤں کی اپیل پر ہزارہا مسلمانوں نے لبیک کہتے ہوئے سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں۔ جیلوں کو آباد کر دیا۔ مسلمان وکلاء نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا۔ طلباء نے سرکاری امداد سے

چلنے والی درس گاہوں کو چھوڑ دیا۔ اور قربانیوں کی ایک نئی مثال قائم کر دی جب
ترکیہ نے خلافت منسوخ کر دی۔ تو محمد علی نے ابن سعود کو مستقل نعم البدل الخلیفۃ المسلمین تصور
کرتے ہوئے اُن کی تائید و حمایت کا بیڑہ اٹھایا۔ اور حجاز میں منعقدہ موتمر عالمِ
اسلامی میں شریک ہو کر مطالبہ کیا کہ ابن سعود سلطانی کا ارادہ چھوڑ کر سلطانی جمہور
کو رواج دیں۔ جب مصر کے مسلمانوں نے سعد زاغلول پاشا کی قیادت میں برطانوی
سامراج کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ اور انگریزوں نے چاہا کہ اُنہیں دبانے
کے لئے ہندوستانی فوج سے مدد لی جائے۔ تو محمد علی نے اس کے خلاف شدید
احتجاج کیا۔ غرض محمد علی نے دنیائے اسلام کی ہر مصیبت کو اپنی مصیبت جانا
اور اپنے آپ کو ہمیشہ دنیائے اسلام کا شہری محسوس کیا۔ وہ احیائے خلافت کے
نصب العین سے کبھی غافل نہ ہوتے۔ اور اُن کی خواہش تھی کہ احیائے خلافت کی
تحریک کا آغاز ہندوستان سے ہو۔ یہ کام کیسے ہو؟ اس سلسلے میں محمد علی
کے ایک اداریئے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ مسلمانوں کے ایک ایسے
نظام کی ضرورت ہے جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہو اور جس وقت
تحریک خلافت کو ایک دفعہ پھر منظم کر دیا جائے گا۔ تو اس سے عالمِ اسلامی
کی رہنمائی ہو گی۔ جیسا کہ جنگِ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ مُوتمر اور اس کی مجلسِ تنفیذیہ
میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے ایک نظام کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے اور یہ مختصر سا
بیج مستقبل میں از سرِ نو قائم کردہ خلافت کی جڑ ہو گا۔ جو خلافتِ راشدہ کے نمونے
پر قائم ہو گی۔ اسلام کا یہی سب سے بہتر نظام ہے اور ہمیں بجائے اس کے
کہ ہم دوسرے چھوٹے چھوٹے نظام قائم کریں، اس کے قیام کی طرف متوجہ ہو
جانا چاہیئے۔ اب ہمیں اس مینار کو اٹھانے کے لئے چاروں طرف سے لگ جانا

چاہیئے۔ جس کی ابتدا ہندوستان سے ہو۔ اور انشاء اللہ بہت جلد ہم یہ دیکھیں گے کہ اس عمارت کی چوٹی تاجِ خلافت سے مزیّن ہو گی اور یہ خلیفہ عالم اسلام کی آزادی رائے سے منتخب ہوگا۔" [ہمدرد۔ ۲ستمبر ۱۹۲۶ء]

محمد علی کا یہ نصب العین قابلِ عمل ہو یا نہ ہو۔ اتنی بات واضح ہے کہ اُس نے اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی۔

شکست و فتح نصیبوں میں تھی ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

حافظ محمد یعقوب کو مولانا ظفر علی خان کا اردلی سمجھ لیجئے۔ نیلی پوشوں کی تحریک ہوئی۔ تو یہ بھی نیلی پوش بن گئے۔ لیکن ٹوپی وہی پُرانی رہی۔ جسے امان اللہ کیپ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور جس کا فیشن افغانستان کے بادشاہ غازی امان اللہ خان نے شروع کیا۔ یہ ٹوپی جناح کیپ کی طرح تھی۔ لیکن سر والے حصّے سے ٹوپی کا ہم رنگ ساٹن کا ایک ٹکڑا الٹی تکون کی صورت میں دائیں جانب لٹکتا تھا اور آخری کونے سے ایک چھوٹا سا پھندنا آویزاں تھا۔ ۱۹۲۷ء سے یہ فیشن چلا۔ لیکن دو تین سال بعد نہ غازی امان اللہ باقی رہے نہ امان اللہ کیپ اور اگر باقی رہی تو حافظ محمد یعقوب کی ٹوپی۔

مولانا ظفر علی خان برِعظیم کے دورے پر جاتے۔ تو حافظ محمد یعقوب ہمراہ ہوتے۔ دن رات کے خدمت گزار تھے اور ایک منصب یہ بھی تھا کہ جہاں مولانا جائیں اور کوئی ہجوم اُن کے استقبال کو آئے تو یہ صاحب نعرے لگوائیں جن دنوں مولانا چراغ حسن حسرت ظفر علی خان کے خلاف تھے۔ اُنہوں نے "احسان" میں اپنے مزاحیہ کالم "مطائبات" میں یہ واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک

بار مولانا کسی ایسے شہر کو گئے۔ جہاں لوگوں کو وقت سے پہلے آمد کا پتہ نہ چلا۔ اس لئے سٹیشن پر استقبال کے لئے کوئی نہیں تھا۔ البتہ مسافروں کا سامان اُٹھانے کے لئے نیلی وردی میں ملبّس قلیوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ حافظ یعقوب گاڑی سے نکلے تو یہ سمجھا کہ نیلی پوش رضاکار استقبال کو آئے ہیں۔ چنانچہ حسبِ دستور اُنہوں نے نعرے لگوانے چاہے لیکن رضاکار ہوتے تو جواب ملتا۔ قلّی ہکّا بکّا تھے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ جب اصل صورتِ حالات کا انکشاف ہوا تو حافظ یعقوب مولانا کو لے کر نکلے۔ سامان اُٹھوایا۔ تانگہ کرایا اور مولانا کو منزلِ مقصود کی طرف لے گئے۔

حافظ یعقوب کا ایک اور مصرف بھی تھا۔ مخالفین کے جلسے اُلٹانے، اس سلسلے میں اُن کی ایک تکنیک خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مخالفین کے جلسے میں سٹیج پر پہنچ کر درخواست کرتے کہ تلاوتِ قرآن حکیم مجھ سے کروائیے۔ اب یہ درخواست مسترد کر دینے کے قابل نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اجازت مل جاتی۔ حافظ صاحب ایک بار تلاوت کا آغاز کرتے تو پھر نہ رُکتے۔ رکوع پر رکوع اور سیپاروں پر سیپارے پڑھتے چلے جاتے۔ کوئی روکتا تو آنکھیں دکھاتے اور جلسے والے مداخلت فی الدین کے الزام سے خوف زدہ ہو کر ٹھٹک کر رہ جاتے۔ اور جب رات زیادہ ہو جاتی۔ تو جلسہ منتشر ہو جاتا۔

حافظ صاحب ایک آدھ بار جیل بھی گئے۔ لیکن فضا راس نہ آئی۔ اس لئے معافی مانگ کر واپس آ گئے۔ پاکستان بننے سے ایک سال پہلے مولانا ظفر علی خان پر فالج گرا۔ تو جلسوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی حافظ صاحب بھی کبھی نظر نہ آئے۔

ڈاکٹر محمود حسین سے معمولی شناسائی تھی۔ لیکن اُن کی شخصیت میں جو وقار تھا اور جو تمکنت تھی اُس سے میں بہت متاثر تھا۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی تھے۔ جو جمہوریہ ہند کی صدارت تک پہنچے۔ ڈاکٹر محمود حسین نے بھی سیاست میں حصّہ لیا۔ لیکن زیادہ نہیں۔ کیونکہ وہ اصلاً ایک عالم و فاضل شخصیت کے مالک تھے اور میدانِ سیاست کے کھلاڑی نہیں تھے۔ اور پھر سیاست کے مخصوص آداب اور دائو پیچ سے بھی آگہی نہیں رکھتے تھے۔ یا اُن کے دماغ میں ایسی آگہی کے لئے کوئی جگہ موجود نہیں تھی۔ تحریکِ پاکستان کے حامی تھے۔ اور اسی بنا پر پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رُکن چُنے گئے۔ چار سال مختلف وزارتی عہدوں پر رہے۔ پہلے نائب وزیر کی حیثیت سے، پھر وزیرِ تعلیم اور وزیرِ امورِ کشمیر کی حیثیت سے۔ لیکن اچھے وقت پر سیاست سے بے دخل ہو گئے۔ سیاست دان سیاست کو ترک بھی کر دیں۔ تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتے۔ لیکن ڈاکٹر محمود حسین ایسے سیاست دانوں میں شامل نہیں تھے۔ کیونکہ ایک بار میدانِ سیاست سے نکلے تو دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کیا اور اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ چیز اُن کے بس کا روگ نہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین ہمارے دانش وَروں میں غالباً واحد بزرگ تھے جو بنگالیوں کے مزاج سے آگاہ تھے۔ اُن کی تدریسی زندگی کا آغاز پاکستان بننے سے چودہ سال پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ہوا۔ جدید تاریخ اور بین الاقوامی تعلقات اُن کے محبوب مضامین تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں سولہ سال تک تدریس کے بعد وزارتِ پاکستان میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی میں سات سال تک تاریخ کے پروفیسر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے پھر ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر چار سال تک متمکن رہے۔

چند سال غیر ملکی یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر کے عہدوں پر فائز رہے ۔۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ وائس چانسلر شپ کا یہ دور کھچاؤ اور تناؤ کا دور تھا ۔ دائیں اور بائیں بازو کے درمیان تصادم طلبا کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے دائرے میں بھی چلتا رہا ۔ ایسے میں وہ مرضِ قلب میں مبتلا نہ ہوتے ۔ تو یہ حیرت کی بات ہوتی ۔ بہر حال اُنہوں نے حالات سے خوب نباہ کیا اور آخر جان ہار دی ۔

پروفیسر کا کام صرف یہ نہیں کہ اپنے طلبا کو پڑھا کر فارغ ہو جائے پروفیسر کہلانے کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو تدریس کے ساتھ تحقیق کا بازار بھی گرم رکھتے ہیں تاکہ علم جامد نہ ہو ۔ متحرک رہے اور علم کے نئے باب وا ہوتے چلے جائیں ۔ ڈاکٹر محمود حسین اس قسم کے پروفیسر تھے ۔ تدریسی زندگی کے ابتدائی دور میں اُنہوں نے مشہور فرانسیسی مفکر روسو کی شہرہ آفاق کتاب "سوشل کنٹریکٹ" کا ترجمہ "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے کیا ۔ میکیاولی کی کتاب "دی پرنس" کو بھی اُردو میں منتقل کیا ۔ ٹیپو سلطان کے خواب مرتب کئے ۔ اس کی فوج کا ہدایت نامہ "فتح المجاہدین" کا ترجمہ بھی کیا ۔ اور ایڈٹ بھی کیا ۔ جدید تاریخ پر بھی کتابیں لکھیں ۔ بڑے بڑے تحقیقی مجلّوں اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے لئے مقالے لکھے ۔ غرض جتنی دیر زندہ رہے کتابوں کی دنیا میں سرگرم سفر رہے ۔ بلکہ کتاب خانوں کی تنظیم میں بھی پیش پیش رہے ۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ (دہلی) سے اس خانوادے کا دیرینہ تعلق تھا ۔ چنانچہ ڈاکٹر محمود حسین نے اس قسم کا ایک ادارہ کراچی میں بھی قائم کرنے کی سعی فرمائی لیکن وہ حالات موجود نہیں تھے ۔ جن میں ایسے ادارے کامیاب ہوتے ہیں ۔

مولانا غلام رسول مہر حمایت یا مخالفت، دونوں سے کوئی تاثر قبول نہیں کرتے تھے۔ تعریف پر خوش نہیں ہوتے تھے، تعریض پر مضطرب نہیں ہوتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اُن سے کہا: فلاں اخبار نویس پہلے آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اب طعن و تشنیع پر اُتر آیا ہے۔ تو کہنے لگے۔ جانم! اس پر پریشانی کا کون سا مقام ہے؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ؎

از رد و از قبولِ تو فارغ نشستہ ایم
اے آں کہ خوب ما نہ شناسی ز زشت ما

دنیائے علم و ادب میں مولانا غلام رسول مہر کے کردار پر غور کیجئے تو دو حقیقتیں اُبھرتی ہیں۔ اوّل: وہ اعلیٰ پائے کے اداریہ نگار تھے۔ دوم: وہ بلند مرتبت سوانح نگار تھے۔ اداریہ نگاری اور سوانح نگاری میں قدرِ مشترک علمی تحقیق تھی۔ بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ اداریہ نگاری کے دوران میں اُنہوں نے تحقیق کا جو تجربہ حاصل کیا، وہی سوانح نگاری کی بنیاد بن گیا۔ جب تک صحافت میں تھے عصرِ حاضر کی تاریخ قلم بند کرتے رہے۔ جب صحافت سے الگ ہوئے تو واقعات کی تحلیل کا ذوق سوانح نگاری کے رُوپ میں ڈھل گیا۔ اخباری اداریوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حالات و واقعات اور آراء کی تاویل اور تشریح کی جائے۔ رائے عامہ کی رہنمائی کی جائے اور لوگوں کو حالاتِ حاضرہ پر سوچ بچار کی مستقل عادت ڈالی جائے۔ اداریہ نگاری کا فنی تقاضا یہ ہے کہ پہلے کوئی مسئلہ پیش کیا جائے۔ پھر اس کے مختلف پہلو بے نقاب کئے جائیں۔ اس کے بعد دلائل کے سہارے سے اپنی رائے پیش کر دی جائے اور اسلوبِ بیان کا تقاضا یہ ہے کہ گفت گو کا عنصر غالب ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خطابت کی ہلکی سی جھلک موجود ہو کیونکہ اس سے ابلاغ میں آسانی

پیدا ہو جاتی ہے اور بات قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ مولانا مہر کی اداریہ نگاری ان تمام فنی تقاضوں کی حامل تھی لیکن یہ مختلف ارتقائی مدارج سے گزر کر نقطۂ عروج کو پہنچی تھی۔

مولانا مہر ۱۹۲۲ء کے اواخر میں "زمیندار" کے عملۂ ادارت میں شامل ہوئے۔ پہلے ہی دن سے اداریہ نگاری شروع ہو گئی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پہلا اداریہ حقیقت میں ان کا پہلا مضمون تھا۔ ۱۹۲۷ء کے آغاز تک "زمیندار" کے لئے اداریئے لکھتے رہے۔ اُس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کے اسالیب سے متاثر تھے۔ آزاد سے زیادہ، ظفر علی سے کم۔ چنانچہ ایک تو اداریئے طویل ہوتے تھے۔ دوسرے، اُن میں ادیبانہ رنگ بھی تھا اور خطیبانہ ٹھاٹھ بھی۔ اور لبا اوقات جوش و خروش استدلال پر غالب آجاتا تھا۔ سیرت نگاری کا ذوق بھی اسی دور میں اُبھرا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں ان کی پہلی کتاب "سیرتِ ابنِ تیمیہ" منظرِ عام پر آئی۔ اس میں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا۔ وہ اداریہ نگاری کے انداز سے ملتا جلتا تھا۔

اپریل ۱۹۲۷ء میں مولانا عبدالمجید سالک کی رفاقت میں روزنامہ "انقلاب" جاری کیا۔ اس میں مہر زیادہ تر افتتاحیہ لکھتے تھے اور سالک شذرات اور "افکار و حوادث"۔ اس دور میں مہر کی اداریہ نگاری میں ایک نیا نکھار پیدا ہوا۔ اداریوں کی طوالت قدرے کم ہو گئی۔ ادیبانہ اور خطیبانہ رنگ کسی قدر گھٹ گیا۔ اور استدلالی رنگ غالب آگیا۔ استدلال کا تقاضا تھا کہ حقائق کی چھان پھٹک میں تحقیق سے کام لیا جائے۔ چنانچہ وہ صحتِ معلومات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور ایک دیانت دار محقق کی طرح صرف مستند حقائق اور اعداد و شمار پیش کر کے ان سے نتائج اخذ کرتے تھے۔ اسی دور

میں اُنہوں نے اپنی محققانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوانح نگاری کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ اور غالبؔ کے فارسی اور اُردو خطوط کو بنیاد بنا کر غالبؔ کے ایسے مستند سوانح قلم بند کر دیئے کہ حالی کی "یادگارِ غالبؔ" پسِ پُشت پڑ گئی۔ یہی وہ کتاب تھی جس نے علمی دنیا کو چونکا دیا۔ اور جس نے اُنہیں محققین کی صف میں ایک ممتاز مقام بخش دیا۔

اب مہرؔ کی اداریہ نگاری کے نظریاتی پہلو کی طرف آیئے۔ وہ اُس زمانے میں اس میدان میں داخل ہوئے۔ جب تحریکِ خلافت کا دَور دَورہ تھا۔ اور ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ جونہی یہ تحریک ختم ہوئی۔ ہندوؤں کی متعصب تحریکوں کا دور آگیا۔ کہیں شدھی کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ کہیں سنگٹھن کا۔ ایسے میں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کا احیا وقت کا اہم تقاضا تھا۔ اس سے سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی اور جُداگانہ انتخاب کے مسائل اُبھرے۔ جو بعد میں مسلمانوں کے قومی مطالبات بن گئے۔ گویا آزادی کی جنگ کے بعد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں محض جوشیلے اور خطیبانہ اسلوبِ نگارش کام نہیں آسکتا تھا۔ اب اعداد و شمار کی جنگ تھی۔ استدلال کے معرکے تھے۔ اور مہرؔ نے "انقلاب" کے ذریعے سے یہ جنگ اس حسن و خوبی کے ساتھ لڑی کہ برِعظیم کے بے شمار مسلمان اخبار عش عش کر اُٹھے۔ اور اُنہوں نے بہت سے امور میں مہرؔ کے استدلال کا ساتھ دیا۔ کانگرس نے نہرو رپورٹ کے رُوپ میں مسلمانوں کے حقوق کو کچلنے کی جو کوشش کی۔ مہرؔ کے اداریئے اس کا زبردست توڑ ثابت ہوئے خطبۂ الٰہ آباد کے بعد اُن کی اداراتی تحریریں دو متوازی خطوط پر چلنے لگیں۔ ایک

طرف علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کی جانب اور دوسری طرف عبوری دور میں قائدِ اعظم
کے چودہ نکات کی جانب۔ تا آنکہ قراردادِ لاہور نے مسلمانوں کا نصب العین
بالکل واضح کر دیا۔ مولانا نے قراردادِ لاہور کے حق میں اور پنجاب و بنگال
کی تقسیم کے خلاف جتنے محققانہ مقالاتِ افتتاحیہ لکھے ہم عصر اسلامی
صحافت میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مہر صاحب عملی سیاسیات میں براہِ راست حصّہ لینے کے قائل
نہیں تھے۔ لیکن جب ضرورت محسوس کی عملی سیاست میں جُزوی طور پر ایک
تعمیری کردار ادا کیا۔ مثلاً ۱۹۲۹ء میں اُس آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں نمایاں
حصہ لیا۔ جس میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تعلق رکھنے والے مسلمان رہنماؤں
نے سر آغا خان کی قیادت میں وہ قومی مطالبات مرتب کئے جو بعد میں قائدِ اعظم
کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن دنوں آل انڈیا مسلم لیگ دو
متوازی جماعتوں میں منقسم تھی۔ ایک جناح لیگ۔ دوسری شفیع لیگ۔ جناح
لیگ کے صدر قائدِ اعظم محمد علی جناح تھے اور سیکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو
اور شفیع لیگ کے صدر سر محمد شفیع تھے اور سیکرٹری علامہ اقبال۔ ان دونوں
جماعتوں کو متحد کرنے میں جن بزرگوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ ان میں مولانا مہر
اور اُن کے ساتھی مولانا سالک بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۸ء میں قائدِ اعظم نے
غیر ممالک میں لیگ کے موقف کی نشر و اشاعت کے لئے ایک فارن سب کمیٹی
نامزد کی جس کے صدر سیٹھ عبداللہ ہارون تھے اور سیکرٹری پیر علی محمد راشدی
اس کمیٹی کی فرمائش پر مولانا مہر نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور لیگ
کے موقف پر ایک کتابچہ لکھا جس کا عربی ترجمہ مختلف عرب ممالک میں تقسیم
کیا گیا۔ اس کے بعد قائدِ اعظم نے مسلم لیگ کی ایک خصوصی کمیٹی اس مقصد سے

قائم کی۔ کہ برِعظیم کی تقسیم کے سلسلے میں جو منصوبے مختلف دانش وروں نے تیار کر رکھے تھے۔ اُن کی چھان پھٹک کر کے اپنی سفارشات پیش کرے مولانا مہرؔ بھی اس کمیٹی کے رُکن تھے۔ اُنہوں نے اس میں جو نمایاں کردار ادا کیا۔ اُس کی داستان پیر علی محمد راشدی نے مرتب کی۔ اور یہ "جنگ" میں بالاقساط چھپی۔

"انقلاب" کی بندش (نومبر ۱۹۴۹ء) سے بہت پہلے مولانا مہرؔ سید احمد شہید پر تحقیق کا آغاز کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں وہ ٹونک گئے۔ برِعظیم کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ بے شمار کتب خانے کھنگال ڈالے بڑی بڑی نادر دستاویزات حاصل کیں۔ اور سرحد کے علاقے میں اُن تمام مقامات کا خود مشاہدہ کیا۔ جہاں سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف معرکوں میں حصّہ لیا تھا۔ "انقلاب" سے فارغ ہوئے تو مولانا مہرؔ نے "سید احمد شہیدؒ" کے نام سے اپنی تحقیق کا نچوڑ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کر دیا۔ جو اب تک اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُنہوں نے "سرگزشتِ مجاہدین" کے نام سے ایک اور کتاب میں ان مجاہدین کے خدوخال نمایاں کر دیئے جنہوں نے سید احمد کی شہادت کے بعد کم و بیش نصف صدی تک برطانوی سامراج کے دانت کھٹے کئے اور دار و رسن کی ایسی ایسی کڑی آزمائشوں سے گزرے جن کا تصوّر ہی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ہماری جدوجہدِ آزادی کا وہ سُنہرا باب تھا۔ جسے سامراجی مؤرخین اور برطانوی عہد کے مخصوص مفادات نے تعلیم یافتہ طبقے تک نہ پہنچنے دیا۔

مہرؔ کی سوانح نگاری کا آغاز سیرتِ ابنِ تیمیہ سے ہوا اور انجام حضور سرورِ کائناتؐ کی سیرت پر۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وفات سے ایک

آدھ مہینہ پہلے جب وہ "رسولِ رحمت" کے پروف پڑھ رہے تھے تو انہوں نے کس روحانی مسرّت اور آسودگی کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا۔ اور فرمایا کہ یہ میرے کام کی پہلی قسط ہے۔ اگر زندگی نے مہلت دی تو حضور سرورِ کائنات کی سیرت کے اور بہت سے بیش قیمت اور اب تک مخفی پہلوؤں کو منظرِ عام پر لاؤں گا۔

مرتضیٰ احمد خان میکش دبنگ قسم کے اخبار نویس تھے۔ ابتدائے عمر میں بڑے خوبصورت جوان تھے۔ لباس بھی ٹھاٹھ دار پہنتے تھے۔ سنا ہے عشق و عاشقی میں بھی درک رکھتے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد تحریکِ ہجرت میں حصّہ لیا اور افغانستان جا پہنچے۔ وہاں اخبار نکالنے کا ارادہ تھا لیکن جب سارے مہاجر بے نیلِ مرام لوٹے۔ تو میکش بھی واپس آ گئے۔ پہلے "زمیندار" میں کام کیا۔ مہر و سالک نے "زمیندار" کو چھوڑ کر "انقلاب" نکالا۔ تو وہ نئے اخبار میں مدیرِ مخابرات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۹ء کے اواخر اور ۱۹۳۰ء کے اوائل میں "ہندی مسلمانوں کے لئے الگ وطن" کے موضوع پر مقالات لکھے۔ افغانستان میں بچہ سقہ کا انقلاب آیا۔ اس کے بعد امان اللہ خان بے دخل ہوئے اور نادر خان بادشاہ بن گئے۔ تو میکش امان اللہ خان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ "افغانستان" کے نام سے فارسی زبان میں ایک ہفت روزہ جاری کر لیا۔ "انقلاب" سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ ان کی الوداعی تقریب میں میں نے بھی ایک آدھ کیک اڑایا۔ مختلف اخبارات میں کام کرتے کرتے "احسان" کے "مدیر سردبیر" بن گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ملک نورِ الٰہی نامی ایک

تاجر کتب نے جاری کیا تھا۔ مجلس احرار کی انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن کے دوران میں "مرزائیت کے کاسہ سر پر گرز البرز شکن" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ پبلش کیا، جو احرار کے حامیوں میں بہت مقبول ہوا۔ "احسان" اپنے اولین دور میں بڑا جان دار اور ٹھاٹھ دار اخبار تھا۔ اور اس کا سہرا مکیش ہی کے سر تھا، کیونکہ وہ نہایت چابک دست اخبار نویس تھے۔ ملک نور الٰہی سے اختلاف ہوا، تو مستعفی ہو گئے۔ اور حسرت اور باری اور اشرف کو لے کر ایک نیا اخبار "شہباز" جاری کر لیا۔ اسے بھی انہوں نے خاصا دلچسپ بنا لیا اور اخبار چل نکلا۔ اتنے میں انہوں نے علامہ عنایت اللہ المشرقی کیخلاف کچھ لکھ دیا۔ اس پر علامہ نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ خاکساروں کو حکم دیا کہ اخبار کا مقاطعہ کیا جائے۔ چونکہ خاکسار ایک منظم جماعت تھی اس لئے مقاطعہ بہت کامیاب رہا۔ اور اخبار کی اشاعت گر گئی۔ چونکہ مالی حالت کمزور تھی اس لئے انہوں نے اپنے اخبار کی ملکیت یونی نسٹ پارٹی کے ایک رہنما سید امجد علی شاہ کے حوالے کر دی۔ کچھ دیر اخبار چلتا رہا۔ اتنے میں وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ اور وزیر پبلک ورکس سردار شوکت حیات خاں کے درمیان مناقشہ اتنا بڑھا کہ شوکت حیات وزارت سے برطرف کر دیئے گئے۔ اس پر "انقلاب" کے پہلو بہ پہلو "شہباز" نے بھی شوکت حیات کی حمایت میں مقالے شائع کئے۔ یونی نسٹ پارٹی "انقلاب" کا تو کچھ نہ بگاڑ سکی۔ لیکن "شہباز" تو اُس کا اپنا اخبار تھا، چنانچہ اس کی ادارت سے مکیش صاحب کو ہٹا دیا۔ اس پر حسرت، باری اور اشرف عطا بھی نکل آئے اور وفاقِ ادبی (؟) ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد سید شریف حسین سہروردی نے روزنامہ "مغربی پاکستان" جاری کیا، تو مکیش کو ادارت پر فائز کر دیا۔ وہاں بھی

اپنی آزادروی کے سبب سے زیادہ دیر کام نہ چلا۔ چنانچہ "نوائے پاکستان" کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۵۳ء کی انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن کے بعد منیر انکوائری کمشن بیٹھا۔ تو میکش صاحب نے اُس میں احمدیوں کے خلاف کیس پیش کیا۔ اور اس میں خاصی جاں فشانی سے کام کیا۔ چند سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا مرتضیٰ احمد میکش مولانا مہر کے بعد اُردو کے بہترین اداریہ نگار تھے۔ اظہارِ رائے میں بے باک تھے۔ اسی وجہ سے ہفت روزہ "افغانستان" کی ادارت کے دوران میں قانونِ تعلقاتِ خارجہ کے ماتحت دو سال قید بھی کاٹی۔ اور اس بے باکی کے طفیل اُنہیں یکے بعد دیگرے کئی اخبارات سے نقل مکانی کرنی پڑی۔ پاکستان بننے کے بعد داڑھی رکھ لی۔ وہ بھی نہایت بھرپور، طویل اور سفید۔ جو چہرے پر خوب بہار دیتی تھی۔ اُن کی زندگی کا ایک پہلو عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ وہ یہ کہ ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت قائم ہوا۔ تو وہ اُردو صحافت کی تدریس کے لئے جزوقتی لیکچرار مقرر ہو گئے اور یہ سلسلہ تادمِ مرگ جاری رہا جب میں صدرِ شعبہ بنا تو اُن سے روابط بڑھ گئے۔ کیونکہ ہفتے میں تین بار ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مسلم ٹاؤن بھی آتے تھے اور اُن سے دلچسپ گفتگو رہتی۔ ایک بار آئے تو والد گھر میں موجود نہیں تھے۔ میں نے اُنہیں اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اور پوچھا۔ آپ کون سا مشروب پسند فرمائیں گے۔ اُنہوں نے ازراہِ تفنن کہا کہ تمہارے پاس شراب موجود ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ یورپ سے واپسی پر طیارہ راں کمپنی کی طرف سے جو تحفے دیئے گئے اُن میں مارٹینی وائن کی ایک ننھی مُنی شیشی بھی موجود تھی جو میرے پاس

مدّت سے پڑی تھی۔میں نے وہ شیشی حاضر کر دی۔اس بالکل غیر متوقع حرکت پر وہ گھبرا ئے۔کہنے لگے۔بھئی میں نے تو محض مذاق کیا تھا۔میں بولا۔کہ میں نے کون سی سنجیدگی کے ساتھ شیشی پیش کر دی ہے؟ چنانچہ اس کے بعد چائے کی محفل جمی۔جو شرابِ الصالحین کا مقام رکھتی ہے۔

مجھے ایک واقعہ بار بار یاد آتا ہے۔جب ۱۹۴۱ء میں مَیں شعبۂ صحافت میں اُن کا شاگرد تھا۔اس زمانے میں طلبا اور طالبات نے بارہ دری میں پک نک کی ایک محفل برپا کی اور اس کے بعد دریائے راوی میں کشتی رانی کا سلسلہ چلا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ہلکا ہلکا ترشح بھی ہو رہا تھا۔ایک کشتی میں میکش صاحب تھے۔مولوی ابراہیم علی چشتی تھے اور مَیں۔کشتی چلانے کا کام چشتی صاحب کے ہاتھ میں تھا اور ساتھ گپ بھی ہو رہی تھی۔اس دوران میں میکش صاحب نے کہا کہ اگر میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں۔ تو یہ ملک بہت ترقی کرے گا۔گھر آکر والدِ مرحوم سے اس بات کا تذکرہ کیا۔تو اُنہوں نے بتایا کہ عنفوانِ شباب میں اُنہیں یہ وہم تھا کہ اُن کی تقدیر میں ہندوستان کی بادشاہت لکھی ہے۔میرا خیال تھا کہ یہ وہم دور ہو چکا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے۔ابھی تک یہ کیڑا کلبلا رہا ہے۔

میں نے ابتدا میں اُن کے عشق و عاشقی کی طرف اشارہ کیا ہے کہتے ہیں۔جب آتش جوان تھا تو اُسے پشاور سے کسی خاتون کے خط آنے لگے۔کہ میں تم پر مرتی ہوں۔میکش صاحب نے بھی پیار کا جواب پیار سے دیا۔جب معاملہ گرم ہوا۔تو اُدھر سے فرمائش آئی۔کہ اب جینا بے چین ہے اس لئے آؤ اور نکاح پڑھوالو۔موصوف نے ایک اعلیٰ درجے کا سوٹ بنوایا۔اور زیبِ تن کر کے پشاور کو روانہ ہو گئے۔تاکہ عاشقی کو قیدِ شریعت

میں لایا جا سکے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ محبوبہ کے فرائض کوئی بے تکلف دوست سر انجام دے رہا تھا۔ اس پر مولانا کچھ برہم ہوئے۔ کچھ محظوظ۔ اور لاہور کو لوٹے۔ تو یہ لطیفہ زبانِ زد عام تھا۔

نشتر جالندھری ۱۹۷۰ء کے وسط میں بیاسی سال کی عمر پا کر معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ پرانے انداز کے ایک منجھے ہوئے شاعر تھے۔ لیکن زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ اس صدی کے شروع میں امرتسر سے ایک اعلیٰ پائے کا ہفت روزہ "وکیل" کے نام سے شائع ہوتا تھا جس کی ادارت پر کسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد فائز رہے۔ عبداللہ العمادی اور عبداللہ منہاس بھی ادارت کرتے رہے۔ نشتر جالندھری ۲۱-۱۹۲۰ء تک "وکیل" کے ایڈیٹر رہے۔ چونکہ یہ اخبار اپنی سنجیدگی اور اعتدال اور مسلم سیاست کی ترجمانی کی وجہ سے بہت وقعت رکھتا تھا۔ اس لئے اس کی ادارت بھی ایک اعزاز کی حیثیت رکھتی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے مجھے ایک مرتبہ بتایا کہ "زمیندار" کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے سے پہلے میں ایک مرتبہ امرتسر گیا۔ تو خیال آیا کہ نشتر جالندھری سے ملاقات کر دوں۔ لیکن اس میں بڑا حجاب دامن گیر تھا۔ کہاں "وکیل" کے مدیر اور کہاں میں۔ بہر حال میں نے حجاب پر قابو پایا اور "وکیل" کے دفتر میں جا پہنچا۔ نشتر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو انہوں نے گرجدار آواز میں کہا۔ کیا کام ہے؟ میں نے لجاجت آمیز انداز میں عرض کیا کہ آپ کی صحبت سے کچھ دیر فیض یاب ہونا چاہتا ہوں۔ وہ بولے۔ اس وقت بہت مصروف ہوں۔ چار بجے آنا۔ چنانچہ میں چار بجے پہنچا۔ نشتر صاحب نے کاغذات سنبھالے۔ اور کہنے لگے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ راستے

میں باتیں ہو جائیں گی۔ مولانا مہرؔ نے بتایا کہ جب میں امرتسر کے بازاروں میں اُن کے ہمراہ چل رہا تھا تو بہت فخر محسوس کر رہا تھا کہ ایک عظیم صحافی اور ادیب کی صحبت سے لُطف اندوز ہو رہا ہوں۔ گردشِ روزگار ملاحظہ ہو۔ کہ مہرؔ صاحب کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اور نشترؔ جالندھری دنیاوی اعتبار سے پسپا ہوتے چلے گئے۔ تا آنکہ وہ وقت آیا۔ جب مولانا مہرؔ نے اُنہیں ادبی معاون بنالیا اور اُنہیں یہ کام سُپرد کیا۔ کہ مہرؔ صاحب کتابوں کے ابواب املا کراتے اور نشتر لکھتے جاتے۔ بہر حال مہرؔ صاحب اُن کی زباں دانی کے بہت قائل تھے اس لئے املا کے دوران میں زبان کے سلسلے میں نشترؔ جو مشورے دیتے۔ مہرؔ صاحب اُنہیں قبول کر لیتے۔

نشترؔ جالندھری میدان صحافت میں پنپ نہ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحافت کے تقاضے بدلتے چلے گئے۔ محض زباں دانی کام نہیں آتی تھی۔ اب سیاسی شعور بھی درکار تھا جس سے وہ محروم تھے۔ اُنہوں نے زبان پر کچھ کتابیں لکھیں۔ جو لکھنے والوں کے لئے بہت مفید رہیں۔ اُن کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ فنِ عروض میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف سے کوئی خاص بافت نہ ہوئی۔ محض قوت لایموت کا بند و بست ہوتا رہا۔ ناشر جانتے تھے کہ وہ ضرورت مند ہیں۔ اس لئے مسودے اونے پونے خرید لیتے تھے۔

نشتر جالندھری گفت گو کرتے وقت بہت ہکلاتے تھے۔ یہ چیز بھی اُن کی ترقی میں حائل رہی۔ لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ جب کسی مشاعرے میں کلام سُناتے۔ تو ہکلاہٹ باقی نہ رہتی اور بڑی روانی کے ساتھ شعر سناتے اور داد پاتے تھے۔

سردار عبدالرب نشتر صوبہ سرحد کے نامور وکلا اور قومی رہنماؤں کی صف میں ایک ممتاز مقام کے مالک تھے۔ قائد اعظم کو اُن پر بلا کا اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے نشتر مرحوم کو لبا اوقات لیگ ورکنگ کمیٹی کا رکن نامزد کیا۔ اور جب پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان کی عبوری مرکزی وزارت میں مسلم لیگ شامل ہوئی۔ تو سردار صاحب کو اس میں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کے مقرر تھے۔ لیگ کے جلسوں سے خطاب کرتے۔ تو لوگ اُن کی باتیں کان لگا کر سُنتے۔ کیونکہ ایک تو وہ سرمایہ دار نہ تھے۔ نہ جاگیردار۔ دوسرے، پُرانے قومی کارکن تھے۔ تیسرے۔ اُن کے خلوص، دیانت اور اعلیٰ کردار کے سب قائل تھے۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بنا پر وہ پنجاب کے پہلے مسلمان گورنر بنے اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جب ممدوٹ وزارت اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے برطرف ہو چکی تھی۔ نظم و نسق کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور اسمبلی کا شیرازہ بُری طرح مجروح تھا۔ اُنہوں نے گروہ بندی سے بالا رہ کر پنجاب کے حالات میں بہتری پیدا کی اور انتشار کو ختم کر کے اُسے ترقی کے راستے پر گامزن کیا۔

جس دن اُنہوں نے گورنری کا عہدہ سنبھالا۔ میں نے "انقلاب" میں اُن کے نام پورے صفحے کا ایک مکتوبِ مفتوح شائع کیا جس میں سیاسی بے راہ روی اور ممدوٹ وزارت کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کیا۔ اس سے اگلے روز گورنر ہاؤس میں ایک استقبالیہ تھا جس میں سینکڑوں شہری شریک ہوئے۔ میرا تعارف کرایا گیا تو اُنہوں نے مکتوبِ مفتوح کی تعریف فرمائی۔ اس کے بعد اُن سے جو ملاقاتیں ہوئیں۔ "دارالفرقان" میں ہوئیں۔ اُس زمانے میں یہ ایک اعلیٰ درجے کا یتیم خانہ تھا۔ میں اس کی مجلسِ منتظمہ کا صدر تھا اور چودھری فخرالدین احمد راجوروی ناظمِ اعلیٰ تھے۔ نشتر صاحب نے دو تین مرتبہ "دارالفرقان" کو قدوم میمنت لزوم سے

سے فیض یاب فرمایا۔ اچھے مشورے دیئے۔ اور یتیم خانے کی ہر ممکن مدد فرمائی۔

سردار عبدالرب نشتر مسلم لیگ کے اُن گنے چنے چند رہنماؤں میں شامل تھے جنہوں نے بے لوث خدمت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ نہ کوئی املاک بنائی۔ نہ متروکہ املاک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ بس یہی چاہا کہ پاکستان پھلے پھولے اور ترقی کرے۔ اُن کے فرزند جناب جمیل نشتر نے روزنامہ "جنگ" میں ان کے بارے میں جو سلسلۂ مقالات لکھا۔ کاش اُسے کتابی صورت میں چھاپ دیا جاتا۔

سید نور احمد کی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور انجام تصنیف و تالیف پر۔ لیکن اصل نام تعلقاتِ عامہ میں پیدا کیا۔ جس میں اُنہیں خصوصی درک حاصل تھا۔ وہ اسی کی بدولت اُبھرے۔ اور اسی کی بدولت چاروں شانے چت ہوئے تعلقات عامہ کے دَور میں اُنہوں نے جو حربے استعمال کئے۔ اُن کی داستان لکھنے کے لئے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور وہ بھی کسی ایسے شخص کے ہاتھوں، جو صحافت کی تاریخ میں بھی درک رکھتا ہو۔ کیونکہ اُن کے دور میں صحافت میں بہت سے ایسے اتار چڑھاؤ آئے۔ جن کی پسِ پُشت اُن کا خفیہ ہاتھ کارفرما تھا۔ حقائق سے عوام کی توجہ ہٹانے، غیر اہم چیز کو اہم بنانے اور اخبارات کو باہم لڑانے میں اُنہیں یدِطولےٰ حاصل تھا۔ ایک مثال ابھی ابھی یاد آئی۔ حکومت شورش کاشمیری اور "چٹان" کو ناپسند کرتی تھی۔ لیکن اسے بند کرنے میں گوناگوں مشکلات حائل تھیں۔ اس پر ایک چھوٹے سے ہفت روزہ کو "چٹان" کے خلاف اُکسایا گیا۔ اور وہ بھی اس انداز میں کہ اُس اخبار نے فحش بیانی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ آغا شورش کاشمیری نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ سید نور احمد نے "فحاشی" کے الزام میں دونوں اخباروں کو چھ

چھ مہینے کے لئے بند کر دیا اور یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش فرمائی۔ کہ انصاف سے کام لیا گیا ہے۔ بہرحال اخبار نویس جانتے تھے کہ اصل مقصد "چٹان" کو بند کرنا تھا۔ اور جو دوسرا اخبار بند کیا گیا۔ وہ محض برائے وزنِ بیت بند ہوا۔ کیونکہ اُسے تو ایک نہ ایک دن بند ہونا ہی تھا۔ حسنِ اتفاق سے آغا شورش کاشمیری کے پاس "عادل" کا ڈیکلریشن موجود تھا۔ اس لئے اُنہوں نے "چٹان" کی جگہ "عادل" نکال لیا۔ اور چھ مہینے کی مدت ختم ہوئی تو ایک بار پھر "چٹان" منظرِ عام پر آگیا۔ سید نور احمد کا ایک اور بڑا "کارنامہ" نوائے وقت کی بندش سے تعلق رکھتا ہے ممتاز دولتانہ کی وزارتِ اعلیٰ کا زمانہ تھا۔ "نوائے وقت" زیرِ عتاب تھا۔ اُس سے ایک ضمانت طلب ہوئی۔ اتفاق کی بات، کہ "نوائے وقت" والے دسویں دن کی جگہ گیارھویں دن ضمانت کی رقم جمع کرانے گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ ڈیکلریشن ہی منسوخ ہو چکا ہے۔ نئے ڈیکلریشن کی درخواست دی گئی۔ تو اُسے مسترد کر دیا گیا۔ اور طرّہ یہ کہ اسی نام کا ڈیکلریشن سید نور احمد نے اپنے ایک حواری صحافی منظفر احسانی کو دے دیا۔ یہ ایک بہت بڑی دھاندلی تھی۔

"نوائے وقت" نے کہیں سے "جہاد" کا ڈیکلریشن حاصل کیا۔ کچھ دیر اس نام سے اخبار چھپتا رہا۔ اس پر سید نور احمد نے گیلانی پریس پر دباؤ ڈالا۔ کہ یہ اخبار نہ چھاپو۔ پریس والے جُھک گئے۔ پھر "نوائے وقت" والوں نے اپنے معاصر "نوائے پاکستان" کو اپنا لیا۔ اور بعد از خرابی بسیار "نوائے وقت" کا ڈیکلریشن بحال ہوا لیکن سید نور احمد کی مہربانی سے نہیں، ممتاز دولتانہ سے مفاہمت کی بنا پر۔ اور ابھی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ اس رگڑے جھگڑے کے دوران میں میاں ممتاز دولتانہ نے ہفت روزہ "آفاق" کو روزنامہ بنا دیا۔ اس اخبار نے "نوائے وقت" کے کچھ کارکن اپنی طرف کھینچ لئے۔ یہ اخبار کچھ عرصہ خوب چلا۔

لیکن جب "نوائے وقت" دوبارہ نکل آیا۔ تو "آفاق" ٹھپ ہو گیا۔ اگر حمید نظامی میں جان نہ ہوتی۔ تو آج "نوائے وقت" موجود نہ ہوتا۔

اتنے میں ۱۹۵۳ء کی انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن اُبھری۔ اور اُس نے اتنا سنگین روپ لے لیا کہ ممتاز دولتانہ کی وزارت اُلٹ گئی اور لاہور میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ مسٹر جسٹس محمد مُنیر کی صدارت میں انکوائری ٹریبونل بیٹھا۔ تو سارے معاملات کی چھان بین کے دوران میں یہ حقیقت کُھلی۔ کہ جو اخبار مرکزی حکومت کے خلاف پیش پیش تھے۔ اُنہیں صوبائی حکومت نے ہزار ہا روپے کی رقوم پرچوں کی خریداری کی آڑ میں فراہم کی تھیں اور وہ بھی تعلیم بالغاں کے فنڈ سے۔ جس سے اخبارات کی خریداری نہایت بے معنی بات تھی۔ سید نور احمد کی پوزیشن ایسی خراب ہوئی کہ اُنہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد "آفاق" کو مشہور صنعتکار سعید سہگل نے خرید لیا۔ اور سید نور احمد کو اس کا مینجنگ ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ لیکن یہ اخبار نہ چل سکا۔ اور سید نور احمد اپنے گھر بیٹھ گئے۔

سید نور احمد کی صحافتی زندگی کی ابتدا لاہور کے انگریزی روزنامہ "مسلم آؤٹ لُک" سے ہوئی۔ یہ اخبار بند ہو گیا۔ تو پھر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں مسلم کارسپانڈنٹ بن گئے اور ان کا ایک کام یہ تھا کہ ہر ہفتے سیاسیات پر ایک کالم لکھیں۔ اسی کالم کے سہارے اُنہوں نے نواب احمد یار خان دولتانہ سے گہرے روابط استوار کر لئے۔ جو ان دنوں یونی نسٹ پارٹی کے چیف وہپ تھے۔ سر سکندر وزیر اعلیٰ بنے تو ڈائرکٹر اطلاعات کی اسامی خالی ہوئی۔ اس پر چودھری محمد حسین کا حق فائق تھا۔ جو اُن دنوں پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ چودھری محمد حسین وہی بزرگ تھے جن کا علامہ اقبال سے گہرا تعلق تھا۔ نواب احمد یار خاں دولتانہ نے ضد کی کہ نور احمد کو ڈائرکٹر بنایا جائے۔ چونکہ وہ سر سکندر کے

یارِ غار تھے۔ اس لئے سر سکندر نے اُن کی ضد کے سامنے سر جھکا دیا اور سید نور احمد نے اس احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ دل و جان کے ساتھ یونی نسٹ پارٹی کی خدمت کی۔ سر سکندر کے انتقال کے بعد ملک خضر حیات ٹوانہ وزیر اعلیٰ بنے اور جب خضر۔جناح مناقشات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو سید نور احمد پہچان گئے کہ اب ہوا کا رُخ بدل رہا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے اندرونِ خانہ راجہ غضنفر علی خان سے رشتہ جوڑ لیا۔ اور جو کام پہلے احمد یار دولتانہ سے لیتے تھے وہ راجہ صاحب سے لینے لگے۔ چنانچہ جب راجہ صاحب مرکز کی عبوری حکومت میں لیگ کے نمائندوں میں شامل ہوئے تو وہ سید نور احمد کو ساتھ لے گئے۔ اور اُنہیں مرکزی محکمۂ اطلاعات میں ایک اہم ملازمت دلا دی۔ پاکستان بنا۔ تو وہ پنجاب کے ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ بن گئے۔

راجہ غضنفر علی خان کا انتقال ہوا۔ تو سید نور احمد نے اُن کے سوانح قلم بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح "مشرق" میں "مارشل لآ سے مارشل لآ تک" کے نام سے مقالات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ کینوس وسیع تھا۔ اس لئے سوانح تو دب گئے اور سیاسی تاریخ غالب آگئی۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی اقساط میں چھپ رہا تھا کہ سید نور احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۹۳۷ء میں بھی موصوف نے ایک چھوٹی سی کتاب بزبان انگریزی میاں فضل حسین کی شخصیت پر لکھی تھی۔ بہر حال جب میاں عظیم حسین نے تحقیق کے بعد اپنے نامور باپ کے مفصل سوانح چھاپ دیئے تو سید نور احمد کی کتاب اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔

سید نور احمد سے میرا رابطہ اس وقت ہوا۔ جب ۱۹۳۹ء کے اواخر میں سر سکندر مرحوم کے کہنے پر اُنہوں نے مجھے سرکاری وظیفہ دلا کر ایسوسی ایٹڈ پریس

آف انڈیا میں چھ مہینے کے لئے رپورٹنگ کی تربیت دلائی۔ اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو لاہور کا دیہاتی پروگرام حکومتِ پنجاب کے محکمہ اطلاعات کی نگرانی میں مرتب ہوتا تھا، سید نور احمد نے تربیت ختم ہونے کے چھ مہینے بعد مجھے دیہاتی خبرنامے کی ترتیب کا کام سونپا۔ اُن دنوں کئی مہینے یہ دلچسپ روایت قائم رہی کہ سید نور احمد، ڈپٹی ڈائرکٹر جناب دت آرٹیکل رائٹر جناب ملک یوسف العزیز، آرٹیکل رائٹر جناب صادق قریشی نیوز ایڈیٹر جناب دہرہ، سٹینوگرافر سید بشیر حسین شاہ اور راقم الحروف دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے وہ اس طرح، کہ باری باری ہر شخص کے گھر سے چھ افراد کا کھانا آجاتا تھا۔ یہ محفلیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ کیونکہ لطائف بھی ہوتے تھے۔ اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات بھی ہوتا تھا۔

سید نور احمد کی زندگی کے آخری سالوں میں ان سے میرا ربط خاصا گہرا تھا۔ میں اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور ان سے مزے مزے کی باتیں سُنتا تھا۔ کاش وہ خود نوشت سوانح مرتب کر لیتے۔ کہ اُن کے ذہن میں بہت سے اہم واقعات کی تفصیل محفوظ تھی۔

ملک نور الٰہی کشمیری بازار کے ایک گمنام تاجر تھے لیکن ۱۹۳۴ء میں روزنامہ "احسان" جاری کر کے منظرِ عام پر آگئے۔ مکیش، حسرت، باری اور اشرف عطا کی بدولت یہ اخبار چل نکلا۔ اور کچھ دیر اس کا خوب غلغلہ رہا۔ مکیش اور اُن کے ساتھیوں نے "احسان" کو چھوڑا، تو اس کا ستارہ گردش میں آگیا۔ وقار انبالوی، ابوسعید بزمی اور دوسروں نے اس میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد سرور جامعی اور شریف فاروقی اور حبیب اللہ اوج ادارت پر فائز رہے لیکن ۱۹۵۳ء کی

انٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں جب یہ انکشاف ہوا کہ "احسان" دولتانہ وزارت سے بہت بڑی رقوم وصول کرتا رہا ہے۔ تو یہ اخبار عملاً ٹھپ ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ "ڈمی" کی حیثیت سے ایک عرصے تک جاری رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ملک صاحب نے لاہور کا روزنامہ "شہباز" بھی خرید لیا تھا۔ لیکن یہاں نہ چل سکا۔ تو پشاور لے گئے۔ جہاں ربع صدی کے بعد اسے نیشنل عوامی پارٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ملک نور الٰہی اصلاً تاجر تھے۔ اس لئے میدان صحافت میں داخل ہوئے۔ تو محض اس لئے، کہ جو اثر و رسوخ حاصل ہو، اُسے تجارت کو آگے بڑھانے میں استعمال کیا جائے۔ اس اعتبار سے وہ کامیاب رہے۔

ملک نور الٰہی کا تکیہ کلام تھا "نہیں سمجھے"۔ ایک بار وہ سیاسیاتِ حاضرہ پر والد صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔ جب "نہیں سمجھے" کی گردان بڑھی تو والد کہنے لگے۔ اتنا دماغ کہاں سے لاؤں۔ کہ آپ کے ملفوظات سمجھ سکوں؟ ملک صاحب کے فرزند ملک مقبول الٰہی (بیرسٹر) نے بھی یہی تکیہ کلام ورثے میں پایا۔ وہ مجھ سے گفت گو کرتے کرتے کہنے لگے۔ خورشید صاحب! نہیں سمجھے؟ اس پر میری بیوی نے کہا۔ ملک صاحب! ان کی بات کیا کرتے ہیں۔ یہ تو ہمیشہ سے ناسمجھ چلے آتے ہیں۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی ایک مقطع اور باوقار بزرگ تھے۔ محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ نہ صرف درسی کتابوں کے مصنّف تھے بلکہ اُنہوں نے بچوں کے لئے اور بہت سی کتابیں لکھ رکھی تھیں جن میں سے بعض اب تک یاد آتی ہیں۔ وہ یُوں تو مجلسی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تھے لیکن اُن کے ایک کارنامے کی یاد دل سے کبھی محو نہیں ہوگی۔ ان کی تحریک

پر اور انجمن حمایتِ اسلام کے اہتمام میں ہر عید الفطر پر اسلامیہ کالج لاہور کی وسیع گراؤنڈ میں عید میلہ ہوتا تھا۔ مسلمان دکان دار خوبصورت سٹال لگاتے تھے رستوران کھولتے تھے۔ کھیل تماشے والے بھی آجاتے اور رونق کو دو آتشہ کر دیتے تھے۔ یہاں اربابِ شہر آتے۔ عوام بھی شامل ہوتے۔ گویا عید ملن کی پارٹی ہو جاتی تھی۔ کچھ سر پھرے سیاسی اور معاشری کارکن بھی آجاتے۔ اور جگہ جگہ مجمع لگا کر عوام سے خطاب کرتے تھے۔ روائتی عید میلہ تو محلّہ شاہ ابوالمعالی میں لگتا تھا جہاں ہنگوڑے بھی ہوتے۔ دکانیں بھی ہوتیں۔ کھلونوں کا کاروبار ہوتا لیکن وہ میلہ اس قدر "عوامی" تھا کہ درمیانے طبقے کے لوگ وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور امرائے شہر کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کمی کو شیخ نور الٰہی کے برپا کئے ہوئے میلے نے پورا کیا۔ یہ سلسلہ تین چار سال چلا۔ اس کے بعد ختم ہو گیا۔ پاکستان بننے کے بعد باغِ جناح میں عید ملن پارٹیوں کا رواج ہوا۔ لیکن ان کا مقصد تو صرف وزرا کے ساتھ کندھا ملانے کی سہولت فراہم کرنا تھا۔ اس لئے اسلامیہ کالج گراؤنڈ کے عید میلے والی بات پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر نیاز احمد پنجاب یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹیکنالوجی کے ڈائرکٹر تھے۔ علم سے زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ اُن کا اصل شوق تھا۔ ڈرامہ نگاری اور ڈرامے سٹیج کرنا۔ موسیقی میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ دھڑے بند آدمی تھے۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن تھے۔ جو وائس چانسلر آتا۔ اُن سے نالاں ہوتا تھا۔ حضرت داتا گنج بخش سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ہر شام وہاں جاتے۔ بعض اوقات قوالی کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ میاں افضل حسین مرحوم نے مجھے بتایا کہ "جب میں وائس چانسلر بنا تو ڈاکٹر نیاز میرے پاس

آئے۔ کہنے لگے۔ میں نے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر دعا کی تھی کہ وائس چانسلر ڈاکٹر بشیر احمد سے نجات دلائیں۔ چنانچہ یہ دعا قبول ہوگئی۔ اس پر میں نے کہا میرے بارے میں کب اسی قسم کی دعا فرمائیں گے؟ میں نے میاں صاحب سے کہا۔ آپ ہرگز نہ گھبرائیں۔ حضرت داتا صاحبؒ کو آپ کے تعلیمی موقف کا پورا علم ہے۔ اور وہ کبھی ایسی دعا نہیں سنیں گے۔

ڈاکٹر نیاز پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈیمک سٹاف ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ اور ان کی ہمت قابلِ داد تھی کہ بڑے بڑے ذی علم مہمانوں کے سامنے بڑے دھڑلے کے ساتھ غلط انگریزی زبان میں تقریر فرما دیتے تھے۔ سائنس دان حضرات سائنسی مسائل پر گفت گو چاہتے تھے اور ڈاکٹر نیاز کسی ڈرامے کا ٹیپ ریکارڈ سنا دیتے تھے۔ اور تصوف کی باریکیوں پر اظہارِ خیال فرماتے تھے۔ سٹاف ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر محمد باقر کے ساتھ معرکے میں دشنام طرازی کا سلسلہ ایسا چلا کہ عورتیں غائب ہوگئیں لیکن اس معرکے میں ڈاکٹر باقر جیت گئے۔ کیونکہ ڈاکٹر نیاز کا ذخیرۂ الفاظ محدود تھا۔ اور کچھ حجاب بھی دامن گیر تھا۔

نیاز محمد خان (این۔ ایم۔ خان) سول سروس کے جانے پہچانے اور مشہور و معروف افسر تھے۔ ان کی ذات میں دو پیار مرتکز تھے۔ ایک مشرقی پاکستان کے ساتھ، دوسرا پنجاب کے ساتھ۔ مشرقی پاکستان میں ایک عرصہ گزار دیا۔ وہاں کے عوام سے دوستی اور محبت کے رشتے استوار کیے۔ انہیں ان رشتوں کا اتنا مان تھا کہ نیشنل اسمبلی کے لئے مشرقی پاکستان کے ایک حلقے سے انتخاب لڑنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ اگر ۱۹۷۰ میں صوبائی تعصب کی لہر اتنی تیز نہ ہوتی تو

وہ یقیناً مشرقی پاکستان کے کسی حلقے سے انتخاب لڑتے۔ جب اُنہوں نے ایسا ارادہ ظاہر کیا، تو میں نے کہا۔ یہ ناممکن بات ہے۔ وہ کہنے لگے میں ناممکن کو ممکن بنا کر دکھاؤں گا۔ بہر حال حالات ناساز گار ہو گئے اور اُن کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

پنجاب اور پنجابی زبان و ادب سے اُن کا بے پناہ پیار اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے "نیشنل کونسل آف میوزک" کے زیرِ اہتمام ایک کتاب "پنجابی لوک گیت" بڑی ٹھاٹھ سے چھاپی۔ یہ کتاب پاکستان بننے سے کوئی بارہ تیرہ سال پہلے پنڈت رام سرن داس ایڈووکیٹ نے مرتب کر کے چھاپ دی تھی۔ لیکن نیاز محمد خان نے اِسے اُستاد اللہ بخش کی تصاویر سے مزین کر کے دوبارہ شائع کر دیا۔ اس کے بعد پنجابی ادبی لیگ بنائی۔ اس کے زیرِ اہتمام ہر مہینے مشاعرے ہوتے۔ ایک مشاعرہ کی صدارت مجھے بھی سونپی۔ اس جماعت کے اہتمام میں پنجابی زبان کی چند کتابیں چھاپی گئیں۔ بلکہ قرآنِ مجید کا پنجابی ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔ پھر ایک اعلیٰ درجے کا پنجابی رسالہ بھی جاری کیا۔ لیکن جب انتقال کیا۔ تو نہ پنجابی ادبی لیگ باقی رہی۔ نہ اس کا رسالہ اور نہ اس کی محفلیں۔ گویا

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نَے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش تھا

ملک یوسف العزیز لاہور کے ایک جانے پہچانے صحافی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تعلقاتِ عامہ کے ہو رہے اور عمر کا بیشتر حصّہ اسی شغل میں گزار دیا۔ جن دنوں تحریکِ خلافت کا دَور دورہ تھا۔ لیڈروں کی اپیل پہ بہت سے

طلبہ نے ایسی درس گاہوں کو چھوڑ دیا جنہیں انگریزوں سے گرانٹ ملتی تھی۔ ملک یوسف بھی انہی نوجوانوں میں شامل تھے۔ اُنہوں نے اسلامیہ کالج کو چھوڑا اور نیشنل کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو خارزارِ صحافت میں قدم رکھا۔ پنجاب کے مشہور رہنما لالہ لاجپت رائے نے "بندے ماترم" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ جو پہلا اور آخری ہندو اخبار تھا جس میں ہندوانہ تعصب کا نام نشان نہیں تھا۔ ملک یوسف العزیز اس میں شامل ہو گئے۔ جب "بندے ماترم" حوادثِ زمانہ کا شکار ہو کر دوسرے ہندو اخبارات کی روش پر چل نکلا۔ تو موصوف "انقلاب" میں آ گئے۔ دو ایک سال میں حسنِ کارکردگی کا ایسا ثبوت دیا کہ نیوز ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اہم پریس کانفرنسوں میں خود جاتے اور صوبائی اسمبلی کی کارروائی بھی خود ہی رپورٹ کرتے تھے۔ وہ پُرانے اخبار نویسوں کی اُس پَود سے تعلق رکھتے تھے جو پورے جذب و جنوں کے ساتھ کام کرتے۔ اور صحافت ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پھر ان لوگوں کا خاصا تھا کہ مخالفت اخباری کالموں تک محدود تھی۔ نجی محفلوں میں ہندو اور مسلمان اخبار نویس یوں بیٹھتے اور یُوں گپ لگاتے جیسے آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ ملک یوسف العزیز جب بالی، بہار دواج، دہرہ، نیپالی، گورکھا اور دبنیر کی صحبت میں بیٹھتے تو بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے اور بالکل بھائیوں کی طرح گفت گو کرتے تھے۔

جب سر سکندر کے زمانے میں سید نور احمد "سول اینڈ ملٹری گزٹ" سے نکل کر ڈائرکٹر اطلاعات پنجاب کے عہدے پر فائز ہوئے تو اُنہوں نے انگریزی صحافت میں سے جناب دہرہ اور اُردو صحافت سے ملک یوسف العزیز کو چُنا۔ اور ان دونوں کو اپنے محکمے میں جگہ دی۔ سیکرٹریٹ کے قریب کورٹ

سٹریٹ میں دفتر تھا۔ اور یہ دونوں ایک ہی کمرے میں آمنے سامنے بیٹھتے تھے۔ مجھے ریڈیو سے نشر ہونے والی دیہاتی خبروں کے مکالمے کی ترتیب کا کام ملا۔ تو حکم دیا گیا کہ خبروں کے بارے میں پہلے ملک یوسف سے تبادلۂ خیالات کر لیا کروں۔ ملک صاحب کی عادت تھی کہ جب کسی خبر کا تذکرہ کرتا۔ وہ ایک زبردست قہقہہ بلند فرما دیتے تھے۔ میں بے بس ہو جاتا اور جناب دہرہ میری بے بسی پر متبسم ہو کر اسے دو آتشہ بنا دیتے۔ میں کبھی کبھی تو بُری طرح زچ ہو جاتا تھا۔ آخر ایک دن میری خدا نے سُن لی اور میں ایسوسی ایٹڈ پریس میں ملازم ہو گیا۔ وہاں ہر اتوار کی رات کو میں اکیلے ڈیوٹی دیتا تھا۔ کیونکہ اتوار کی رات کو کام نسبتاً کم ہوتا تھا۔ ایک دفعہ آدھی رات کا وقت تھا۔ آدھ گھنٹے سے ٹیلی پرنٹر بند تھے ہُو کا عالم طاری تھا کہ دہلی اور پشاور کے ٹرانس میٹر اچانک چالو ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ٹیپ کی مشینیں چل پڑیں۔ اس سے اتنا شور ہوا کہ میں ڈر گیا۔ بدن سُن ہو گیا۔ میں نے چپڑاسی کو بُلایا۔ اور کہا کہ ملک تاج الدین صاحب کو بلاؤ وہ دفتر کے اوپر فلیٹ میں رہتے تھے۔ موصوف تشریف لے آئے اور کچھ دیر میرا دل بہلاتے رہے۔ دو دن بعد ایک جگہ ملک یوسف العزیز سے ملاقات ہوئی۔ چھُٹتے ہی بولے "بڑے بُزدل ہو۔ ٹیلی پرنٹر سے ڈر گئے"۔ میں نے کہا ہاں، بُزدل ہُوں۔ ٹیلی پرنٹر سے بھی ڈرتا ہوں اور آپ کے قہقہوں سے بھی ؎

غرض دو گُونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

دورانِ جنگ میں محکمہ اطلاعات نے "جنگ" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کر رکھا تھا۔ جس میں ایک تو ہفتے بھر کی جنگی خبروں کا خلاصہ چھپتا تھا۔ دوسرے جنگ کے سلسلے میں دو چار فیچر درج ہوتے تھے۔ اس اخبار

کی ادارت ملک یوسف العزیز کے سپرد تھی۔ مجھ سے بھی بعض اوقات مضامین لکھواتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے جنگی تبصرے پر داد دی جائے۔ اور میں اُن کے زِچ کر دینے والے قہقہوں کو نہیں بھولا تھا۔ اس لئے داد دینے میں خِسّت سے کام لیتا تھا۔ عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ گفت گو میں رکھ رکھاؤ سے ناواقف تھا۔ ایک دفعہ جو میری رگِ مزاح پھڑکی۔ تو میں نے کہا۔ آپ تو تبصرے کا یوں تذکرہ فرماتے ہیں جیسے آپ وِک ہم سٹیڈ WICKHAM STEED کے برو ز ہیں۔ یاد رہے کہ رگِ ہم سٹیڈ ایک بڈھے اور کہنہ مشق اخبار نویس تھے "دی ٹائمز" کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ اور جنگ کے دوران میں بی بی سی سے ہفت روزہ تبصرہ نشر کرتے تھے۔ ملک یوسف کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن غصّہ پی گئے۔ ایک دفعہ "سنگ" کے میک اپ کی تعریف کرنے لگے۔ اور کہنے لگے۔ اس میں کوئی نقص نکال سکتے ہو؟ میں نے کہا۔ یہ کون سا "نیو یارک ٹائمز" ہے جس کے میک اپ میں کوئی نقص نہیں نکالا جا سکتا۔ اس پر بگڑ گئے اور کئی دن تک رنجیدہ خاطر رہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ ڈپٹی ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے عہدے تک پہنچے۔ اس سے بڑے عہدے کے حصول میں انہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور وہ اعصابی تھکن کے شکار ہو گئے۔ ایک عرصے تک نہ مسکرا سکے نہ قہقہے بلند کر سکے۔ آہستہ آہستہ طبیعت بحال ہوئی لیکن وہ پرانا رنگ نہ آیا۔ محکمہ اوقاف میں افسرِ تعلقاتِ عامہ کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ آخری سالوں میں گہری محبت کے باوجود اُن سے ملاقات کے بہت کم مواقع میسّر آئے۔ اس میں قصور میری گوشہ نشینی کا تھا۔ وفات سے ایک سال پہلے مال روڈ پر ملے۔ بغل گیر ہوئے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولے۔ تم ملتے نہیں۔ میں نے کہا ملک صاحب

مکروہاتِ دُنیوی حائل ہیں۔ اور پھر یہ کالم نویسی ہے جو بہت سا وقت لے لیتی ہے۔ حتیٰ کہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے بعد اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔

ملک یوسف العزیز کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ متصادم شخصیات کے ساتھ تعلقات میں توازن قائم رکھتے تھے۔ والد مرحوم اور مولانا تاجور نجیب آبادی کے درمیان تعلقات ایک عرصے تک کشیدہ رہے۔ دونوں کے نیازمندوں اور شاگردوں کے حلقے الگ الگ تھے لیکن ملک یوسف العزیز کو دونوں سے عقیدت تھی اور انہوں نے دونوں سے نیازمندانہ تعلقات جاری رکھے تاآنکہ سالکؔ اور تاجورؔ میں صلح ہو گئی۔

شیخ محمد نصیر ہمایوں انتقال سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے ایک دن اچانک غریب خانے میں رونق افروز ہوئے۔ مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت کم، خوشی زیادہ۔ حیرت اس لیے کہ اس سے پہلے وہ مجھے ملنے کبھی نہیں آئے تھے اور خوشی اس لیے کہ اس بزرگ کی پذیرائی کا شرف حاصل ہوا جن کی علم پروری، شرافت و نجابت، خلوص و دیانت کا ایک عالم قائل تھا اور جن کے توسط سے تہائی صدی پہلے میں نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس بستی میں ایک شادی کی تقریب میں آیا تھا، سوچا تمھیں ملے بغیر لوٹنا مناسب نہیں۔ ہم میاں بیوی نے اصرار کیا کہ چائے ضرور پئیں۔ وہ مان گئے۔ محبت و شفقت کی یہ کیفیت تھی کہ چائے کی بہت تعریف فرمائی۔ ان کے ہمراہ ایک نوعمر لڑکا تھا، میری بیوی نے کہا تم محسن کے لڑکے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا اور حضرتِ ہمایوں نے اس پر میری بیوی کو داد دی کہ پہچان گئی ہے۔ جاتے جاتے وہ ہمیں ان گنت دعاؤں سے سرفراز کر گئے اور ہم میاں بیوی دیر تک اُن کی باتیں کرتے رہے کہ ایسے شفیق بزرگ بہت کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ اس ملاقات سے کچھ عرصہ پہلے تحریکِ پاکستان کے کسی پہلو پر انھوں نے ریڈیو پاکستان پر میری ایک تقریر سُنی۔ پسند فرمائی اور احسن بھائی کی وساطت سے مسودہ منگوایا اور اسے "تعمیر" میں چھاپا۔ میں نے اسے بھی فخر کا مقام جانا کہ اتنے شفیق بزرگ سے توجہ بھی ملی اور سند بھی۔

حضرتِ ہمایوں سے میرا کوئی براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ وہ میرے باپ کے ہمعصر اور دوست تھے۔ ان کی بیگم (مرحومہ) میری والدۂ مرحومہ سے گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ اور میرا رابطہ تھا تو احسن کی بدولت، جو میرے ہمعصر

اور دوست اور بھائی ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں میری پہلی کتاب "ممالکِ اسلامیہ کی سیاست" ہمایوں مرحوم نے چھاپی۔ لیکن جو بات ہوئی، والد مرحوم کی وساطت سے۔ اور پاکستان بننے کے فوراً بعد تصنیف و تالیف کا کام کیا، تو احسن کے تعاون سے۔ اصل ملاقاتیں احسن سے ہوتی رہیں اور حضرت ہمایوں کی خدمت میں محض سلام کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ اس خاندان کے جملہ افراد سے میری محبت کا رشتہ استوار ہے۔ محسن، صفدر، ریاض، رشید سے۔ اور محسن سے ذرا زیادہ ہی پیار ہے۔

حضرت ہمایوں کا انتقال چوراسی برس کی عمر میں ہوا۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ لباس وہی تھا جو اس صدی کے ربع اول میں شرفا کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا۔ سر پر لنگی، تن پر لمبا کوٹ۔ دنیا بدل گئی، اس کے طور طریقے بدل گئے لباس بدل گئے لیکن ان کا لباس وہی رہا۔ اور صرف ظواہر کے اعتبار سے نہیں، اخلاقی اور معاشری قدروں کے اعتبار سے بھی وہ پرانی تہذیب اور اس کی روایات کے امین تھے۔ انھوں نے ساری عمر کاروبار میں گزاری۔ لیکن ایسے کاروبار میں جو حسنِ معاملت اور دیانت داری سے عبارت تھا۔ زیادہ محنت، تھوڑا منافع اور ہر کام کی افادیت پر کڑی نظر۔ نصف صدی قبل جب انھوں نے قومی کتب خانے کی بنیاد رکھی تو میدان میں بہت سے مسلمان پبلشر موجود تھے۔ ایک وہ، جو پنجابی کتابیں اور داستانیں چھاپتے تھے اور خوب کماتے تھے۔ دوسرے وہ جو سستی قسم کے جاسوسی اور دوسرے ناول چھاپتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں بیچتے تھے۔ ان لوگوں کا نقطۂ نگاہ تھا: کاروبار برائے کاروبار۔ ہمایوں صاحب کا نقطۂ نگاہ تھا: کاروبار برائے مقصد، کاروبار برائے تعمیرِ ملت۔ انھوں نے کبھی کوئی لچر اور پوچ

کتاب نہ چھاپی۔ جو کتاب چھاپی اچھی طرح چھان پھٹک کر کے اور یہ دیکھ کر کہ اس سے معاشرے کو نقصان تو نہیں پہنچے گا اور آیا اس سے ایک صحت مند معاشرے کی تخلیق میں مدد مل سکے گی۔ دنیاوی اور کاروباری اعتبار سے یہ اندازِ فکر اور طریق کار منافع بخش نہیں تھا لیکن وہ اس روش پر گامزن رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت ڈال دی۔

ہمایوں مرحوم نے اس زمانے میں بی اے پاس کیا جب مسلمان گریجویٹ خال خال ہی ملتے تھے۔ اور جنھیں نوکری مل جاتی تھی ان کا دنیاوی مستقبل روشن ہو جاتا تھا۔ مرحوم نے اسلامیہ کالج پشاور میں ملازمت کر لی جو اصل میں حکومت کے زیرِ انتظام چل رہا تھا لیکن جب تحریک خلافت کا دَور دَورہ ہوا، انگریز سے ترک موالات کا سلسلہ شروع ہوا اور رہنماؤں نے انگریز سے ہر قسم کے تعاون کو غلط قرار دیا اور جہاں ان کے ہم جماعت چودھری افضل حق نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی، وہاں ہمایوں مرحوم نے اسلامیہ کالج پشاور کی ملازمت پر لات مار دی اور لاہور آ گئے۔ یہاں انھوں نے چند ہم خیال دوستوں کی مدد سے سودیشی کیش سٹور قائم کر لیا۔ آج کی نسل سودیشی کے لفظ سے ناآشنا ہے اس لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ تحریکِ ترکِ موالات کا ایک پروگرام یہ بھی تھا کہ بدیشی (غیر ملکی) مصنوعات کا مقاطعہ کیا جائے اور سودیشی (ملکی) مصنوعات کو فروغ دیا جائے اور اس میں کھدر سر فہرست تھا۔ تحریک کے دوران میں کھدر کا استعمال اتنا بڑھا کہ کیا مرد، کیا عورتیں اور کیا بچے، سبھی کھدر پہننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ بدیشی کپڑا ذلّت کی علامت تھا۔ کھدّر عزت کی علامت تھا۔ ایسے میں سودیشی سٹور کا کام خوب چلنا چاہیے تھا لیکن یہ کاروبار نہ چلا کیونکہ انھیں کاروباری تجربہ حاصل نہیں تھا۔ آخر اسے ٹھپ کرنا پڑا،

لیکن جن لوگوں نے پیسہ لگایا تھا، انھوں نے اپنا پیسہ واپس لیا۔ ہمایوں صاحب کو اس گھاٹے کے کاروبار میں بہت زیر بار ہونا پڑا۔ جناب احسن نے ایک مضمون میں اپنی والدۂ مرحومہ کا یہ فقرہ دہرایا ہے کہ "کتنی کتنی رات انھوں نے کام کیا مگر جب سودیشی کیش سٹور بند ہو گیا تو میرے پاس ایک چھلّہ تک نہ رہا۔" اس سے معاً مجھے اپنی والدۂ مرحومہ کی یہ بات یاد آگئی کہ کچھ زیور "فانوسِ خیال" میں لگ گیا اور جو ایک آدھ چیز بچی وہ والدِ مرحوم کے اسیرِ فرنگ ہونے کے بعد قوت لایموت کے لیے بیچ ڈالی۔ کیا خوب زمانہ تھا وہ، جب لوگ مقصد کے لیے قربانیاں دیتے تھے اور اس پر خوش بھی ہوتے تھے۔

سودیشی کیش سٹور کا بوریا بستر گول ہوا تو قومی کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں کام شروع کیا اور حُسنِ نیّت اور خلوص کی بدولت آگے چل کر اس میں اتنا پھیلاؤ ہوا کہ یہ ادارہ ملک کے ممتاز اداروں میں شمار ہونے لگا لیکن اس میں بھی ابتدائی دور کے دس بارہ بلکہ پندرہ سال بہت مشکل میں گزرے۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرحوم قناعت کی دولت سے مالامال تھے اور یہی چیز ان کی اولاد نے ورثے میں پائی۔ چنانچہ ایک مناسب حد کے اندر آمدن ان کے لیے اطمینان اور آسودگی کا موجب بن جاتی ہے۔ پرانے خلافتی کارکنوں کو ایک دوسرے سے بہت پیار ہوتا تھا چنانچہ ہمایوں صاحب نے چودھری افضل حق صاحب کی وہ کتابیں بڑے اہتمام سے چھاپیں جو وہ قید کے دوران میں لکھتے رہے۔ ان میں "زندگی" خاص طور پر اہم تھی اور اس پر غالباً کوئی انعام بھی ملا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ کتاب چھاپتے وقت افادی پہلو پر زیادہ دھیان دیتے تھے اور کاروباری پہلو پر کم۔ چنانچہ اقبالیات پر بھی کچھ کتابیں چھاپیں جن میں سرفہرست وہ کتاب

تھی جس میں پہلے یومِ اقبال کے اُردو اور انگریزی مقالات شامل کیے گئے۔ یہ کتاب میں نے ابھی ابھی دوبارہ دیکھی تو پروڈکشن سے بہت متاثر ہوا۔ اُس زمانے میں کتابوں کی پروڈکشن قابلِ فخر نہیں ہوتی تھی لیکن اس کتاب کی پروڈکشن آج کے زمانے میں بھی قابلِ فخر قرار دی جا سکتی ہے۔ کتابت اور طباعت اردو حصّے کی لیتھو طریقِ کار کے مطابق ہے لیکن آج کی آف سیٹ اور ونڈائنگ کتابت اور طباعت سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ہمایوں صاحب نے خارزارِ صحافت میں قدم رکھا۔ یہ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے جب "انقلاب" نزع کے عالم میں دم توڑ گیا، ایسے میں ہمایوں صاحب کی بڑی ہمت تھی کہ راولپنڈی سے "تعمیر" کے نام سے ایک علاقائی روزنامہ جاری کر لیا اور ہمّت اس لیے بھی کہتا ہوں کہ اس سے پہلے وہاں سے ضمیر جعفری نے "بادِ شمال" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا تھا جو ناکام رہا۔ "تعمیر" کامیابی کے مراحل طے کرتا رہا اور غالباً اب بھی پاکستان کے علاقائی روزناموں میں اسے ایک اہم مقام حاصل ہے، پچھلے چند سالوں سے یہ بڑی آزمائش کے دَور سے گزر رہا ہے کیونکہ یہ دَور سرمایہ دارانہ صحافت کا ہے، صحافت کا صنعتی دَور ہے۔ کارکن حقوق پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، فرائض پر کم۔ اور آجر متوسط طبقے کے لوگ ہوں یا سرمایہ دار دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور ایسی مراعات کے طلب گار ہوتے ہیں جو متوسط طبقے کے مالک نہیں دے سکتے۔ بہر حال اس اخبار نے اپنی ستائیس سالہ زندگی میں ملک و ملّت کی جو خدمات سرانجام دی ہیں اور جس پیمانے پر عوامی جذبات و احساسات کی عکّاسی کی ہے وہ تاریخِ صحافت میں ایک اہم اور منفرد مقام کی مالک ہے۔

یہ درست ہے کہ عمر کے آخری دور میں حضرت ہمایوں نے کاروبار کا انتظام اولاد کے سپرد کر رکھا تھا اور اولاد نے اسے بڑھایا اور پھیلایا لیکن ان کے مشورے ہمیشہ ان کے شاملِ حال رہے اور دعائیں بھی، کہ زندگی کے آخری مرحلے میں بیشتر توجہ عبادات پر تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جناب احسن اور ان کے بھائی اُس ادارے کی ترقی اور کامیابی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں گے جس میں اُن کے باپ کا خونِ جگر شامل ہے۔